جمیل الدین عالؔی کی شخصیت و فن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

مقالہ نگار: فہمیدہ عتیق

زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال

پیش کردہ: اگست ۲۰۰۴ء

شعبہ اردو، جامعہ کراچی

کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

جمیل الدین عالؔی کے فن و شخصیت پر کام کرنے کا خیال ایک سرمدی تصور ہے جو کہ مجھے عطا کیا گیا تھا۔ عالؔی صاحب میرے شوہر پروفیسر عتیق احمد کے دوستوں میں ہیں۔ ان سے اسی حوالے سے ملاقاتیں بھی رہتی تھیں۔ انجمن کے دفتر میں ایک دن ایک ادبی محفل میں شخصیات پر تحقیق کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ناگاہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مردہ شخصیات پر تو خاصا کام ہوتا رہتا ہے لیکن وہ زندہ شخصیات کہ جنہوں نے تاریخ سازی کی ہے، کیوں نہ ان پر بھی نظر توجہ ڈالی جائے۔ عالؔی صاحب سامنے ہی بیٹھے تھے۔ ان سے جب میں نے اپنی خواہش کا ذکر کیا تو انہوں نے انتہائی انکساری کے ساتھ انکار کر دیا۔ میں ان سے کئی ماہ تک اصرار کرتی رہی، بالآخر عالؔی صاحب آمادہ ہو گئے اور اس طرح اس عہد کی ایک عظیم علمی و ادبی شخصیت اور انتہائی نامور اور مقبول کالم نگار جمیل الدین عالؔی صاحب کے فن و شخصیت پر کام کا آغاز ہوا۔ کام کے دوران بہت سے سخت مقامات آئے۔ تحقیق میں رہنما کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے۔ لیکن ہر راہبر منزل تک پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ میں اللہ پاک کی انتہائی شکر گزار ہوں کہ اس نے بالآخر مجھے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال سے ملوا دیا کہ جن کی رہنمائی میں میں نے تحقیق کی تمام منزلیں بخیر و خوبی طے کیں۔ میرے رہنما، نگران اور استاد نے جس خوبی، نرمی، اور فنی لوازمات کے ساتھ اس تحقیقی مقالے کو مکمل کرایا اس کے لیے ان کے حق میں دل سے دعا نکلتی ہے۔

میں اپنے شوہر پروفیسر عتیق احمد کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہر مرحلے پر مجھ سے اپنی صحت سے زیادہ تعاون کیا۔ میں ان تمام خواتین و حضرات کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ جنہوں نے وقتاً فوقتاً مجھ سے تعاون کیا اور مجھے مطلوبہ مواد کی فراہمی میں مدد کی۔

آخر میں اس شخصیت کا بطور خاص شکریہ ادا کرتی ہوں کہ جن کے فن پر یہ مقالہ لکھا گیا۔ اگر وہ مجھے اجازت نہ دیتے اور قدم قدم پر میرے ساتھ اس قدر بھرپور تعاون نہ کرتے تو یہ مقالہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔

جمیل الدین عالی کی شخصیت اور فن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

بابِ اوّل

حیات و شخصیت

سلطنت مغلیہ کا سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی ریاستوں نے خود مختاری کی روش اختیار کرنا شروع کر دی لہذا مرہٹوں نے بھی علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ملک میں ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر دہلی میں مقیم تین بھائی قاسم جان، عارف جان، عالم جان، (جو کہ اصلاً باہر سے آئے تھے) سمرقند ہجرت کر گئے۔ وہاں کے حاکم نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ مگر سمرقند کے حاکم کے انتقال کے بعد وہاں کی رعایا نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا ہر طرف لاقانونیت پھیل گئی اور سمرقند میں بھی حالات ان کے لئے سازگار نہ رہے تو یہ تینوں بھائی ایک بار پھر ہندوستان لوٹ آئے۔ ہندوستان کے حالات بھی اب دگرگوں ہو چلے تھے شاہ عالم بنگال کی بغاوت فرو کرنے کیلئے دہلی چھوڑ کر بنگال میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے۔ اس ہجرت کے دوران عارف جان چار بیٹوں کے باپ بن چکے تھے ان بچوں کے نام بالترتیب نبی بخش خان، احمد بخش خان، الٰہی بخش خان اور محمد علی خان تھے یہ لوگ بڑے بہادر اور روشِ زمانہ کے مطابق کئی کئی سو لڑاکا سواروں کے گروہوں کی سرداری کے ساتھ جنگوں میں قسمت آزمائی کر چکے تھے۔ (۱)

عارف جان کے دوسرے بیٹے احمد بخش خان، نے والئی الور راجہ بختاور کے ہاں ملازمت اختیار کر لی انھی دنوں انگریزوں اور ریاست بھرت پور کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ بھرت پور سے الور والوں کی رنجش چلی آتی تھی اور دونوں ریاستیں ایک دوسرے سے متصل تھیں۔ احمد بخش خان، نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور سپاہیوں کا ایک دستہ لیکر ریاست انور کی وفاداری ثابت کرنے کیلئے انگریزوں کی مدد کو پہنچ گئے۔ لڑائی کے دوران انگریز سپہ سالار زخمی ہو کر گھوڑے کی پیٹھ پر سے گرنے لگا، تو احمد بخش خان برق رفتاری کے ساتھ اس کے گھوڑے تک پہنچے اور سپہ سالار کو گرنے سے بچایا اور بہ حفاظت اس کے خیمہ تک پہنچا دیا۔ سپہ سالار نے مرنے سے قبل ایک تحریر لکھی کہ احمد بخش خان نے بڑی بہادری سے میری جان بچائی ہے اس لئے اسے مناسب صلہ دیا جائے۔

جنگ کے خاتمے پر جب فتح کا جشن منعقد ہوا تو جنرل لارڈ لیک نے افسر مذکور کی وصیت کے مطابق احمد بخش خان کو فیروز پور جھرکہ، سونسا پھچور اور سانگرس کے اضلاع بطور جاگیر عطا کیے (۲)

اس موقع پر مہاراجہ الور نے اپنی طرف سے پرگنہ لوہارو، احمد بخش خان کو عطا کرنے کا اعلان کیا۔ اور اس کے ساتھ انہیں دربارِ دہلی سے فخر الدولہ، دلاور الملک، رستمِ جنگ کی سند بھی عطا کی گئی (۳)

نواب احمد بخش خان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے امین الدین خان اور انکے بیٹے علاؤ الدین احمد خان علائی (جو مرزا غالبؔ کے چہیتے شاگرد تھے) والئی لوہارو بنے۔ علاؤ الدین احمد خان علائی کے بعد ان کے بیٹے سر امیر الدین احمد خان والئی ریاست ہوئے۔

سر امیر الدین احمد خان کثیر العیال تھے اُن کے نو (۹) بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں ان کے بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ سب سے بڑے بیٹے اکبر مرزا تھے۔ یہ تو جوانی ہی میں لاولد انتقال کر گئے تھے۔

۲۔ نواب زادہ مرزا اعزالدین احمد خان، تخلص اعظم (شاگرد بےخود دہلوی) جو دربار کہلاتے تھے۔

۳۔ نواب زادہ مرزا اعزازالدین احمد خان جو شاہ رخ مرزا کہلاتے تھے۔ (یہ پہلی بیگم سے تھے) ان کی ایک بیٹی روشنک بانو بیرسٹر محمود علی قصوری سے بیاہی ہیں۔

۴۔ نواب زادہ مرزا اعتزازالدین احمد خان ہمایوں مرزا کہلاتے تھے۔ (یہ پہلی بیگم سے تھے) پاکستان میں پہلے آئی جی اسپیشل پولیس ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں فضائی حادثہ (جہلم) کا شکار ہوئے

۵۔ نواب زادہ مرزا افضل الدین احمد خان۔ (دوسری بیگم لاولد رہیں۔ان کے انتقال کے بعد یہ تیسری بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے) وہ پاکستان نہیں آئے۔لوہارو کے بھارت میں انضمام سے پہلے ہز ہائی نس ماچین (نزد سورت، گجرات) کی کزن سے شادی کر کے وہی ملازم ہو گئے پھر نواب صاحب لوہارو کے پاس جے پور آ گئے۔

۶۔ نواب زادہ مرزا جمیل الدین احمد خان عالی (یہ تیسری بیگم کے طلاق کے بعد چوتھی بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے)

۷۔ نواب زادہ جمال الدین احمد خان۔ (صغرسنی میں فوت ہو گئے)

۸۔ نواب زادہ حمید الدین احمد خان۔ چوتھی بیگم یعنی والدہ عالی کی موجودگی میں ہی ایک بیوہ خاتون سے شادی کر لی تھی یہ اُن کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس طرح سر امیر الدین خاں کی پہلی مرتبہ بیک وقت دو بیگمات ہو گئیں اور تاحیات رہیں۔

۹۔ نواب زادہ مراد احمد خان۔ (صغرسنی میں فوت ہو گئے)

سر امیر الدین نے ۱۹۲۱ء میں رضا کارانہ طور پر ریاستی اُمور سے دستبرداری اختیار کی اور سیر و تفریح (مقامی و بیرونی) کرنے لگے۔ان کے بعد تخت پر اُن کے بڑے صاحبزادے اعزازالدین احمد خان اعظم والئی ریاست ہوئے۔ اعظم خان کے بعد اُن کے بیٹے امین الدین احمد خان ثانی والئی ریاست لوہارو بنائے گئے۔ان ہی کے دور میں ہندوستان آزاد ہوا اور ریاست لوہارو بھارت کے صوبے پنجاب (موجودہ ہریانہ) میں ضم ہو گئی۔نواب امین الدین احمد خان ثانی ریاست ضم ہو جانے کے بعد صوبہ راجستھان میں رکن اسمبلی منتخب ہوئے اور وزیر رہے بعد میں ہماچل پردیش اور پنجاب کے صوبوں کے گورنر بھی رہے۔ انضمام کے بعد لوہارو میں کل چھ مسلمان رہ گئے تھے۔نواب صاحب نے جے پور میں گھر بنا کر وہیں قیام کیا پنجاب کی گورنری کے بعد وہیں انتقال کیا ان کی تدفین لوہارو کے خاندانی قبرستان میں ہوئی۔شاعر اور ناول نویس بھی تھے۔

علاؤالدین احمد خان علائی کے بیٹے نواب زادہ سر امیر الدین احمد خان تعلیم یافتہ بیدار مغز اور معاملہ فہم حکمران تھے۔اُن کا غالبؔ کے نام ایک خط اور غالبؔ کا خط اُن کے نام بہت مشہور ہے جس میں انھوں نے غالبؔ کو دادا کہہ کر اور غالبؔ نے انھیں دلدادہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔عربی، فارسی، انگریزی اور اردو زبانوں کے ماہر تھے۔اس لئے حکومت برطانیہ

نے اُنھیں کئی جگہ سفیر بنا کر بھیجا۔ نواب مالیر کوٹلہ کے انتقال کے بعد چونکہ اُن کے ولی عہد کم سِن تھے۔ اس لئے سرامیر الدین احمد خان کو مالیر کوٹلہ کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا۔ یہ 9 سال تک ریاست مالیر کوٹلہ میں ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اپنے بیٹے کے انتقال پر نواب کے بلوغ تک متولی اور ریذیڈینٹ بھی رہے۔

مالیر کوٹلہ کے ولی عہد کے بالغ ہونے کے ۳ سال بعد تک ایک معاہدے کی رو سے اُن کی مشاورت پر مامور رہے

سرامیر الدین احمد خان کثیر العیال تھے۔ بیک وقت ان کی ۲ بیگمات سے زیادہ نہیں رہیں۔ (کل ۵ بیگمات تھیں۔ ایک لاولد فوت ہوئیں ایک کو طلاق ہوئی تین صاحب اولاد ہوئیں) ایک معاہدے کی رو سے بیگمات اور بچوں کو ریاست سے گزارہ الاؤنس ملتا تھا۔ خود بھی دیکھ بھال کرتے تھے۔ (۴)

سرامیر الدین احمد خان کے کئی بچوں نے وارثت میں باپ کی ذہانت ولیاقت پائی تھی۔ اس لئے اپنے اپنے فن میں سب ہی معروف ہوئے لیکن ادب اور سیاست کی دنیا میں نواب زادہ مرزا جمیل الدین عالؔی کو قابل رشک شہرت اور ناموری حاصل ہوئی۔

مرزا جمیل الدین عالؔی ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ لیکن جمیل الدین عالؔی پر گفتگو سے قبل ان کے خاندانی پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ان کے خاندان کا تعلق ایک طرف مرزا غالؔب سے (سلبی رشتہ) ہے۔ دوسری طرف والدہ (جمیلہ بیگم) کے حوالے سے خواجہ میر دردؔ سے۔ خاندانی علائق کے اس پس منظر کو سمجھنے کے لئے بات کو ذرا اُوپر سے شروع کرنا ہوگا۔

خاندانی پس منظر:

مرزا غالؔب کے آباؤ اجداد بیک ترک تھے۔ جب کیانی تمام ایران وتوران پر قابض ہوگئے۔ تو تورانیوں کا جاہ جلال دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور ان کی اگلی نسلیں عرصہ دراز تک ملک ودولت حاصل نہ کرسکیں۔ مگر تلوار کبھی تورانیوں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ ترکوں میں زمانہ قدیم سے یہ روایت چلی آئی تھی کہ باپ کی تمام جائیداد (وراثت) لڑکیوں میں تقسیم کردی جاتی تھی اور بیٹے صرف تلوار کے وارث ہوتے تھے۔

زمانہ اسلام میں سلجوقیوں نے ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ جو خاصے عرصہ تک قائم رہی۔ لیکن بالآخر یہ حکومت بھی ختم ہوئی۔ (۵)

سلجوقیوں کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ ان میں ترسم خان نے سمرقند میں قیام کیا۔ ان کے بیٹے توقان بیگ، مرزا غالؔب کے دادا تھے۔ توقان بیگ خان اپنے والد ترسم خان سے ناراض ہوکر لاہور آگئے۔ اور معین الملک عرف میر منّوں کے یہاں ملازم ہوگئے میر منّوں کے انتقال کے بعد وہ دہلی آگئے۔

درفش کاویانی میں درج ہے کہ غالؔب کے دادا توقان بیگ ماوراء النہر میں رہتے تھے۔ اور وہاں سے ہندوستان آئے تھے۔ (۶)

ان کی زبان ترکی تھی۔ شاہ عالم کے عہد میں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان نے قوقان بیگ کو حکومت میں ایک اچھا عہدہ دلا دیا۔ پہاسو کا منافع بخش پرگنہ قوقان بیگ کے نام کر دیا۔ اسکے علاوہ رسالے کی تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ قوقان بیگ خان کے کئی بیٹے تھے۔ لیکن تاریخ نے ان میں سے دو کے حالات محفوظ رکھے ہیں۔ یعنی عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولہا اور نصر اللہ بیگ خان۔ (۷)

مرزا قوقان بیگ خان نے شاہ عالم کے آخری زمانے میں شاہ عالم کی ملازمت ترک کر دی اور مہاراجہ جے پور کے ہاں ملازمت کر لی اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ مرزا قوقان بیگ کے بیٹے مرزا عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ جو سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائدین شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان تا حیات اپنے سسرال میں رہے اور اُن کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کے دو بیٹے تھے۔ ایک مرزا اسداللہ خان غالبؔ اور دوسرے مرزا یوسف بیگ خان جو ایام شباب میں مجنوں ہو گئے اور اسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کر گئے۔ مورخین کا غالب قیاس ہے کہ غدر کے زمانے میں عالم دیوانگی میں ایک رات گھر سے نکل گئے اور ایک برطانوی سپاہی نے گولی مار دی۔

مرزا عبداللہ بیگ خان لکھنؤ میں آصف الدولہ کے ہاں ملازم رہے اور حیدرآباد دکن میں سرکار آصفی میں ۳۰۰ سوار کی جمعیت کے ساتھ کئی برس ملازم رہے۔ مگر خانہ جنگی کے جھگڑے میں وہ ملازمت جاتی رہی اور یہ آگرہ واپس چلے آئے۔ الور کے راجہ بختاور سنگھ نے اُن کو ملازمت دی تھی مگر وہ بھی کوئی مناسب ملازمت نہ تھی۔ ابھی مرزا عبداللہ بیگ خان اس ملازمت کے بارے میں یکسو نہ ہوئے تھے کہ گڑھی کے زمیندار نے مہاراجہ الور سے بغاوت کر دی۔ اس زمین دار کی سرکوبی کے لئے جو فوج بھیجی گئی اس میں مرزا عبداللہ بیگ خان بھی شامل تھے۔ اس جنگ میں مہاراجہ کو فتح ہوئی۔ لیکن مرزا عبداللہ بیگ خان گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ اور راج گڑھ میں دفن کئے گئے۔ مہاراجہ بختاور سنگھ نے مرزا عبداللہ بیگ خان مرحوم کے دونوں بیٹوں مرزا اسداللہ خان غالبؔ اور مرزا یوسف بیگ خان کے لئے دو سیر حاصل گاؤں اور کسی قدر روزینہ مقرر کر دیا۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کے انتقال کے بعد مرزا غالبؔ اور مرزا یوسف کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خان نے کی۔ جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہو گئی۔ اور شاہ دہلی کے حکم پر نواب فخر الدولہ احمد بخش خان مرہٹوں سے لڑنے کیلئے لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہو گئے تو انھوں نے مرزا غالبؔ کے چچا نصر اللہ بیگ خان کو (جن سے نواب فخر الدولہ احمد بخش کی ہمشیرہ کی شادی ہوئی تھی۔) سرکاری فوج میں یہ عہدہ رسالداری ملازم کرا دیا۔ ان کے ذاتی اخراجات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے دو پرگنے سونک اور سونسا جو آگرہ کے نواح میں واقع ہیں۔ سرکار سے ان کے نام پر مقرر ہو گئے جب تک زندہ رہے۔ دونوں پرگنے ان کے نام پر رہے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے وارثوں اور متعلقین کی پینشن سرکار نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرا دی۔ (۸)

الور میں نواب احمد بخش خان نے ایک میواتن مجدی بیگم (عرف مدّی بیگم) کو بیوی بنا کر رکھ لیا تھا۔ اس سے دو بیٹے شمس الدّین احمد خان اور ابراہیم علی خان اور دو بیٹیاں نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم پیدا ہوئیں۔ نواب بیگم کی شادی زین العابدین خان اور جہانگیرہ بیگم کی شادی آگرے کے اعظم خان سے کر دی گئی۔ غالباً شمس الدّین احمد خان منکوحہ بیوی سے نہ تھے۔ اس لئے ریاست لوہارو کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔ چنانچہ احمد بخش خان کا زندگی ہی میں فیروز پور جھرکہ شمس الدّین احمد خان کے نام لکھ دینا اُن کی مادری سلسلے میں کسی بے یقینی کی غمازی کرتا ہے۔

منکوحہ ترک نژاد خاندانی بیوی بیگم جان سے دو بیٹے امین الدّین احمد خان اور ضیاء الدّین احمد خان (نیّر درخشاں) تھے۔ دونوں کے نام ریاست لوہارو کردی گئی۔ ۱۸۲۲ء میں سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور دونوں سے ان کے مطلب کی درخواست لکھوادی گئی۔ نواب احمد بخش خان کا انتقال ۱۸۲۷ء میں ہوگیا اس وقت نواب شمس الدّین احمد خان اور امین الدّین احمد خان کوئی ۱۲ سال اور ضیاء الدّین ۷ سال کے تھے۔ (۹)

نواب احمد بخش خان کے انتقال کے بعد شمس الدّین احمد خان نے دونوں کم سن بھائیوں امین الدّین احمد خان اور ضیاء الدّین احمد خان کو ریاست لوہارو سے محروم کرنا چاہا۔ شمس الدّین احمد خان نے حکومت کو ایک درخواست دی کہ احمد بخش خان کی تمام ریاستیں اور موضع جات جس میں لوہارو اور دوسرے علاقے بھی شامل تھے۔ ان کے سپرد کر دیئے جائیں اور چھوٹے بھائیوں کو صرف حصہ دیا جائے۔

سر ایڈورڈ کول بروک دہلی میں ریذیڈنٹ تھا۔ اس نے شمس الدّین احمد خان کی طرف سے دی گئی درخواست کی مخالفت کی لیکن کچھ دن بعد وہ معزول ہوگیا اور اس کی جگہ فرانس ہاکنس دہلی کا Resident مقرر ہوا جو شمس الدّین احمد خان کا ذاتی دوست تھا اس نے نواب شمس الدّین احمد خان کی درخواست منظور کی اور نواب شمس الدّین احمد خان والئی لوہارو بھی بن گئے۔

۱۸۳۲ء میں فرانس ہاکنس کا تبادلہ ہوگیا اور سر ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی مقرر ہوا۔ فریزر کے نواب احمد بخش خان سے قریبی مراسم تھے۔ اتنے قریبی کہ احمد بخش خان کے بچے سر ولیم فریزر کو چچا کہتے تھے۔ وہ بھی ان کے خاندانی حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس لئے اس نے شمس الدّین احمد خان کو سمجھایا کہ درخواست واپس لے لو اور خاندانی اُمور باہمی گفت و شنید سے طے کرلو لیکن شمس الدّین احمد خان نے سر ولیم فریزر کی بات نہ مانی دراصل وہ یہ سمجھتے تھے کہ امین الدّین احمد خان اور ضیاء الدّین احمد خان ابھی نابالغ بچے ہیں وہ کچھ کر نہیں سکیں گے اور ریاست لوہارو پر ان کا قبضہ برقرار رہے گا۔ لیکن سر ولیم فریزر ایک انصاف پسند اور خدا ترس شخص تھا۔ اس نے پوری کیفیت لکھ کر صدر کو (کلکتہ) بھیج دی اور مقدمے کی پیروی کے لئے دونوں بچوں کو بھی کلکتے بھجوادیا۔ ۱۸۳۴ء میں صدر نے فیصلہ بچوں کے حق میں دے دیا اور ریاست لوہارو کو امین الدّین احمد خان کے نام بحال کر دیا۔ یہ فیصلہ شمس الدّین احمد خان کیلئے انتہائی صدمے اور پشیمانی کا باعث بنا۔ شمس الدّین احمد خان

کے ایک مشیر کریم خان نے اپنے آقا کی کیفیت دیکھتے ہوئے قسم کھائی کہ وہ سر ولیم فریزر کو قتل کریگا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ خود شمس الدین احمد خان کی رضا کس حد تک اس میں شامل تھی۔ البتہ بعد میں شواہد (کچھ خطوط) سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ کریم خان کو شمس الدین احمد خان کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ بہر حال کریم خان نے اپنے ملازم انیاء (جو ذات کا میو تھا) کو ساتھ لیا اور دہلی روانہ ہو گیا۔ شمس الدین احمد خان کی چھوٹی بندوق ساتھ رکھ لی۔ وہ دو ماہ تک سر ولیم فریزر کا تعاقب کرتا رہا تا کہ وہ اس کے روزمرہ کے معمولات سے آگاہی حاصل کر سکے اور قتل کی منصوبہ بندی کر سکے۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو جب سر ولیم فریزر ایک دعوت سے واپس آ رہا تھا۔ کریم خان نے اسے گولی ماردی۔ سر ولیم فریزر مر گیا اور کریم خان پکڑا گیا۔ آلہ قتل یعنی شمس الدین کی چھوٹی بندوق ایک کنوئیں سے برآمد ہوئی۔ جس سے شبہ ہوتا تھا کہ قتل کے پیچھے شمس الدین کا ہاتھ کارفرما ہے۔ ادھر گواہان مقدمہ میں خود نواب شمس الدین احمد خان کے قریبی اعزا فتح اللہ بیگ اور قیاس۔ ہے کہ خود مرزا اسداللہ بیگ (غالبؔ) نے سر فریزر کے قتل کے سلسلے میں شمس الدین احمد خان پر شبہ ظاہر کیا۔ کریم خان پر مقدمہ چلا۔ جرم ثابت ہوا اور ۲۸ اگست ۱۸۳۵ء کو انہیں دہلی میں پھانسی دیدی گئی۔

انگریز دشمنی میں لوگ انہیں بے گناہ سمجھتے رہے اور مدتوں انکی قبر پر پھول چڑھاتے رہے۔ جس مجسٹریٹ نے مقدمے کی سماعت کی اس نے کریم خان کو پھانسی کا حکم دیتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ قتل شمس الدین خان کی مرضی اور معاونت سے ہوا ہے۔ لیکن چونکہ شمس الدین والئی فیروز پور جھر کہ اور لوہارو ہیں۔ اس لئے انھیں سزا دینا میرے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ اس نوٹ کے ساتھ مسل صدر کو کلکتہ بھیج دی گئی۔ جہاں پوری رازداری کے ساتھ اس پر کاروائی ہوتی رہی اور احکام جاری ہوئے۔ حکم ملتے ہی دہلی کے حاکموں نے نواب شمس الدین احمد خان کو دہلی طلب کر لیا۔ شمس الدین احمد خان دہلی جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بہی خواہوں نے بہت سمجھایا کہ دہلی ہرگز نہ جائیں کیوں کہ سر ولیم فریزر کے قتل کے سلسلے میں ان پر شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ عین ممکن ہے یہ طلبی اس ہی سلسلے میں ہو؟ پرانے نمک خواروں میں ایک سانڈنی سوار بھی تھا۔ اس نے پیش کش کی کہ میری سانڈنی پر سوار ہو جایئے۔ میرا بھیس بدل لیجئے۔ میری سانڈنی سو کوس سے پہلے دم نہ لے گی۔ مگر شمس الدین احمد خان نے کسی کی کوئی بات نہ مانی اور اپنے زعم میں دہلی جانے پر بضد رہے۔

شمس الدین احمد خان نے ۱۰ اسواروں کو ساتھ لیا۔ پالکی میں بیٹھے اور دہلی پہنچے تو کرنل سکنر (ان کا دوست بھی تھا) نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور درخواست کی کہ وہ اپنے ہتھیار اس کے حوالے کر دیں۔ ہتھیار لیتے ہی سکنر نے اعلان کیا کہ آپ سرکار انگریز کے حکم سے گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ (۱۰) اب آپ، اپنے آپ کو قیدی سمجھئے۔ یہ سن کر شمس الدین احمد خان چونکے مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شمس الدین احمد خان کے لئے بھی سزائے موت تجویز ہوئی۔ پھانسی سے قبل ان کو دہلی دروازے کے دائیں جانب سنگِ سرخ کے ایک مکان میں رکھا گیا۔ پھانسی دیئے جانے سے قبل اُنھوں نے سبز لباس پہنا پھر اسے تبدیل کر کے سفید لباس زیب تن کیا اور پالکی میں بیٹھ گئے۔ یہیں سے اُنھیں ماتمی جلوس کی شکل میں پھانسی کے چبوترے

کی طرف لے جایا گیا۔ اعصاب کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ راستے میں ایک کنجڑے کی دکان پر کسیرو نظر آئے۔ تو پالکی کے ساتھ چلنے والے افسر سے کہا کہ کسیرو کھانے کو جی چاہتا ہے۔ اس افسر نے کسیرو خرید کر سامنے رکھ دیئے۔ یہ کسیرو کھاتے جاتے تھے اور چھلکے باہر پھینکتے جاتے تھے۔ اسی حالت میں جلوس کشمیری گیٹ کے قریب "سرخ کنوئیں" کے قریب پہنچا تو جلاد نے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنا چاہا۔ نواب صاحب نے جلاد کے ہاتھوں سے پھندا چھینا اور خود اپنی گردن میں سجا لیا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو شمس الدین احمد خان کو پھانسی دی گئی۔ اسوقت پھانسی گھاٹ کو ۹۰۰ فوجی جوانوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا کہا جاتا ہے کہ پھانسی کے بعد شمس الدین احمد خان کی نعش خود بخود قبلہ رو ہو گئی۔ اس لئے مدتوں تک ان کو بے قصور گردانا جاتا رہا۔ ان کی میت ان کے خسر مرزا مغل بیگ نے وصول کی۔ شاہ عبدالعزیز کے نواسے شاہ اسحاق نے بعد نماز جمعہ، نماز جنازہ پڑھائی اور قدم شریف میں دفن کئے گئے۔ مدتوں لوگ ان کے مزار پر پھول چڑھاتے رہے اور انہیں شہید کہتے رہے۔ (۱۱)

دراصل مسلمانوں کو انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے اس درجہ نفرت ہو گئی تھی کہ وہ ہر اُس شخص کو اپنا ہیرو بنا لیتے تھے جو انگریزوں کو کسی طور پر نقصان پہنچائے۔ نواب شمس الدین احمد خان کے بعد از مرگ پذیرائی میں یہی جذبہ کارفرما تھا۔

شمس الدین احمد خان کے پھانسی پانے کے بعد ان کے دونوں بھائیوں نواب امین الدین احمد خان، ضیاء الدین احمد خان (نیر درخشاں) کو الگ الگ ریاست لوہارو بڑی مشکل سے کفالت کے لئے ملی۔ (۱۲)

دونوں ریاستیں ضبط کر لی گئیں اور نوابی کا خطاب بھی معطل ہو گیا تھا۔ بعد میں امین الدین احمد خان نے اپیل کی کہ وہ اور ضیاء الدین احمد خان صغیر سنی کے باعث اس واقعہ سے بری الذمہ تھے پھر لوہارو کی ریاست تو انگریزوں کی عطا کردہ بھی نہ تھی۔ مہاراجہ الور کی طرف سے ملی تھی اس لئے برطانوی حکومت نے اسے بحال کر دیا۔ (۱۳)

۱۸۶۹ء امین الدین احمد خان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے علاؤالدین احمد خان علائی لوہارو کے حکمران ہوئے اور ۱۸۷۴ء میں علائی کے لئے لارڈ نارتھ بروک نے شاہی خطاب نوابی بحال کیا۔ (۱۸۷۴ء ہی میں لارڈ ایچی سن نے لاہور میں ایچی سن کالج کی بنیاد رکھی تھی)۔

علاؤالدین احمد خان علائی ایک شاہ خرچ انسان تھے۔ ان کی شاہ خرچیوں کے باعث آخری دنوں میں ریاست کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ تو بظاہر کارانہ طور پر گدی سے علیحدگی اختیار کر کے اپنے بیٹے امیر الدین احمد خان کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ (۱۴)

سر امیر الدین احمد خان تعلیم یافتہ تھے اور ذہین تھے ساتھ ہی قدرت نے اُنھیں بڑی انتظامی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ اس لئے ریاست کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے چلاتے رہے۔

سر امیر الدین احمد خان ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے بچپن میں فرخ مرزا کی عرفیت سے مشہور تھے۔ ذہانت و ذکاوت بچپن ہی سے ظاہر ہو رہی تھی۔ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا ہے اُس وقت ان کی عمر ۹ سال کی ہوگی۔ غالب نے اپنے روزنامچہ میں ان کے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ جب ظاہر ہے ان کی عمر ۸، ۷ سال کی ہوگی۔ غالب لکھتے ہیں۔

"پرسوں فرخ مرزا آیا اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ پوچھا کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں؟ اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں پھر میں نے پوچھا تمہاری تنخواہ آئی ؟ کہا جنابِ عالی آ کا جان کی تنخواہ آ گئی ہے۔ میری نہیں آئی۔ میں نے کہا لوہارو جائے تو تنخواہ پائے۔ کہا حضرت میں تو آ کا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو اپنی حکوست چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے؟

سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم و فراست اور طبع سلیم۔ میں اس کی خوبی اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اس کو فرخ سیر کہتا ہوں" (۱۵)

خواجہ حسن نظامی نے بھی نواب سرامیر الدین احمد خان کی تعریف یوں کی ہے "جن کو برٹش گورنمنٹ نے سر کا خطاب دیا ہے اور توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے والیان ریاست کے مطابق اعزاز دیا جاتا ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ گورا رنگ، کٹورا آنکھیں، بڑی اور چڑھی ہوئی داڑھی، بال سفید ہو گئے ہیں۔ نہایت خلیق وملنسار رئیس ہیں "اردو ایسی بولتے ہیں کہ آدمی بیٹھا حیرت سے منہ دیکھا کرے"۔

مولانا شبلی، حسرتؔ سے کہا کرتے ہیں کہ فرصت ہو تو فرخ مرزا کی باتیں سنیے کہ اصل اردو تو ان کی باتوں میں ہے"۔ (۱۶)

جب سرامیر الدین احمد خان ریاست لوہارو کے والی مقرر ہوئے، اس وقت ان کی عمر بیس، پچیس سال کی تھی، اس عمر میں وہ ہفت زبان تھے۔ خصوصاً فارسی، عربی، انگریزی اور اردو میں بڑی مہارت تھی۔ مقرر بہت اچھے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں ان کی غیر معمولی لیاقت، صلاحیت کی وجہ سے ان کو Imperial Legislative کونسل کا ایڈیشنل رکن مقرر کیا گیا اور سر کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہ اس وقت کے ہندوستان میں اتنی چھوٹی ریاست کو دیکھتے ہوئے ان کی غیر معمولی اہلیت اور قابلیت کا اعتراف تھا۔ (۱۷)

نواب مالیر کوٹلہ کا انتقال ہوا تو ولی عہد نابالغ تھے۔ حکومت برطانیہ نے انہیں مالیر کوٹلہ کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا۔ نواب سرامیر الدین احمد خان نے اپنی ذہانت اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ مالیر کوٹلہ کا انتظام بہتر بنا دیا۔ بلکہ اس کی آمدنی میں بھی اضافہ کر دیا۔ اس کی فوج کو جدید خطوط پر منظم کیا اور جدید اسلحہ سے لیس کیا۔ محکمہ مال کی اصلاح کی اور یوں کوئی ۹ سال تک مالیر کوٹلہ کے انتظامی فرائض سرانجام دینے کے بعد ۱۹۰۲ء میں مالیر کوٹلہ کی ریاست صاحبزادہ احمد علی خان کے سپرد کی لیکن اس کے بعد بھی ۲، ۳ سال تک مشیر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

جب یہ مالیر کوٹلہ کو سنبھالے ہوئے تھے تو لوہارو کے روزمرہ نظم وضبط کی ذمہ داری اپنے چھوٹے بیٹے اعظم مرزا کے سپرد کر رکھی تھی کہ یہ بھی انتظامی تربیت کا حصہ ہوتی ہے۔ اس وقت ان کے چھوٹے بھائی نوابزادہ عزیز الدین احمد خان چیف منسٹر لوہارو تھے۔ عزیز الدین احمد خان بیگم عالؔی کے دادا تھے)۔ (۱۸)

نواب سرامیر الدین احمد خان انتہائی ذہین تھے اور ان کی تربیت اس انداز میں ہوئی تھی کہ ذہانت قدم قدم پر اُن

کے سامنے تھی۔ اُن کی ذہانت وفراست کے واقعات متعلقہ تاریخی کتب میں مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر سرلارنس گورنر پنجاب بن کر لاہور آئے تو انھوں نے لاہور میں اپنا دربار منعقد کیا ان درباروں کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہوا کرتا تھا کہ گورنر کا تعارف براہ راست ریاستی حکمرانوں سے ہو جائے اور گورنران کے معاملات، حالات و مسائل سے آگاہ رہے اس دربار کی روداد میں کہا گیا ہے۔ کہ "اس دربار میں ہر عمر کے لوگ دیکھنے میں آئے، جہاں نوجوان اور سفید ریش بزرگ تھے۔ وہیں یہ سات سالہ نواب لوہارو بھی تھے۔ جنہوں نے اپنے فرائض نہایت مستعد اور تربیت یافتہ شہزادے کے طور پر نبھائے"۔

نواب سرامیرالدین احمد خان نے اس دربار میں بھی شرکت کی جو ملکہ وکٹوریہ کا امپیریل دربار تھا اور ۱۸۷۷ء میں دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ اس وقت انکی عمر ۱۷ سال تھی۔ اور اس کے بعد انھوں نے تین اور درباروں میں شرکت کی جو ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۷ء، ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوئے۔

ان درباروں میں شرکت اور کارکردگی سے ان کی اہلیت اور استعداد کا جو تاثر متعلقہ حکام کے ذہن پر مرتب ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران حکومت برطانیہ نے ان کو بغداد میں اپنا سفیر مقرر کیا۔ (۱۹)
ان کے منصب کو یوں بیان کیا گیا۔

""His Britanic **Majestys political** envoy at Basra under the Birtish resident of Bughdad

عراق، خلافتِ ترکی کا علاقہ تھا وہ تین صوبوں پر مشتمل تھا ان میں سے ایک صوبہ بصرہ کہلاتا تھا۔ حکومت برطانیہ کی نظر میں بصرہ کی بڑی اہمیت تھی چونکہ شط العرب کے دہانے پر واقع تھا۔ انگریزوں کی ایک تیل نکالنے والی کمپنی **Anglo Persian** تھی جو ایران میں تیل نکالنے کا کام کر رہی تھی۔ ایسے میں بصرہ برطانوی مفادات کیلئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس لئے انگریزوں کی نظریں بصرہ پر لگی ہوئی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ اگر ترکی کو شکست ہو اور عراق کی تقسیم ہو تو صوبہ بصرہ پر ان کا اثر و رسوخ برقرار رہے۔ بہر حال جنگ عظیم میں ترکی کو شکست ہوئی اور عراق کے حصے بخرے کئے جائے لگے اور اس کے صوبوں کو الگ الگ بادشاہتوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ تیار کیا جانے لگا تو اس وقت بصرہ کی "بادشاہت" کیلئے سرامیرالدین احمد خان کا نام برطانوی حلقوں میں زیر بحث رہا اور ہندوستانی اخبارات میں بھی اس کی بازگشت سنائی دی۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار "منادی" میں اس طرف توجہ دلائی تھی۔ (۲۰)

جنرل شیر علی نے اپنی کتاب The Elite Minority Princes Of India میں بھی اس تجویز کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ بہر حال سرامیرالدین احمد خان بصرہ کے حکمران تو نہ ہو سکے البتہ بغداد میں حکومت برطانیہ کے سفیر مقرر ہوئے اور بڑی دانشمندی اور سفارتی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس دوران ان کے صاحبزادے مرزا اعظم خان ریاست لوہارو کے امور کی دیکھ بھال کرتے رہے۔

سرامیرالدین احمد خان غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کے حامل تھے۔ایک چھوٹی سی ریاست کا انتظام وانصرام ان کی ذہنی وعملی تربیت کیلئے بہت تنگ تھا اور وہ اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے وسیع تر میدان کے خواہاں تھے۔اسی لئے جب ۱۹۰۲ء میں دہلی میں محمڈن کیشنل کانفرنس کا سولہواں اجلاس منعقد ہوا (جس میں ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔یہ اجلاس ڈھاکہ میں ہوا) تو اس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر بنے۔اس کانفرنس کی صدارت سرآغا خان نے کی تھی۔ مسلم لیگ کے قیام میں بھی سرامیرالدین احمد خان کافی سرگرم رہے۔ریاستی حکمرانوں کے باہمی تنازعات میں بھی ان کی ذات کسی نہ کسی طرح زیرِ بحث آتی رہی اور وہ ان تنازعات کو خوش اسلوبی سے نمٹاتے رہے۔(۲۱)

نواب سلطان جہاں بیگم اپنے بعد اپنے چھوٹے بیٹے حمید اللہ خان کو بھوپال کا نواب بنانا چاہتی تھیں مگر گورنر جنرل نے ان کی اس خواہش سے اتفاق نہ کیا۔چنانچہ سلطان جہاں بیگم نے گورنر جنرل کے موقف کے خلاف اپیل کے لئے انگلستان جانے کا فیصلہ کیا۔سلطان جہاں بیگم کے بڑے بیٹے نے سرامیرالدین احمد خان کو اپنا وکیل بنا کر بھیجا۔اگرچہ اس معاملہ میں سرامیر الدین احمد خان کو کامیابی نہ ہوئی اور سلطان جہاں بیگم کا موقف تسلیم کرلیا گیا۔مگر اس موقع پر سرامیرالدین احمد خان کی شہنشاہ جارج پنجم سے ملاقات دلچسپ رہی۔سرامیرالدین احمد خان کی چار بیٹیاں تھیں اور چاروں کسی نہ کسی حکمران گھرانے میں بیاہی گئی تھیں۔ایک بیٹی نواب قطب الدین والئی ممدوٹ کے ساتھ بیاہی گئی،دوسری نواب پٹودی،تیسری ڈیرہ اسمٰعیل خان کے نواب اللہ نواز خان اور چوتھی بیٹی نواب شیخ جہانگیر میاں منگرول سے بیاہی گئی تھیں۔

یہ بات شاہ جارج پنجم کے علم میں آچکی تھی،تو بوقتِ ملاقات اُنھوں نے ازراہ مزاح سرامیرالدین احمد خان سے کہا:

fear I sooner "If you carry on your doughters Marriges that way I loose my India Empir to you"

ولادت:

سرامیرالدین احمد خان کے بیٹے نواب زادہ مرزا جمیل الدین احمد خان عالی ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو چہ چیلاں دہلی میں اپنی ننھیال میں پیدا ہوئے۔(۲۲)

عالی کو اپنی اس مبینہ تاریخِ پیدائش پر ہمیشہ شبہ رہا کیونکہ وہ اپنے گھر میں روایتی طور پر یہ سنتے آئے تھے کہ فلاں سے بڑا اور فلاں سے چھوٹا ہے اور ان خاندانی روایات کی رو سے یہ تاریخ لگا نہیں کھاتی تھی۔عالی کے والد سرامیرالدین احمد خان نوجوانی ہی سے اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے وہ ریاست لوہارو کے ذخیرہ کتب میں محفوظ تھا (آزادی کے بعد اغلباً ۱۹۵۶ء) یہ رضا لائبریری رامپور کے لوہارو کلیکشن میں منتقل کردیا گیا۔

جمیل الدین عالی کے والد کی عادت تھی کہ ہر بچے کی تاریخِ ولادت روزنامچے میں درج کرلیا کرتے تھے۔قرۃ

العین حیدر جب " گردشِ رنگِ چمن " لکھ رہی تھیں تو اس سے متعلق تاریخ تحقیق کے سلسلے میں وہ رضا لائبریری بھی گئیں، اور وہاں چند روز مقیم بھی رہیں۔ عالؔی نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس روز نامچے میں سے ان کی تاریخِ پیدائش کا اندراج دیکھ کراس کی تصدیق کر دیں اس روز نامچہ میں ان کی صحیح تاریخِ پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء درج ہے۔ اُنھوں نے عرشی زادہ سے نقل کرا کے بھجوادی۔ اب روز نامچہ کی ایک عکسی نقل راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالی کا جب میٹرک کا فارم پُر کیا جا رہا ہوگا تو ان کے ماموں سید ناصر مجید کو جو ان کے والد کے انتقال کے بعد عالؔی کے نگران بھی تھے۔ درست تاریخِ پیدائش یاد نہ ہوگی۔ اسلئے اُنھوں نے اندازاً یکم جنوری ۱۹۲۶ء لکھ دی لیکن روز نامچہ کی اس تصدیق کے بعد سے خود عالؔی کے انٹرویوز اور تحریروں میں ان کی درست تاریخِ پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء قرار پائی ہے۔

گھریلو ماحول:

۱۹۳۶ء میں مرزا جمیل الدّین احمد خان عالؔی کے والد سرا میر الدّین احمد خان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت عالؔی کی عمر بارہ سال تھی۔ عالؔی کی والدہ ان کی تعلیم کی وجہ سے زیادہ تر دہلی میں رہتی تھیں کیوں کہ سرا میر الدّین روابط و سیاحت کے سلسلے میں اکثر دوروں پر رہتے تھے اور پھر لوہارو میں رعایا کیلئے ایک عام مدرسہ کے سوا کوئی اچھا اسکول نہ تھا۔ عالؔی کسی پرائمری مدرسے میں نہیں گئے۔ ٹیوٹر سے پڑھتے رہے تھے۔ باقاعدہ تعلیم پانچویں جماعت سے اینگلو عربک ہائی اسکول دریا گنج دہلی سے شروع کی۔

والد کے انتقال کے بعد انکے ذاتی خاصے اچھے ذرائع آمدنی اور برلاصنعتی خانوادے کی ایک سیاسی بغاوت پر ریاست میں انتظامی اصلاحات کے ضرورت پر حکومت ہند کے عام احکاماتِ تخفیف سے نہ صرف یہ کہ عالؔی فیملی کے وظائف میں بھی بے حد کمی ہوگئی۔ بلکہ یہ لوگ کئی مروجہ مراعات سے بھی آہستہ آہستہ محروم ہو گئے۔ جو ریاست سے ششماہی نذر کی وصولی اور نقد اجناس کی صورت میں ملتی تھیں۔

عالؔی کو ان باتوں کا علم کافی بعد میں ہوا، مگر اُنھیں اس کی بھنک پڑ جاتی تھی۔ والدہ کے زیورات رہن رکھے جا رہے تھے یا فروخت ہو رہے تھے۔ عالؔی اپنی والدہ اور دو بہنوں کے ساتھ ددھیال کو چھوڑ کر ننھیال (کوچہ چیلاں) میں آ گئے تھے۔ عالؔی کا کوئی سگا بھائی نہیں تھا۔ (ایک جمال الدّین احمد خان صغر سنی میں انتقال کر گئے تھے۔) چچا ضعیف العمر بے اولاد اور دنیا سے بے زار، صرف علمی دلچسپی کی حد تک عالؔی کے ساتھ تھے۔ چنانچہ تربیت کا سارا بوجھ بڑے ماموں (سید ناصر مجید) نے سنبھال لیا تھا۔ وہ عالؔی سے بہت محبت کرتے تھے مگر زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ عالؔی ماموں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مگر اپنے معاملات میں دخل اندازی برداشت نہ کرتے تھے۔ دراصل عالؔی کو صحیح حالات کا اندازہ نہ کبھی ہوا اور نہ ہی اُنھوں نے سمجھنے کی کوشش کی کیوں کہ اکلوتے پن نے عادتیں خراب کر رکھی تھیں۔ مثلاً اب انہیں ہر سال پہاڑ پر کیسے بھیجا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت میں شوریدہ سری پیدا ہوگئی نہ جانے اس وقت کیسے کیسے (Complex) پیدا نہیں ہوئے ہونگے۔

اس وقت دستور یہ تھا کہ چند دوست والیان ریاست سے مدد مانگی جاتی تھی۔ عالی کے چند بھتیجوں یعنی نواب اعظم مرزا دربار کے لڑکوں کو مہاراجہ پٹیالہ نے مدتوں اعلیٰ تعلیم کے وظائف دیئے تھے۔ مرحوم مہاراجہ کپورتھلہ، عالی کے والد کے پگڑی بدل بھائی کہلاتے تھے۔ عالی کے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے عالی فیملی کو خطوط لکھے اور عالی کا داخلہ اپنے طور پر انگلستان کے مشہور اسکول "ہیروز" میں کرادیا۔ مگر جب وہ انگلستان جاتے ہوئے عالی کو ساتھ لے جانے کے لئے دہلی سے گزرے تو عالی کی والدہ نہ مانیں۔ عالی اس وقت خاصے کم عمر تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کی والدہ سیدزادی تھیں ان کا کہنا تھا کہ "ہم امیر نہ سہی مگر غیر سے بھیک نہیں لے سکتے"۔ (۲۳)

عالی کے بہت عزیز دوست محمد عمر کے بقول

"جمیل ایک نہایت ذہین و فطین اور بے باک لڑکا تھا۔ ویسا ہی آج بھی ہے۔ میں یاد کرتا ہوں۔ تو ایک تیز مزاج فقرہ باز نصابی تعلیم سے جی چرانے والا مگر پڑھنے والا ایک خوش شکل، خوش پوش، چنچل نوجوان تھا جو بے حد حساس اور جلد ناراض ہونے والا ساتھی تھا۔ ہمارا کالج متوسط مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ تھا۔ جو طالب علم علی گڑھ نہ جاسکتے تھے وہ ادھر آجاتے تھے جس زمانے میں ہم پڑھتے تھے یہاں صرف ایک ہندو استاد شنکر صاحب ریاضی پڑھاتے تھے۔ مگر کوئی طالب علم ہندو نہ تھا۔"

ہمارے کالج کی بڑی شاندار تاریخ تھی پہلے یہ دہلی کالج تھا۔ اس سے پہلے اعتمادالدولہ ٹرسٹ کا مدرسہ تھا (غالباً اٹھارہویں صدی کے آخر میں) اس قومی درسگاہ سے سرسید احمد خان، ماسٹر رام چندر، مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد جیسے بے شمار ہیروز وابستہ رہ چکے تھے۔ غالب نے بھی یہاں فارسی پڑھانے کی درخواست دی تھی۔ ہمارے اولڈ بوائز میں بڑے بڑے نام آتے ہیں۔ شعراء میں علی سردار جعفری اور اختر الایمان تو ہمارے ہی سینئر تھے۔ ہمارے اساتذہ دہلی، یوپی اور پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ طلبہ دہلی اور گورنمنٹ آف انڈیا میں اور کئی صوبوں میں کام کرنے والے مسلمانوں کے بچے تھے۔ جن میں پنجابیوں کی تعداد خاصی ہوتی تھی۔ (۲۴)

"ایک مدت تک جمیل الدین عالی سال میں دومرتبہ ریاست جایا کرتے تھے تاکہ عید اور دسہرے پر نامزد دیہات سے نذر لے سکیں کبھی یہ رقم اچھی خاصی ہو جاتی تھی، کبھی کم۔ یہ روایت ظالمانہ تھی۔ تھرڈ ائیر کے بعد عالی نے اس مقصد کے لئے ریاست جانا چھوڑ دیا تھا۔

"ہمارے ساتھ رہ کر اپنے عزیزوں کی نسبت روشن خیال اور حمید ہاشمی مرحوم کے زیر اثر کسی قدر انقلابی بھی ہو گئے تھے۔ جب کیمونسٹ پارٹی پر Ban تھا تو ان کے ہم جماعت کیمونسٹ حمید ہاشمی اور ان کے برادر انیس ہاشمی، عالی سے کچھ کیمونسٹ لٹریچر بھی تقسیم کرواتے تھے کیوں کہ معروف نواب زادہ ہونے کی وجہ سے ان پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔"

"بچپن کی یتیمی اور والدہ کے لاڈ پیار نے عالی کو نارمل نہیں رہنے دیا تھا۔ شکر ہے بعد میں یتیمی کے اثرات مثبت طور پر مرتب ہوئے ورنہ یہ بہت جلد تباہ ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ ان کو تباہی سے بچانے میں ان کی والدہ کی دعاؤں کے ساتھ ہمارے کالج کی دینی اور ثقافتی روایات کا بڑا دخل ہے۔ جہاں عالی کو بھی ایک عام لڑکے کی طرح رہنا پڑا۔ بلکہ جیسا کہ عالی نے خود اختر الایمان کے خاکے میں بتایا ہے کہ جب وہ کالج میں داخل ہونے آئے تو اپنی خاندانی چوگوشیہ ٹوپی (مقلسی) پہنے ہوئے تھے۔ اس کی اجازت ان کے بزرگوں کو شاہ علم ثانی نے دی تھی۔ اس وقت اختر الایمان تھرڈ ائیر کے سینئر اور کالج کے لیڈر تھے۔ وہ خود جمیل الدین عالی کے پاس آئے انہیں "مرغ زریں" کا خطاب دیا۔ اپنے جونیئر حاضر باشوں سے ان کی ٹوپی اتروائی اور ہدایت کی کہ آئندہ وہ ٹوپی پہن کر کالج نہ آئیں۔ پھر انھیں اپنے ہم خیال ساتھیوں کی صحبت میسر آ گئی۔ شروع شروع میں ہم نے ان کا مذاق اڑایا۔ لطیفہ بازی کی مگر جلد ہی یہ ہم میں رل مل گئے۔ پھر میں اور جمیل اپنی کلاس کے ایک نہایت ذہین طالب علم محمد اطہر سے اک ساتھ محبت کرنے لگے۔ وہ ایک سانولا سلونا سائز کا تھا جس کا تعلق سہارن پور سے تھا۔ اس نے بٹلر اسکول شملہ سے میٹرک (پنجاب بھر میں) فرسٹ کلاس فرسٹ پاس کیا تھا اس لئے ہم سب اس سے مرعوب تھے۔ وہ جمیل کے ساتھ ڈیبک میں شرکت کرتا تھا۔ میں اکثر اطہر کو اپنی سائیکل پر اس کے گھر چھوڑنے جاتا تھا۔ جمیل مجھ پر لال پیلا ہوتا۔ جوانی کے اس عشق کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔" ہم دوست بھی تھے اور ایک دوسرے کے رقیب بھی۔ اس دور کے نفسیاتی تجزیے بہت ہو سکتے ہیں۔ نتیجہ بہر حال ہم تینوں کیلئے نیک شگون ثابت ہوا۔ جب تک اطہر زندہ رہا ہم تینوں کی دوستی مثالی رہی۔"

"جمیل نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے تعلقات وسیع ہوتے گئے۔ بڑے بڑے لوگوں سے واسطہ پڑنے لگا۔ ۱۹۵۸ء میں اس کے شعروں کے مجموعے کی پہلی کتاب "غزلیں، دوہے، گیت" آئی اور عالی نے اسے اطہر کے نام معنون کیا۔ پھر نثری کتابیں آئیں تو ایک میرے نام اور پھر نور الحسن جعفری کے نام معنون کی" (عالی کے مطابق محمد اطہر نے جب ۱۹۷۹ء میں بہ عارضہ سرطان انتقال کیا تو اطہر کی والدہ نے عالی کو گھر بلوایا اور اطہر کو عالم سکرات میں سمجھ کر دیر تک عالی کو گود میں لٹائے رکھا تھا۔"

"جمیل الدین عالی ایک باوقا اور محبت کرنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ حوصلہ مند اور محنت کر کے آگے بڑھنے والے ہیں۔ یہ کبھی اپنی وفا ترک نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کی جدوجہد اور بڑھتی ہوئی مصروفیات کی وجہ سے انھیں پرانے دوستوں کو پہلے جیسا وقت دینے کا موقع نہیں ملتا ان کی زندگی پہلے خاصی محدود تھی۔ اب کچھ لوگ ان سے خفا ہو گئے، کچھ جلنے لگے مگر یہ ہمیشہ سہتے رہے۔ اپنی طرف سے پھر بھی تعلقات نبھانے کی کوشش کی جب بھی ملے اُسی طرح ملے جیسے پہلے ملتے تھے۔"

"میں کیسے مانوں کہ وہ انا کے مارے ہوئے ہیں۔ ساری عمر فیض کے شیدائی رہے۔ ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، سید

ضمیر جعفری جیسے عظیم ادیبوں کی عزت افزائی کرتے رہے۔ انھیں انجمن ترقی اردو سے نشان سپاس دلوائے بے شمار حق دار ادیبوں کو گلڈ اور آدم جی ایوارڈ دلوائے اور خود کو ضوابط بنا کر ہمیشہ ایسے مالیاتی انعاموں سے محروم رکھا۔ (تاکہ انعامات سو فیصد معتبر رہیں) ایسا بے لوث خدمت کرنے والا ادیب آج کے زمانے میں کہاں ملے گا۔ (۲۴)"

"جمیل نے ملازمت کے دوران ڈسپلن کی پابندی کی مگر کسی افسر سے دب کر نہیں رہے۔ صاف گوئی اچھی بات ہے لیکن عالی کی گفتگو میں تہہ داری اور کاٹ ہے۔ جو ہر افسر سے برداشت نہیں ہوسکتی۔ اسی وجہ سے انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے"۔ ایک مرتبہ محمد عمر صاحب نے ٹی وی پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو عالی کے کالمی مجموعوں پر کسی کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا۔ ڈاکٹر فرمان نے عالی کی شخصیت کا یہ پہلو بڑی خوبی سے ایک فقرے میں بیان کردیا اُنھوں نے کہا تھا کہ "یہ عالی چھوٹوں میں تو ان سے بھی چھوٹے ہوکر رہتے ہیں۔ مگر کسی بڑے سے بڑے سے بڑے تک سے بھی آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں" بے چارے چھوٹے تو احترام کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتے مگر بڑے آن کی آن میں بڑے بڑے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میرے دوست کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا مگر وہ ہنسی خوشی جھیل گئے۔ پکی سروس سے استعفیٰ دیدیا پھر نیشنل پریس ٹرسٹ بھی چھوڑنا پڑا۔ ایک مرتبہ نیشنل بینک کی نوکری بھی چھوٹی تو اسی وجہ سے کہ وہ بعض بڑوں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے تھے۔ وہ ادوار انھوں نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑی سختیوں میں گزارے ہیں"(۲۵)

"عالی ایک انتھک آدمی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آدمی کام کرنے پر آئے تو جن ہوتا ہے۔ بیک وقت نوکری، رائٹرگلڈ، انجمن ترقی اردو، اردو کالج وار دو سائنس کالج، کئی سمتوں میں سولہ گھنٹے کام کرتے رہے ہیں۔ اب دل کا دورہ پڑنے کے بعد سے کسی نئے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتے مگر پھر بھی روزنامہ "جنگ" کراچی میں ہفتہ وار کالم (نقار خانے میں) لکھتے ہیں مختلف موضوعات پر سیکڑوں کتابیں مطالعہ میں رکھی ہتی ہیں۔ جب سے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ اہلیہ کو بھی پارٹیوں اور سفر میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے میرے ساتھ بڑے دنوں میں اتنے دکھ جھیلے ہیں کہ کیا بیان کروں۔ تو اب اچھے دنوں میں کیسے شریک نہ کروں سچ تو یہ ہے کہ اہلیہ کے تعاون کے بغیر اتنی ذمہ داریاں سنبھالی بھی نہیں سکتے تھے۔"

"عالی نے ہجرت کے بعد اپنے دو سالوں اور ساس صاحبہ کو تو ہر حال میں اپنے ساتھ ہی رکھا۔ جب لڑکے پڑھ لکھ کر بڑے ہو گئے تو ان کے گھر بسا دیئے۔ خوشدامن صاحبہ تقریباً ۲۰ سال آخر وقت تک ان کے ساتھ رہیں۔"

"عالی اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ آخری بار جب وہ بیمار پڑیں تو انھیں ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ ایک بڑا کمرہ بک کرالیا تھا۔ بڑی بہن کو بھی بلا لیا تھا، دو نرسیں بھی پرائیوٹ طور پر رکھ لی گئی تھیں لیکن پھر بھی عالی خود ہسپتال میں رہتے اور وارنڈے میں سوتے تھے اور راتوں کو بار بار خود اٹھ کر والدہ کی حالت دیکھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ ڈاکٹر احترام کی وجہ سے کچھ نہ کہتے، ایک مرتبہ ایک ماہر امراض قلب نے دبی زبان سے عالی سے کہدیا کہ اللہ آپ کی والدہ کو آپکے سر پر سلامت رکھے مگر ایک طبعی عمر ہوتی ہے۔ اس وقت ان کی والدہ کی عمر ۹۰ سال کے قریب

تھی، اس بات کا عالؔی نے ایسا برا مانا کہ کئی مہینے ڈاکٹر صاحب سے بات نہیں کی ان کا خیال تھا کہ سائنس زندگی کو سیکڑوں برس تک لے جا سکتی ہے۔ ایک عقلمند شخص ماں کی محبت میں ایسا دیوانہ ہو سکتا ہے؟ رات دن کی محنت اور خدمت گزاری نے عالؔی کو پژمردہ کر دیا تھا۔"

"ایک روز خود عالؔی پر دل کا دورہ پڑا انھیں امراض قلب کے ہسپتال میں منتقل کیا گیا۔ یہ جناح ہسپتال کے سامنے ہی ہے۔ عالؔی ہسپتال میں پڑے روتے رہتے تھے کہ ماں پر کیا گزر رہی ہوگی؟ عالؔی کو چھ ہفتے بعد فارغ کر دیا گیا۔ ان کے بچے عالؔی کی والدہ کو بغیر عالؔی کو بتائے پہلے ہی گھر لے جا چکے تھے۔ پھر وہ چار پانچ ماہ زندہ رہیں۔ اور ۱۲، اکتوبر ۱۹۹۲ء کو خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اُن کے انتقال پر کئی برس گزر گئے مگر یہ ماں کی وفات پر کچھ نہ لکھ سکے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے، کچھ بولنے والا آدمی اپنے شدید احساسات کی ترجمانی نہ کر سکا۔ اس غم کے بیان کے لئے ان کے پاس الفاظ نہیں۔ ابھی انھیں صبر ہی نہیں آیا۔ اپنے سامنے والدہ کا ذکر ایسے نہیں ہونے دیتے جیسے وہ جا چکی ہوں۔ چند دوست، بیوی بچے ان کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے سامنے اس قسم کی کوئی بات نہیں کرتے۔(۲۶)

تعلیم

جمیل الدین عالؔی کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ طریقہ یہ تھا کہ نوابزادوں کے لئے گھر پر ہی اتالیق مقرر کر دیئے جاتے جو ان کو متداول علوم ریاضی، اردو، عربی، انگریزی وغیرہ پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ماہرین فن سپہ گری، تیراکی، گھڑ سواری وغیرہ کی تربیت دیا کرتے۔ مگر عالؔی والد کے انتقال (۱۹۳۷ء) کے بعد اپنے ننھیال میں آ رہے تھے اور ماموں سید ناصر مجید کی نگرانی میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس درویش مزاج خاندان کے اپنے وسائل بھی انتہائی محدود تھے۔ اس لئے عالؔی کو اب وہ مواقع میسّر نہ تھے جو ریاست میں رہ کر حاصل ہو سکتے تھے چنانچہ گھڑ سواری اور تیراکی کے علاوہ دوسرے فنون حاصل نہ کر سکے۔

ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد انھیں اینگلو عربک ہائی اسکول دریا گنج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ اسکول مسلم طلبہ کیلئے مخصوص تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اسی اسکول سے عالؔی نے میٹرک پاس کیا اور اسی سال انٹرمیڈیٹ کے لئے اینگلو عربک کالج اجمیری گیٹ میں داخلہ لے لیا۔

انٹر میں داخلے کیلئے جب عالی کالج پہنچے تو انکی ہیئت کذائی خالص نوابی تھی۔ چوگوشیہ ٹوپی اور زربفت کی شیروانی پہنے پیچھے پیچھے ملازم بستہ اٹھائے یہ کالج کے احاطہ میں داخل ہوئے اتفاقاً پہلی ملاقات جس سے ہوئی وہ اختر الایمان تھے۔ جو کالج کے سینئر طالبعلم تھے اُنھوں نے پوچھا" کیسے تشریف لانا ہوا؟"

"پڑھنے کے لئے آئے ہیں"

اختر الایمان نے بستہ بردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا اور یہ کون ہیں؟ کہا" ہمارے ملازم ہیں"

اختر الایمان مسکرائے اور کسی قدر محبت سے کہا میاں "مرغ رزیں" بن کر کالج نہ آیا کیجئے۔ یہ چوگوشی ٹوپی اتاریئے اور کل سے ملازم بھی ساتھ نہ آئے۔ اپنا بستہ خود اٹھایئے۔ یوں اختر الایمان
سے پہلی ملاقات ہوئی جو بتدریج دوستی میں بدلتی گئی۔

۱۹۴۲ء میں عربک کالج دہلی سے انٹر اور ۱۹۴۴ء میں اسی کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد اُنھوں نے ایم۔ اے (اقتصادیات) میں داخلہ لے لیا۔ ادھر ملکی حالات دگرگوں اور غیر یقینی تھے۔ تحریکِ پاکستان فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندو مسلم کشیدگی خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ لوگ پاکستان بننے اور پاکستان روانہ ہونے کیلئے پابہ رکاب تھے۔ ایسے میں کسی کام کو یکسوئی سے کرنا ممکن نہ تھا۔ مگر تعلیم میں رکاوٹ کا سبب محض ملکی حالات نہ تھے۔ ایسے حالات میں شادی کا ہو جانا بھی عالی کے کیریئر کے لئے ضرر رساں ثابت ہوا، اور ان کی توجہ دوسری طرف ہو گئی۔ اس لئے وہ ایم۔ اے اقتصادیات نہ کر سکے۔

شادی

عالی کی شادی کا قصہ بھی دلچسپ اور داستانی نوعیت کا ہے۔ بی۔ اے کے امتحان کے بعد عالی شدید علیل ہو گئے رو بہ صحت ہوئے تو اہل خانہ نے تبدیلی آب و ہوا کے لئے انہیں کہیں بھیجنے کا ارادہ کیا۔
مگر یہ بھی خیال تھا کہ ایسی جگہ جائیں جہاں کے لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں کئی گھرانے ایسے تھے جہاں وہ جا سکتے تھے۔ اور بے تکلفی کے ساتھ رہتے مگر قرعہ فال ان کے چچازاد بھائی مرزا صمصام الدین احمد خان فیروزؔ کے نام نکلا جو بلند شہر میں رہتے تھے۔ عالی کو وہیں بھیج دیا گیا۔

ان ہی دنوں سید حامد نئے نئے ڈپٹی کلکٹر ہو کر بلند شہر آئے تھے یہ وہی ہیں جو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ بھارت کے وفاقی کامرس سکریٹری بھی رہے اب ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔

سید حامد کا مرزا صمصام الدین احمد خان فیروزؔ کے یہاں آنا جانا تھا۔ عالی بھی سید حامد کے گھر جایا کرتے تھے۔ حامد صاحب کی والدہ عالی سے بڑی محبت کرتی تھیں۔ انھیں سب بی جان کہا کرتے تھے۔ صمصام الدین احمد فیروزؔ کی صاحبزادی طیبہ بانو کو بھی بی جان بہت پسند کرتی تھیں۔ طیبہ بانو کی والدہ انور زمانی بیگم نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی پوتی تھیں۔ طیبہ بانو نے اُنہی کے ہاتھوں پرورش پائی تھی۔ بی جان ان کے کردار و عادات کی شیدائی تھیں۔ باتوں باتوں میں اُنھوں نے عالی سے طیبہ بانو کا ذکر والہانہ انداز میں کیا۔ اور عالی انکی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ بی جان نے قیاس کیا کہ عالی طیبہ بانو کیلئے دل میں خاصہ نرم گوشہ لئے بیٹھے ہیں۔ بی جان نے کہا تم ان کو کتنا ہی پسند کرتے ہو۔ شادی ان سے نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ وہ عمر میں تم سے ۵ سال بڑی ہیں۔ بس یہی ایک جملہ عالی لے لئے چیلنج بن گیا ان کے مزاج کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ مشکل اور ناممکن کام کو ممکن بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ طیبہ بانو سے شادی ان کے لئے چیلنج بن گئی۔

اب معاملہ مرحلوں میں طے کیا جانے لگا۔ پہلے اُنھوں نے اپنے طور پر طیبہ بانو کا عندیہ لیا پھر اپنے عم زاد صمصام الدین احمد خان فیروز سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ فیروز کے مزاج میں بڑی سختی اور آتش زیر پا کا ہونا تھا۔ کسی بھی بات پر بھڑک کر انکار کر دیں تو راضی کرنا شوار ہو جاتا، مگر عالی بہر حال ان کے خاندان کے فرد تھے۔ ان کی خواہش سن کر کہا وہ کہ طیبہ کی مرضی معلوم کئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتے۔

چنانچہ ایک دن باپ نے طیبہ بانو کو بلایا اور ان سے عالی کی خواہش کا ذکر کیا۔ اور اس کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ کر دیا۔ فرمایا کہ موصوف سید ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ دن میں ساٹھ ساٹھ سگریٹ پی جاتے ہیں۔ شاعر ہیں شراب بھی پیتے ہوں گے۔ سوچ لو کہ ایسے آدمی کے ساتھ تم گزر کر سکو گی" طیبہ بانو نے مناسب انداز میں گزر کر لینے پر آمادگی ظاہر کر دی اور یوں شادی کے لئے فضا ہموار ہو گئی۔ (سید ہاشمی مرزا صاحب اور عالی کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ گو عمر میں عالی سے بہت بڑے تھے۔ انکی مخالفت مخلصانہ تھی۔ طیبہ نے انکے سامنے پرورش پائی تھی۔ عالی کو وہ پسند کرتے تھے مگر اُنہیں غیر ذمہ دار اور بچہ ہی سمجھتے تھے۔

۳۰ ستمبر ۱۹۴۴ء کو عالی کی شادی طیبہ بانو سے ہونا قرار پائی یہ تقریب بہت سادہ تھی۔ صرف سمدھیانے کے قریبی عزیز شریک ہوئے اگر اس وقت ملکی حالات درست ہوتے تو اس شادی میں کون کون لوگ نہ شریک ہوتے۔ ان پریشان کن حالات میں شادی کا پھندہ کون اپنی گردن میں ڈالتا ہے۔ مگر عالی کی گردن میں یہ پڑ چکا تھا۔

اب عالی نے ایم۔ اے (اقتصادیات) کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی ساری توجہ ملازمت کے حصول پر مرکوز کر دی۔ بے کار نوجوان سے چاہے وہ نواب زادہ ہی کیوں نہ ہو، کون اپنی بیٹی بیاہ دے گا۔ اسی خیال سے اُنھوں نے ملازمت کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے۔ مگر ملازمت کا حصول کارے دارد تھا۔ جنگِ عظیم دوم اپنے آخری مراحل میں تھی۔ دنیا بھر میں بے روزگاری عروج پر تھی۔ انہی دنوں معلوم ہوا کہ وار فرنٹ سونگ ڈیپارٹمنٹ میں کوئی آسامی زیر انتظام ہے۔ اس ادارے کے ڈائریکٹر جنرل حفیظ جالندھر تھے۔ عالی کے بڑے بھائی اعتزاز الدین جو جالندھر میں ایس، پی تھے دہلی آئے ہوئے تھے۔ (۲۷)

ان کے علم میں بات آئی تو اُنھوں نے کہا یہ کوئی مسئلہ نہیں میں تمہیں حفیظ صاحب سے ملوا دوں گا۔ دوسرے روز وہ عالی کو لے کر حفیظ صاحب کے پاس گئے۔ حفیظ نے محکمے میں سرے سے کسی آسامی کے وجود سے انکار کر دیا۔ ملازمت کے حصول کا معاملہ بدستور برقرار رہا۔ ایک بڑے بھائی شاہ رخ مرزا (اعزاز الدین احمد خان کو گھر میں پیار سے شاہ رخ مرزا کہا کرتے تھے) نے عالی کو مشورہ دیا کہ وہ ملازمت کے لئے ریاستوں کا رخ کریں۔ وہاں رشتے ناطے، دوستیاں واقفیتیں ہیں۔ اس لئے حصول ملازمت دشوار نہ ہوگی۔ چونکہ ان کا تعلق لوہارو سے تھا اس لئے حیدر آباد دکن، بھوپال، رام پور، ٹونک اور جاورہ کی ریاستیں زیر بحث آئیں۔ حیدر آباد بڑی ریاست تھی۔ اس کے وسائل اچھے تھے اور ملازمت کے

مواقع بھی زیادہ تھے، پھر وہاں ان کے تین پھوپھی زاد بھائی نواب منظور یار جنگ، مرزا مقصود احمد خان، وکیلِ سرکار اور مرزا مقصد احمد خان گتہ دار (ٹھیکہ دار افواج ریاست) ریاستی فوج میں بڑے با اثر تھے وہاں سے پیش کش بھی ہوئی۔ عالی رام پور کو فوقیت دے رہے تھے۔ کیوں وہ دہلی سے قریب بھی تھا وہاں خاندانی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ یہ سب تھا مگر بالآخر نوابزادگی اور آزادہ روی آڑے آگئی۔ لوہارو کے نواب زادے کو رام پور، حیدر آباد، ٹونک یا جاورے کی ریاستوں میں "ہم سروں" کے ماتحت نوکری کرنا گوارا نہ ہوا۔ بالآخر دہلی میں حکومت ہند کے محکمہ نقل و حمل (وار ٹرانسپورٹ) میں اسسٹنٹ کی ایک آسامی خالی ملی اور عالی کا تقرر اس پر ہو گیا۔ اسی زمانے میں گاندھی جی نے یہ تحریک شروع کی کہ فی الحال تقسیم یا ہندو مسلم نزاع کو موضوع گفتگو ہی نہ بنایا جائے بلکہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد کی جائے۔ آزادی کے بعد ہم اپنے گھریلو معاملات پر گفتگو کر کے اس کا حل نکال لیں گے۔ مسلم لیگ کو اس نقطہ نظر سے اتفاق نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد کانگریس تقسیم پر ہرگز تیار نہیں ہوگی، چنانچہ مسلم لیگ نے اتحادیوں کے ساتھ ایک جماعت بنائی جس میں اقلیتیں شامل تھیں۔ انھوں نے تقسیم کے لئے کام شروع کیا۔ مگر تنہا کانگریس اتنی بڑی جماعت تھی کہ اس اتحاد کا تنہا مقابلہ کر سکتی تھی۔ کانگریس نے اس اتحاد کی سخت مخالفت کی اور یہ اتحاد ناکام ہو گیا۔ کانگریس کے خلاف، اتحادیوں نے یومِ احتجاج منایا۔ عالی اس وقت، سرکاری ملازم ہونے کے باوجود مسلم لیگ سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنا چاہتے تھے، چنانچہ وائسرائے گل لاج کے سامنے عوامی احتجاج کے موقع پر انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ یہ ملازمت بڑی کوشش سے ملی تھی مگر ایک کاز کی حمایت کے جنون میں اس سے مستعفی ہونا عالی کو ذرا نا گوار نہ ہوا اور انھوں نے بے روزگاری کے خوف کو نظر انداز کرتے ہوئے اس ملازمت کو خیر باد کہا، پھر کوئی جگہ مل نہ سکی جس پر پاؤں ٹکائے جا سکیں۔ مئی ۱۹۴۵ء میں یورپ کی جنگ اپنے اختتام کو پہنچنے لگی تھی۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں نئی آسامیوں کے نکلنے کا سوال ہی نہ تھا۔

البتہ ان دنوں بھی فوج کا محکمہ تعلقات عامہ متحرک تھا۔ جنگ اور اس کے اثرات کے بارے میں عوامی حمایت کی انگریزوں کو ضرورت تھی اس لئے انھوں نے اس محکمہ میں بڑے باصلاحیت ہندوستانی افسران جمع کر لئے تھے۔ اس شعبے کے سربراہ بریگیڈیر ڈیس منڈ ینگ تھے۔ یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے بعد میں جنرل رومیل پر مشہور کتاب Desert Fox لکھی۔ اس محکمہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کرنل مجید ملک تھے اس کے علاوہ میجر طیب حسن (جو بعد میں پاکستان کی وزارتِ خارجہ سے منسلک ہوئے اور سفیر بنائے گئے) عالی کے ہم جماعت مرزا احسن عسکری (ادبی نام ابن سعید) اور اس وقت میجر فیض احمد فیض بھی اسی محکمہ سے وابستہ تھے۔ یہ سب لوگ عالی کو جانتے اور مانتے تھے۔ مرزا احسن عسکری تو ان کے دوست تھے۔ انھوں نے ہی عالی کو مشورہ دیا کہ بریگیڈیر ڈیس منڈ ینگ سے ملیں۔ عالی ان سے ملے تو انھوں نے کہا "فی الحال آپ غیر رسمی طور پر ہمارے یہاں آ جایئے۔ اپنی کارکردگی دکھایئے تو کوئی بات بنے۔ عالی جی۔ ایچ۔ کیو جانے لگے اور کمیشنڈ افسروں کی طرح معمول کا کام انجام دینے لگے۔ یہ آسامی (آئی۔ ایس۔ پی آر کی طرح تھی) کیوں کہ اصل کام صحافتی اور

تعلقات عامہ کا تھا (اب بھی ہے) معمولی سی فوجی تربیت کے بعد کمیشن مل جاتا تھا۔ اور کپتانی بہ آسانی حاصل کی جاسکتی تھی۔ بریگیڈیئر ینگ نے عالی کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے فرائض سمجھنے کے لئے کرنل مجید ملک سے ضرور مل لیں۔ کرنل مجید ملک نے کہا "صاف بات یہ کہ اس آسامی کیلئے ہم کسی اور سے وعدہ کر چکے ہیں ہم اسی کو منتخب کریں گے۔"

اس کے باوجود عالی بلا معاوضہ کسی موہوم امید پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہیں دنوں امریکی صدر روزویلٹ کا انتقال ہوگیا۔ عالی نے ان پر ایک فیچر لکھا جو ریڈیو سے نشر ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ امریکہ بھی بھیجا گیا، مگر اس تمام حسنِ کارکردگی کے باوجود عالی کا کام بلاتنخواہ چلا کیا۔ بریگیڈیر ڈیسمنڈ ینگ اس دوران چھٹی پر چلے گئے اور کرنل مجید ملک نے قائم مقامی کے دوران اپنے پسندیدہ شخص کو وہ ملازمت دیدی۔ یوں عالی فوجی ملازمت سے بال بال بچے، جی۔ ایچ۔ کیو۔ سے ان کی وابستگی جون ۱۹۴۵ء تک رہی اس کے بعد پھر وہی بے روزگاری اور بقائے حیات کے لئے جدوجہد۔ (۲۸)

۱۹۴۶ء میں آل انڈیا ریڈیو میں بھی متعدد جگہیں خالی تھیں ان پر تقرر کے لئے ایک تحریری امتحان دیا اور کامیاب رہے مگر جب انٹرویو کا مرحلہ آیا تو کامیاب نہ ہو سکے۔ اس زمانے میں انٹرویو بورڈ کے سربراہ پطرس بخاری تھے۔ مدتوں بعد اپنے انتقال سے کچھ قبل شاید ۵۷ء۔ ۵۶ء میں پطرس کراچی آئے اور اپنے چھوٹے بھائی زیڈ اے بخاری کے یہاں قیام کیا۔ عالی ان سے ملنے گئے تو انھوں نے پوچھا "شعر کہہ رہے ہو"؟ جی ہاں کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہوں۔

اور کیا کر رہے ہو! پھر پوچھا۔

"سی۔ ایس۔ ایس۔ پاس کرلیا۔ نوکری مل گئی ہے، وہی کر رہا ہوں"۔

کہنے لگے "اگر میں اس وقت تمھیں لے لیتا تو تم ریڈیو کے ہی ہو کر رہ جاتے تم ذہین آدمی ہو شعروادب اور تخلیق کی دنیا میں کام کرتے رہو۔ پیشے کے طور پر کوئی کام اختیار کرلو کچھ بھی مگر اپنا دائرہ کار نہ چھوڑنا۔

عالی کا کہنا ہے کہ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ریڈیو میں کیوں نہ لیا جاسکا اور یہ کہ پطرس بخاری کے سوچنے کا انداز کیا تھا۔ (۲۹)

پونا میں شالیمار فلمز کے مالک شوکت حسین رضوی فلم سازی میں بڑی شہرت حاصل کر رہے تھے۔ ان کے کاروبار کے منتظم اعلیٰ ملک حبیب احمد جالندھری تھے۔ (انکے تیسرے بیٹے ملک حسیب احمد اور منجھلے ملک نسیم ریڈیو سے وابستہ رہے نسیم عالی کے ہم جماعت تھے) رضوی صاحب بڑے جوہر شناس تھے۔ انھوں نے ہندوستان بھر کے جواہر اپنے یہاں جمع کر لئے تھے۔ جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور اختر الایمان، ان کے ادارے سے وابستہ تھے۔ جن، ملک حبیب احمد کا اوپر ذکر آیا ہے۔ ان کے صاحبزادے نسیم الظفر، عالی کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں انھوں نے پونا میں یومِ اقبال منانے کا پروگرام طے کیا۔ دلی سے مختار صدیقی اور عالی، علی گڑھ سے خورشید الاسلام اور عباس احمد عباسی مدعو تھے۔ چاروں نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ ساتھ ہی پونا روانہ ہوں گے، مگر عالی کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ حاملہ دلہن کو تنہا

کہاں چھوڑیں سسرال والے شملہ میں تھے۔ ننھیال والے کوچہ چیلاں میں ماموں کے ساتھ مقیم تھے جہاں ایک اور ممانی بیاہ کر آئی تھیں۔ اس گھر میں گنجائش نہ تھی۔ عالی نے گھر کی بعض قیمتی اشیاء جن میں غالب اور عالی کے زیرِ استعمال قلم بھی تھے۔ ایک پرانے خاندانی صندوقچے میں بند کیں یہ صندوقچہ آپا شمیم جالندھری (۳۰) کے پاس امانتاً جالندھر میں رکھوا دیا اور بیوی کو لے کر شملہ روانہ ہو گئے تاکہ بیوی کو ان کے میکے، والوں میں پہنچا سکیں۔ جو وہاں گرمیاں گذار نے سر ذوالفقار علی مالیر کوٹلہ کے چھوٹے بیٹے نوابزادہ خورشید علی خاں کے گھر گئے ہوئے تھے نواب سر ذوالفقار علی خاں (علامہ اقبال والے) سے صمصام الدین صاحب اور عالی کی سگی پھوپھی زاد بہن محمودہ سلطانہ بیاہی ہوئی تھیں وہ امید سے تھیں انھیں لئے لئے پھرنا یوں بھی خطرناک تھا۔ کہ ہندوستان میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اور راہِ سفر مخدوش تھی۔ عالی ڈاکٹر خورشید الاسلام، مختار صدیقی اور عباس احمد عباسی کے ساتھ پونا پہنچے اختر الایمان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ عالی نے وہاں ملازمت کا ارادہ ظاہر کیا تو اختر الایمان نے کہا میاں یہ تم سے گیت وغیرہ نہیں لکھوائیں گے بلکہ مکالمے لکھوائیں گے۔ اس میں کچھ شدبد حاصل کرو۔ مجھے تو مکالمہ نگاری کا ملکہ ہو گیا ہے تم اس میں کورے ہو۔ اختر الایمان کی یہ باتیں سن کر عالی نے کمپنی سے بات چیت کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ مشاعرہ پڑھا اور اس مشاعرے کی شہرت پونا سے باہر بھی ہوئی۔ عالی مشاعرہ پڑھ کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ کیوں کہ پونا میں یومِ اقبال کے مشاعرے سے ان کی شہرت حیدر آباد دکن پہنچ چکی تھی۔ بہر حال پونا کا یہ سفر کیریئر کے لحاظ سے ناکام ہی رہا۔ یہ مشاعرہ پڑھ کر اور گھوم گھام کر بمبئی پہنچے۔

اس دوران کچھ اور واقعات پیش آ گئے تھے۔ عالی کے پھوپھی زاد بھائی (نواب منظور یار جنگ) ریٹائرڈ افسر تھے نظام حیدر آباد کے دربار میں اکثر جایا کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اگر عالی کو نوکری کرنی ہی ہے تو حیدر آباد میں کریں بڑی ریاست ہے۔ بزرگوں سے روابط بھی ہیں۔ نوابزادے کو ملازمت دیں گے تو اس کے خاندانی رتبے کا خیال بھی رکھیں گے۔ ایک دن کہنے لگے میاں ہمارے ماموں (عالی کے والد) کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ ہمیں بھی کچھ کرنے کا موقع دو۔ دربار چلو نظام دکن کو سلام کر آؤ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس وقت عالی کا عنفوان شباب تھا۔ باغیانہ خیالات اور کچے پکے افکار کا غلبہ تھا۔ جاگیرداری، سرمایہ داری اور درباریت کے خلاف آوازیں اٹھایا کرتے تھے۔ اس لئے دربار جانے میں ہچکچاہٹ تھی۔ بہر حال بھائی کے کہنے پر نظام کے روبرو حاضر ہوئے اور نذر دی۔

اس زمانے میں حیدر آباد ریاست میں گھومنے پھرنے کی ایک سبیل بھی پیدا ہوئی۔ حیدر آباد کے بعض علاقوں میں فسادات کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ چنانچہ حیدر آباد میں امن کمیٹیاں بنائی گئیں، تاکہ رعایا میں امن و آشتی اور بھائی چارے سے رہنے کی فضا پیدا ہو سکے۔ ایک بڑے پٹیل چیئر مین مقرر ہوئے۔ ان کے بعد اس وقت اس جگہ پر عالی کے تیسرے پھوپھی زاد بھائی مرزا مقصود احمد خان تھے۔ انھوں نے عالی سے کہا چلو تمہیں ریاست کی سیر کرائیں۔

اس زمانے میں مخدوم محی الدین سیاست میں بڑے سرگرم تھے۔ کیمونسٹ تحریک دکن میں ان کے دم سے ترقی

کر رہی تھی۔ وہ زیرزمین چلے گئے تھے۔ حیدرآباد سے ان کے علاقے تلنگانہ میں جانے والوں کی نقل وحرکت کا جائزہ لیا جاتا تھا اور مخدوم کو بھی اس سے مطلع کیا جاتا تھا۔ عالؔی کی آمد کی اطلاع انھیں ہوئی تھی (۳۱) جب یہ امن کمیٹی تلگنڈہ کے قریب پہنچی تو شام کا وقت تھا کار روک لی گئی۔ مخدوم کا پیغام ملا کہ یہ عالؔی کون ہے۔ جسے ہم سمجھ رہے ہیں اگر وہی عالؔی ہے تو چند دوہے لکھ کر بھیجے۔ عالؔی نے اپنے ہاتھ سے چند دوہے لکھ کر بھیج دیئے جو ابھی سفر کے دوران ہی کہے تھے۔ مخدوم نے کہلوایا کہ ہاں یہ وہی عالؔی ہے جو اختر الایمان کا دوست ہے۔ اچھا اور سرگرم نوجوان ہے اسے نہ روکو اس کمیٹی کو جانے دو۔ چنانچہ عالؔی ریاست کا چکر لگا کر واپس حیدرآباد پہنچ گئے۔

واپسی پر عالؔی اپنے پھوپھی زاد بھائی مرزا مقصود احمد خان کے یہاں ٹھہرے ہی تھے کہ بڑے بھائی کا پیغام ملا کہ عالؔی کو پہلی ٹرین سے سوار کرا کے پونا یا بمبئی بھجوا دو۔ سوار کرانے سے قبل اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، چنانچہ عالؔی کو مع ان کے سامان (ایک بکس) کے ٹرین میں سوار کرا دیا گیا کچھ رقم دی گئی۔ اور ٹرین میں سوار کرانے کے بعد حالات سے بھی آگاہ کر دیا گیا۔ ہوا یہ تھا کہ نظام حیدرآباد دکن کی متعدد منکوحہ اور ممتوعہ بیویوں سے ان کی متعدد بیٹیاں تھیں۔ جو کنگ کوٹھی (محل) کے اندر دیواروں کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے محلات میں اپنے شوہروں کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ وہ جوڑے یا داماد باہر نہیں آسکتے تھے۔ البتہ بڑی بیگم سے صرف ایک صاحبزادی تھیں۔ وہ کم رو بھی تھیں۔ نظام انھیں زیادہ چاہتے بھی تھے۔ صرف وہی محل سے باہر جا سکتی تھی نظام والدہ کے مزار پر جاتے تو ان کو ساتھ لے کر جاتے نظام کے دربار میں جب عالؔی پیش ہوئے اور انھیں معلوم ہوا کہ یہ ان کے بزرگ نواب سرامیر الدّین احمد خان لوہارو کے بیٹے ہیں۔ جنھیں وہ خوب جانتے تھے۔ تو نظام کی نظر ٹھٹکی۔ عالؔی نوجوان تھے، خوبصورت تھے اور خوش اطوار بھی، نظام نے انھیں کسی ممتوعہ سے پیدا ہونے والی کسی لڑکی سے نکاح کے لئے منتخب کر لیا اور ایک دن نواب منظور یار جنگ سے اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔ منظور یار جنگ عالؔی کے خسر مرزا صمصام الدّین احمد خان کے دوست بھی تھے اور ہم عمر بھی تو تھے ہی وہ جانتے تھے کہ عالؔی شادی شدہ ہیں، مگر نظام کی خواہش کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ انھوں نے سارا ماجرا ان دونوں بھائیوں کو سنایا۔ پھر طے ہوا کہ عالؔی کو فوراً ریاست کی حدود سے باہر بھیج دیا جائے۔ جب عالؔی روانہ ہونے لگے تب یہ ساری داستان ان کے علم میں آئی۔

چند دن بعد نواب منظور یار جنگ نے حضرت نظام کے حضور رپورٹ پیش کی کہ عالؔی ایک آوارہ منش، شاعر مزاج جہاں گرد تھا۔ آیا، مشاعرہ پڑھا، گھوما پھرا اور واپس چلا گیا۔ اس سے شاہزادی کی شادی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔

یوں حیدرآباد میں حصولِ روزگار کی مہم بھی ناکام ہوئی مگر خیر کا پہلو یہ نکلا کہ ایک اور شادی اور قید کے شر سے بال بال بچے۔ حیدرآباد سے عالؔی سیدھے بمبئی گئے وہاں رفعت سروش تھے جو بہت اچھے شاعر تھے اور تقسیم سے قبل آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ دلی میں عالؔی سے علیک سلیک تھی کیوں کہ وہ بھی اختر الایمان کے یہاں آتے جاتے تھے۔ بمبئی میں ایک کھولی میں رہتے تھے۔ عالؔی بھی اسی کھولی میں رفعت سروش کے ساتھ فروکش ہو گئے۔ ایک روز رفعت سروش نے

مشورہ دیا کہ بمبئی میں بڑی بڑی شعری محفلیں برپا ہوتی ہیں۔ ان میں اعلیٰ سرکاری عہدیدار بھی شریک ہوتے ہیں۔ تم بھی ان محفلوں میں چلا کرو شاید کسی سے رابطہ بہتری اور کارروائی کا سبب بن جائے۔ چنانچہ محفل آرائی شروع ہوئی۔ کسی حوالے سے عالیؔ، سید لقمان حیدر صاحب سے ملے۔ یہ ریزرو بینک آف انڈیا میں اعلیٰ افسر تھے۔ بعد میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے وابستہ ہوئے۔

سید لقمان حیدر صاحب نے عالیؔ سے پوچھا "تمہارے خیال میں پاکستان بن جائے گا"

"ضرور بنے گا" عالیؔ نے جواب دیا

"اگر پاکستان بنا تو تم پاکستان جاؤ گے؟" "ضرور جاؤں گا۔ پاکستان تو ہمارے خوابوں کی تعبیر اور خواہشوں کا گنجینہ ہے" "اچھا تو آپ تھوڑی سے بینکاری سیکھ لیں۔ نوزائیدہ مملکت کو بینکاروں کی بڑی ضرورت ہوگی" سید لقمان حیدر صاحب نے کہا اور عالیؔ کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ تقرر نامہ جلد ہی مل جائے گا اور وہ مل بھی گیا عہدہ غالباً اسسٹنٹ افسر کا تھا۔ مگر تنخواہ =/۱۸۰ روپے ماہانہ تھی۔ عام سرکاری اسسٹنٹ سے کسی قدر زیادہ۔ ادھر یہ تقرر نامہ ملا، ادھر عالیؔ کی سالی کا خط موصول ہوا جو خوش دامن صاحبہ کی طرف سے تھا تاثر یہ تھا کہ طیبہ بانو کی طبیعت خراب ہے۔ عالیؔ ملازمت پر حاضر ہونے کے بجائے بلند شہر روانہ ہو گئے یہاں ایک اور خاندانی قضیہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ طیبہ کے والد نے لوہارو جا کر دوسری شادی کر لی تھی۔ اور نو بیاہتا کو لے کر دہلی کے قریب فرید آباد چلے گئے تھے۔ جہاں انکے دوست اور پھوپھی زاد سید ہاشمی رہتے تھے۔ طیبہ بانو کی والدہ اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ بلند شہر ہی میں مقیم رہیں اور خاصی دل برداشتہ تھیں۔

عالیؔ بلند شہر پہنچ کر چند روز وہاں رہے۔ بیوی شدید طور پر علیل نہیں تھیں پہلا حمل تھا معمولی پیچیدگیاں پیدا ہو کر ختم ہو گئیں تھیں۔ ساس یا بیوی نے طلب بھی نہیں کیا تھا۔ معمول کے مطابق اطلاع دی گئی تھی، مگر یہ بیوی کی محبت میں ساعتوں میں پہنچ گئے تھے۔ بہر حال بلند شہر سے دہلی آ کر پھر تلاش معاش شروع کی۔

عالیؔ کے ایک عزیز (نواب زادہ خورشید علی خان بن نواب ذوالفقار علی خان) مالیر کوٹلہ جو ان کے بھانجے تھے، اتفاق سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ عالیؔ کی والدہ کو سلام کرنے کی غرض سے گھر آئے تو انھوں نے عالیؔ سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہیں؟ عالیؔ نے بتایا کہ تلاش معاش میں ہوں۔ اُنھوں نے کہا میرے ایک دوست مسٹر پی، این تھاپڑ مرکزی حکومت کے محکمہ اطلاعات میں جوائنٹ سیکریٹری ہیں۔ آپ ان سے مل لیجئے۔

عالیؔ نئی دہلی میں تھاپڑ صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت عالیؔ شیروانی میں ملبوس تھے کیوں کہ تھاپڑ صاحب سے مل کر انھیں جگر صاحب کے پاس جانا تھا اور پھر ایک مشاعرہ میں شرکت کرنی تھی (۳۲) تھاپڑ صاحب کے گھر پہنچے تو بتایا گیا کہ موصوف گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔ عالیؔ واپس ہو گئے راستے میں ایک مردِ معقول چہل قدمی کر رہے تھے۔ (شام کا وقت تھا اور جاڑے کا موسم تھا) اشارے سے پاس بلایا اور پوچھا" مسلمان لگتے ہیں" "جی ہاں مسلمان ہی ہوں" اور یہاں یوں

پھر رہے ہیں۔ دہلی میں ہر طرف فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ میں خیر اسی علاقے تک محدود اور یہاں سے واقف ہوں ۔آپ کو پرانی دہلی جانا ہے اور لباس سے بھی پہچانے جائیں گے۔ ذرا احتیاط کیجئے۔ پھر پوچھا" کیا کرتے ہیں؟" عالی نے بتایا" تلاشِ معاش میں ہوں۔ اسی سلسلے میں تھاپڑ صاحب سے ملنے ان کے گھر آیا تھا مگر وہ گھر پر موجود نہیں ہیں"۔ اب یہ صاحب بولے" تھاپڑ اسی طرح کے وعدے کرتا ہے۔ میرا نام محمد ایوب ہے میں ایک آئی، سی، ایس افسر اور وزارتِ تجارت میں ڈپٹی سیکریٹری ہوں۔ یہ بتایئے کہ آپ کے خیال میں پاکستان بن جائے گا؟" عالی نے کہا" مجھے یقین ہے کہ پاکستان بن جائے گا اور جس طرح فرقہ وارنہ فسادات ہو رہے ہیں۔ اس کا تو لازمی نتیجہ ملک کی تقسیم کی صورت میں نکلے گا"۔

محمد ایوب کہنے لگے" اگر پاکستان بنا تو اس کا مرکز لاہور، پشاور یا دلی ہوگا۔ اگر دلی ہوا تو خیر تم تو دلی کے رہنے والے ہی ہو۔ لیکن پشاور یا لاہور بنا تو؟" یہ بات نومبر ۱۹۴۶ء کی ہے۔

" میں پھر بھی پاکستان کی راہ لوں گا" عالی نے بڑے اعتماد سے کہا۔" اچھا تقسیم کی بات تو دور کی بات ہے فی الحال اٹلی کے شہر میلان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایک ٹریڈ آفس کھول رہی ہے۔ تمہارا تقرر وہاں اسسٹینٹ کے طور پر ہو سکتا ہے۔ تم میلان چلے جانا جب ملک تقسیم ہوگا تو ٹریڈ آفس بھی تقسیم ہو جائے گا۔ تم پاکستان کے لئے اپنی خدمات پیش کر دینا۔ غرض محمد ایوب صاحب نے دوسرے دن عالی صاحب کو دفتر طلب کر لیا۔ دوسرے دن عالی دفتر گئے تو ایوب صاحب نے بتایا کہ نواب زادہ لیاقت علی خان نے (جو اس وقت وزیر خزانہ تھے) تقررات پر سخت شرطیں لگا رکھی ہیں۔ اور ان کی منظوری کے بغیر چپراسی بھی مقرر نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کے پرائیوٹ سیکریٹری ممتاز حسن ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں۔ احسن تخلص کرتے ہیں تم کو بھی اس ناطے جانتے ہونگے۔ وہ اگر کوشش کر کے اجازت دلا دیں تو تمہارا تقرر ہو سکتا ہے۔ ممتاز حسن شاعر تھے مگر مشاعروں وغیرہ میں کم آتے اور کہتے بھی کم کم تھے۔ (وہ پاکستان میں بڑے بڑے مالیاتی عہدوں پر فائز رہے بڑے علم دوست تھے۔) بہر حال عالی ان کے پاس جا پہنچے ممتاز حسن بڑی محبت سے پیش آئے اور تقرر پر فوراً ہی آمادگی ظاہر کر دی اور کہا تم اپنا تقرر ہوا سمجھو۔ گھر جاؤ آرام سے بیٹھو ہم دفتری کارروائی کر کے تم کو تقرر نامہ بھجوا دیں گے۔"(۳۳) یکم فروری ۱۹۴۷ء کو وزارتِ تجارت میں بحیثیت اسسٹینٹ تقرر کئے جانے کا خط موصول ہوا۔ چند دن بعد ہی یعنی ۹ فروری ۱۹۴۷ء کو عالی کی بڑی صاحبزادی حمیرا پیدا ہوئیں۔ تین روز بعد ہی ۱۲ فروری ۱۹۴۷ء کو عالی نے اسسٹینٹ وزارتِ تجارت حکومت ہند کی حیثیت سے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور قائد اعظم نے سرکاری ملازمین سے اپیل کی کہ وہ عارضی یا مستقل طور پر پاکستان OPT کرلیں عالی نے مستقل OPT کیا اور اگست ۱۹۴۷ء کو ایک نوکر لے کر پاکستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ والدہ ابھی دہلی چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ بیگم اور بچی اور لوہارو کی اجازت اور الاؤنس کے بارے میں تشویش تھی علاوہ ازیں بہنیں چھوٹی تھیں اور یوں لوہارو کی تولائی اور فیروز پور جھرکہ کی امیری سے دامن چھڑا کر وہ ایک نئے ملک

اور نئے ماحول میں آ گئے۔ اس وقت پاکستان کی خدمت کا لوگوں میں بڑا جوش اور ولولہ تھا۔ لوگ جائیدادیں اور عمارتیں اور امارتوں پر لعنت بھیج بھیج کر پاکستان جا رہے تھے۔ عالی لوہارو سے روابط تو بھارت میں چھوڑ آئے مگر نوابی سے دامن نہ چھڑا سکے اور چھڑا بھی نہ سکتے تھے۔ نوابی دراصل ایک خاص زاویہ نگاہ اور طرز حیات کا نام ہے۔ اس طرز حیات کا عادی ہونے کے بعد اسے ترک کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وطن سے دوری کی اذیت سے صرف وہ ہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جنہیں کبھی اس سے واسطہ پڑا ہو۔ یہاں تو بزرگوں کی عظیم روایات کا پلندہ بھی شانوں پر رکھا تھا اور حکمرانی کا انداز بھی ذات کا حصہ بن چکا تھا۔ پاکستان آنا ان تمام روایات، اس سارے پندار اور ماضی کی اس شان و شوکت سے دست برداری تھی۔ نوکری بھی معمولی ہی تھی۔ بہرحال اب وہ اپنے نئے دیس میں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ (۳۴)

پاکستان میں آمد

جمیل الدین عالی ۱۱، اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ ٹرین میں اپنی سرکاری حیثیت سے زیادہ ایک کوپے فرسٹ کلاس بک کرا لیا تھا۔ ان کے ساتھ اہلیہ (طیبہ بانو برقع میں ملبوس) تھیں۔ پہلوٹی کی بیٹی حمیرا (تاریخ پیدائش ۹ فروری ۱۹۴۷ء) عمر تقریباً ۶ ماہ اور ایک لڑکا (نوکر) لاوارث جو دس بارہ سال کا تھا ساتھ لے لیا تھا۔ ملازم نے ان کے کوپے پر ہرے رنگ کا دوپٹہ لٹکا دیا تھا۔ جو بطور جھنڈے کے لہرا رہا تھا۔ یہ ٹرین دہلی سے فیروز پور، قصور (یہاں طیبہ کی بہن رہتی تھیں) سے ہوتی ہوئی ۱۳، اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچی۔

پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی اس ٹرین کا بڑا زبردست استقبال کیا گیا۔ ہر اسٹیشن پر کھانا ناشتہ، پھل، مٹھائیاں، دودھ سے بھری ہوئی بالٹیاں تھیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو فری دی جا رہی تھی۔
مسافر بھی بہت خوش تھے اور خدا کا شکر بجا لا رہے تھے۔ کہ اپنے آزاد ملک پاکستان پہنچ گئے۔

"ٹرین کے تمام مسافروں کو ٹرکوں کے ذریعہ کینٹ اسٹیشن پہنچایا گیا یہاں ہر فیملی کیلئے خیمے لگائے گئے تھے۔ جہاں عارضی قیام تھا۔ وہاں سے گورنمنٹ ملازمین کو کواٹرز میں بھیج دیا گیا۔ عالی کو بھی جیکب لائن جانا پڑا۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بارش کی وجہ سے عالی کا یہ کوارٹر بالکل خستہ حال ہو چکا ہے اور رہائش کے قابل نہیں ہے۔ (۱) دو تین دن کے بعد ہی عالی اپنی سینیا لائن کے کوارٹر میں چلے گئے جو بیرک ۲۳ کوارٹر نمبر ایک تھا۔ اس بیرک میں دیواریں اٹھا کر چار کوارٹر بنائے گئے۔"

"پاکستان بننے کے بعد یہ آخری ٹرین تھی جو دہلی سے بخیریت کراچی پہنچی اس کے بعد تو مسلمانوں کا قتل عام سرکاری طور پر بھی شروع ہو گیا تھا۔ پوری کی پوری ٹرین کو تباہ کر دیا جاتا تھا۔ پاکستان بننے (۱۴، اگست ۱۹۴۷ء) کے بعد کوئی ٹرین بخیریت پاکستان نہ پہنچ پا رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد دو ڈبوں پر مشتمل ایک ٹرین لاہور کے لئے روانہ ہوئی اس میں پرانا قلعہ دہلی میں مقیم مسلمان پناہ گزین میں سے چند افراد معہ فیملی سوار تھے۔

ان میں طیبہ بانو کی دادی جان کی محل سرا (گلی قاسم جان املی والا پھاٹک) کے داروغہ (کیشئر) امین الدین بھی فیملی

کے ساتھ ان ڈبوں میں سوار تھے۔ وہ دلی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ کہتے تھے "تم سب چلے جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ جاؤ۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" مگر ان کے اکلوتے بیٹے ظہور الدین نے یہ گوارا نہیں کیا کہ والد کو تنہا چھوڑ آئیں۔ظہور الدین گورنمنٹ ملازم تھے انھوں نے مستقل طور پر پاکستان OPT لکھ کر دے دیا تھا اس لئے ان کا پاکستان آنا ضروری تھا۔ان ڈبوں میں گنجائش سے زیادہ افراد بھر گئے تھے۔سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔دلی سے یہ روانہ ہوئے تو کھڑکیاں بھی بند کردی گئیں تھیں کہ حملہ نہ ہو جائے۔اچانک امین الدین صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ خاموش ہو گئے۔دوسرے مسافروں نے کہا ان کا انتقال ہو گیا ہے انھیں ڈبے سے اتار دیں۔لیکن ان کے بیٹے کا کہنا تھا کہ انھیں صدمے کی وجہ سے سکتہ ہو گیا ہے بہرحال وہ انھیں پاکستان لانا چاہتے تھے۔گارڈ نے کہا انھیں اتار دیں یا پوری فیملی اتر جائے (جس میں ظہور الدین کے سالے۔سید ساجد علی معہ بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ظہور الدین کے چچا زاد بھائی کی فیملی۔اور ظہور الدین صاحب کی والدہ بیوی اور تین بچے شامل تھے۔) مجبوراً ہندوستان ہی کی سرزمین پر نامعلوم جگہ پر ایک درخت کے نیچے امین الدین صاحب کو لٹا کر چادر اڑھا دی گئی۔حسرت بھری نگاہوں اور شکستہ دلی کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر یہ کارواں پاکستان کی طرف روانہ ہو گیا۔(۳۵)

ظہور الدین کا آفس لاہور میں تھا۔وہ وہیں رہے مگر اکثر کہا کرتے تھے" کہ اگر ابا پاکستان آجاتے تو شاید ٹھیک ہو جاتے اور اگر انتقال ہو بھی گیا تھا تو پاکستان میں دفنا دیتے۔خیر یوں تو پاکستان کے لئے ہر خاندان نے کچھ نہ کچھ قربانیاں دی ہیں لیکن سب کی نوعیت جدا جدا ہے"

عالی کی والدہ اور بہنوں کی پاکستان آمد:

عالی کی سگی چھوٹی بہن طاہرہ بانو حجاب نے بتایا کہ "جب بھائی (عالی) بھابھی صاحبہ معہ اپنی بیٹی (جو اس وقت چھ ماہ کی تھی) پاکستان آنے کی تیاری کر رہے تھے تو ہم سے بھی چلنے کے لئے کہا لیکن امی جان نے کہا تمہاری خواہش ہے تو تم پاکستان چلے جاؤ میں اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ یہیں رہونگی۔لوہارو سے آمدنی بھی آجاتی ہے اور پھر اپنا گھر بھی ہے۔تم وہاں نئی جگہ جاؤ گے معلوم نہیں کیا حالات ہوں پھر بھی جا کر دیکھو ہم آتے جاتے رہیں گے۔اس وقت ہندوستان میں بہت سے خاندانوں کا یہی موقف تھا۔"(۳۶)

بہرحال عالی کے آنے کے بعد دلی کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے۔عالی کے ایک ماموں سید حمید الدین اپنے رشتے دار کے بچوں کی شادی کے لئے حیدر آباد دکن سے دلی آئے تھے۔بستی نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر ان سب کو قتل کر دیا گیا۔(کہا جاتا ہے کہ ایک نوجوان لڑکی بچی تھی جسے اٹھا لیا گیا) فسادات کے دوران سب محلے بند تھے۔عالی کے ایک بھتیجے میجر اسد الدین فوج میں تھے اچانک وہ ٹرک لے کر آ گئے انھوں نے امی جان سے کہا آپ فوراً بچیوں کو لے کر پاکستان چلی جایئے۔یہاں نہ جانیں محفوظ ہیں اور نہ عزت، پہلے تو امی سوچنے لگیں۔لیکن پھر انھوں نے ہم بہنوں کی وجہ سے

پاکستان آنے کا ارادہ کرلیا۔ اس وقت صرف زیور (۳۷) اور چند کپڑے لے کر ہم میجر اسد الدین احمد خان کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر ہوائی اڈے پہنچے۔ جہاز میں بیٹھ تو گئے لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ عالی بھائی کراچی میں کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ تمام راستے ہم تینوں روتے رہے اور دعائیں پڑھتے رہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھائی کے پاس پہنچادے۔ ورنہ ہم تینوں کہاں جائینگے۔ جیسے ہی ہم کراچی ائیر پورٹ پر پہنچے اور باہر آئے کوئی جاننے والا نظر نہ آیا۔ بہرحال جان میں جان آئی اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ائیر پورٹ پر رکشہ ٹیکسی نہیں تھی بلکہ لائن سے اونٹ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک اونٹ گاڑی میں سامان رکھ کر ڈرگ روڈ روانہ ہوئے۔ عالی بھائی ہم لوگوں کو تلاش کرتے ہوئے بڑی بڑی راہوں پر میلوں پیدل چلا کرتے تھے۔ ہماری اونٹ گاڑی ڈرگ روڈ سے گزر رہی تھی یہ سامنے سے پیدل آرہے تھے کہ آمنا سامنا ہوگیا۔ اس وقت کے تاثرات ناقابل بیان ہیں۔ پاکستان آنے کی خوشی اور جمیل بھائی کا مل جانا جس سے دلی سکون ہوا۔ لیکن دلی کا بھرا پرا گھر چھوڑ دینے کا ملال بھی تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہم لوگ ایبی سینا لائن پہنچے۔ طیبہ بھابھی ہم سب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں کیوں کہ جمیل بھائی روزانہ ائیر پورٹ جاتے تھے کہ نہ جانے ہم لوگ کب آجائیں۔ بھائی جمیل کے پاس کوارٹر چھوٹا تھا مگر سب کے ساتھ مل بیٹھنے سے جو خوشی ہوئی اسکا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا اور نہ ہی الفاظ میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ کچھ اور لوگ بھی ہمارے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ تو دور پرے کے عزیز تھے۔ اور کچھ بھائی کے دوست تھے۔ (۳۸) یہ ایسا وقت تھا کہ ہر شخص ایک دوسرے کی مدد کرنے کو تیار تھا اور بھائی کی طبعیت میں تو یہ عنصر شامل ہے کہ وہ کبھی کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔ گھر میں کچھ سامان بھی نہ تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور بیڈ لے لیا تھا مگر بھائی جمیل سب کے ساتھ زمین پر سوتے تھے۔ وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔ خدا کا شکر ہے بھائی نے ہمیں پڑھایا۔ شادیاں کیں اور ہمیں باپ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی۔ آج تک بھائی اور بھابی صاحبہ جب آتے ہیں کچھ نہ کچھ لے کر آتے ہیں۔ نادرہ (چھوٹی بہن) لاہور میں رہتی ہیں، آج کل امریکہ گئی ہوئی ہیں۔

"میں (طاہرہ بانو حجاب) اسلام آباد میں رہتی ہوں۔ پہلے میں بھی پڑھاتی تھی۔ اب ریٹائر ہوگئی ہوں لیکن نابینا افراد کے لئے کیسٹ تیار کرارہی ہوں جو ان کا سلیبس ہے۔ یہ ہر مضمون پر مشتمل ہوتے ہیں ان طلبہ کے ساتھ کام کرنے کے اوقات میں بڑا سکون ملتا ہے۔"

جمیل الدین عالی کے بچپن کے بارے میں طاہرہ بانو نے بتایا کہ "بچپن سے بھائی اپنی بات بزور منواتے ہیں۔ امی بھی ان کی کسی بات کو نہیں ٹالتی تھیں۔ بعض اوقات ہم بہنیں برا بھی مناتی تھیں کہ امی بھائی کی ہر بات کیوں مان لیتی ہیں؟ امی ہمیں سمجھاتی تھیں۔ کہتیں دیکھو تمہارا بڑا بھائی ہے اس کی بات مان لیا کرو۔ ہم بھی امی کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ امی اکثر بھائی کا صدقہ دیا کرتی تھیں۔ بکرا کیا جاتا تھا۔ ویسے بھی امی بھائی کو بہت چاہتی تھیں۔ ہمارے یہی ایک بھائی ہیں۔ جمال الدین احمد خان کا انتقال بہت کم عمری میں ہوگیا تھا۔" (۳۹)

"جمیل بھائی بڑوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ان کے دوست بھی پڑھنے لکھنے والے تھے مگر بھائی کی یہ عادت تھی

کہ اسکول کا کام نہیں کرتے تھے ۔کورس کے علاوہ کتابیں بہت پڑھتے تھے ۔میٹرک ،انٹر، بی اے،تک کورس کی کتابوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے ۔ بی اے تک تو شاعری کے میدان میں بہت دور تک پہنچ چکے تھے ۔ پھر سی، ایس، ایس کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گئے ۔ لاء کیا اب ماشاءاللہ شاعری اور نثر نگاری میں جواب نہیں ۔ دن رات محنت سے اب ان کی صحت خراب ہو گئی ہے مگر اب بھی ہر وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں ۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری عمریں بھی انہیں لگا دے ۔آمین ۔(۴۰)

ملازمت کی ایک اور کوشش :

اس میں بھی وہ ناکام رہے ۔تفصیل اس کی یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں (O.T.S ARMY OFFICERS TRANING SCHOOL) کا کریش پروگرام تھا ۔ یہ فوج میں فوری بھرتی اور تربیت کے لئے تھا۔ عالی تحریری ٹیسٹ میں پاس ہو گئے ۔ یہ .Q.I وغیرہ کا ٹیسٹ تھا مگر طبی امتحان میں ناکام ہو گئے ۔ ان کا سینہ مطلوبہ معیار کے مطابق چوڑا نہ تھا۔ انھیں چوڑائی ۴۲، ۴۶ انچ درکار ہوتی ہے ۔ بہر حال ان کو ایک موقع اور دیا گیا۔ اب عالی نے مکھن کھانے دودھ پینے اور ورزش کرنے کو اپنا معمول بنایا۔(۴۱) کچھ ہی عرصے میں سینہ معیار کے مطابق ہو گیا۔مگر اب کی بار (K.K) پاس نہ کر سکے ۔یعنی دونوں پاؤں ملا کر کھڑے ہوں تو گھٹنوں کے درمیان خلا نہ رہے ۔اور یوں فوجی ملازمت کا یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ بڑے دل شکستہ ہوئے !

طیبہ بانو عالی کی ہمت بڑھاتی رہتیں ۔ ناکامی پر بد دل نہ ہونے اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھنے کی تلقین کرتی رہتیں ۔ان دنوں ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر کو ماہر (Expert) سمجھا جاتا تھا۔ اسے دوسرے کارکنوں کے مقابلے میں ۴۰ روپے زیادہ ملتے تھے مگر اس کی اہمیت بہت تھی ۔ ریڈیو پر مشاعرے، مذاکرے ہوتے ،شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا رہتا اور ریڈیو پاکستان کا ماحول ادبی بن گیا تھا۔

یہاں ڈائریکٹر جنرل ذوالفقار علی بخاری تھے اور چیئرمین شیخ محمد اکرام (مشہور مصنف) تھے ۔ عالی، بخاری صاحب سے مشاعروں میں اتا کے ٹکراؤ سے کسی قدر رکبیدہ خاطر رہتے تھے ۔ غالباً ان پر دہلی میں انٹرویو میں بڑے بھائی سے مسترد کئے جانے کا اثر باقی ہوگا۔ بہرحال اس انٹرویو میں بھی رہ گئے ۔ بخاری صاحب نے کہا آپ اس جگہ کیسے کام کریں گے ۔آپ کا مزاج بڑا تیکھا ہے۔ عالی نے کہا۔ شاید اب نہیں رہے گا مجھے نوکری کرنے کا ڈھنگ آ گیا ہے ۔مگر پھر بھی تقرر نہ ہو سکا۔ بخاری صاحب نے خود عالی سے کہا میرے اور تمہارے درمیان چلتی رہتی ہے ۔ یہ فضا افسری ماتحتی کیلئے مناسب نہیں ہے ۔ لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ جس شخص کو لیا گیا ہے ۔ وہ میرے بڑے اچھے دوست شاہ لگیر کا بیٹا ہے ۔(وہ لمبے شاہ کہلاتے تھے لندن چلے گئے وہیں انتقال کیا)(۴۱) بہرحال ریڈیو کے لئے دوسری کوشش بھی رائیگاں گئی۔ عالی کا بیان ہے کہ وہ زمانہ بڑی تنگی کا تھا۔ تنخواہ معمولی تھی کل ۱۳۸ روپے ماہوار ۔۴۸، ۴۷ء میں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا

تھا۔خود ان کے گھر تیس چالیس آدمیوں کا قیام تھا۔رشتے دار تھے۔کچھ دوست آشنا۔افراتفری میں گھر سرائے کا نقشہ پیش کرتا تھا۔مگر یہ ہجوم ہجرت زدگان بڑی بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان پہنچا تھا، چونکہ تمام افراد کھانا عالی کے گھر کھاتے تھے لہذا یہ والدہ کے بچے کھچے زیورات فروخت کر کے روپیہ حاصل کرتے رہے۔کرار نوری اس زمانے میں روزنامہ "مسلمان" میں کام کیا کرتے تھے۔عالی بھی اس سے وابستہ ہوگئے۔رات ۸ بجے سے رات ۱۲ بجے تک کام کیا کرتے تھے جس کا معاوضہ پچاس روپے ماہانہ مل جاتا مگر وہ تھک جاتے تھے۔یہ نوکری کوئی تین مہینے چلی۔

۱۹۴۹ء میں سی۔ایس۔ایس کا پہلا امتحان ہوا۔نتیجہ آیا تو عالی کے بہت سے دوستوں کے نام شامل تھے اب عالی کو بھی سی۔ایس۔ایس کے امتحان میں بیٹھنے کا خیال ہوا۔(۴۳)

جب اُنھوں نے دیکھا کہ بہت سے نااہل لوگوں کے نام بھی فہرست میں شامل ہیں۔تو عالی نے سوچا کہ میں یہ امتحان کیوں پاس نہیں کر سکتا مگر ان کیلئے مسئلہ یہ آن پڑا کہ فیس داخلہ ۵۰ روپے تھی عالی کے پاس اس وقت اتنا انتظام بھی نہ تھا۔کبھی PECHS میں ممبری فیس پچاس روپے جمع کرائی تھی ،وہی نکلوائی اور داخلہ فیس جمع کرادی۔تیاری کے لئے نہ چھٹی ملی نہ کتابیں پھر بھی امتحان دیا۔مگر جب نتیجہ آیا تو اردو کے پرچے میں صفر آیا۔اس زمانے میں دستور تھا کہ اگر ۲۵ فیصد سے کم نمبر آئیں تو صفر شمار ہوتا تھا۔عالی بدخط تھے اور اب بھی ہیں۔شاید اردو نثر نگاری میں بدخطی اپنا رنگ دکھا گئی اور فیل ہوگئے۔دوسرے سال پھر فارم داخل کیا۔دفتر کے ساتھی طنز کرتے تھے "اب یہ افسر بنیں گے" کسی طرف سے پھبتی کسی جاتی کہ فیل ہوگئے مگر ہمت نہ ہاری بہرحال تیاری کر کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب ہوگئے۔اب مرحلہ انٹرویو کا آیا۔

انٹرویو کمیٹی میں میاں افضل حسین چیئرمین تھے۔حسن شہید سہروردی اور دوسرے ممبران تھے۔عالی انٹرویو میں گئے تو اپنے دوست ایم۔ایچ عسکری سے مانگے کا سلکن سوٹ پہن کر گئے۔خوش شکل تو تھے ہی خوش لباسی نے چار چاند لگا دیئے لیکن انٹرویو بورڈ نے نروس کر دیا۔ان کے خلاف کمرۂ امتحان میں پنکھے نہ ہونے کی شکایت کرنے والوں کی "لیڈری" اور نگران سے بدتمیزی کرنے کی شکایت بھی کی گئی تھی جو ان کے امتحانی رزلٹ کے ساتھ منسلک تھی۔(۴۴)

انٹرویو بورڈ کے ایک رکن نے کہا" آپ امتحان میں کامیاب تو ہوگئے ہیں۔مگر قوابی کی بو باس ابھی گئی نہیں" اشارہ شاندار سوٹ کی طرف تھا۔دوسرے صاحب نے نگراں سے بدتمیزی کی وضاحت چاہی۔عالی نے کہا کہ امتحان ایس۔ایم لاء کالج میں منعقد ہو رہا تھا۔گرمی کے دن تھے کھڑکیاں پہلے ہی بند تھیں۔نگران نے دروازے بھی بند کرا دیئے۔ہم سب نے اس حبس بے جا پر احتجاج کیا میں نے ذرا ونگ طریقے سے اور بس۔اب دیگر افراد نے ان کے بقول "اونگے بونگے" سوالات کرنا شروع کر دیئے۔" تم اتنے دن نان گزیٹڈ رہے۔تم اب افسر کیسے بن سکتے ہو "عالی نے کہا" معاف کیجئے گا میں بدخط ہوں۔اس لئے مجھے نمبر بھی کم ملتے ہیں۔یقیناً میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوتا رہا ہوں مگر میری معلومات اچھی ہیں اور مطالعہ وسیع ہے۔تحریری امتحان میں بڑے بڑے فیل ہوگئے ہیں مجھ سے بات چیت کئے بغیر اور اس طرح مجھے

یوں فیل یا مسترد کر دینا مناسب نہیں آخر آپ نے کچھ دیکھنے سمجھنے کو بلایا ہے۔ ایک امیدوار کے نتیجے میں اس طرح کردار کشی نہ کیجئے۔ آپ لوگ مجھ سے سوالات کیجئے میں جواب دونگا"۔ انہوں نے کہا" جو کچھ آپ کو کہنا ہے خود کہہ لیجئے اور اپنا فرسٹریشن دور کر لیجئے۔ ہمیں آپ سے کچھ نہیں پوچھنا" عالی مسترد ہونے کے خوف سے اپنے حق میں طرح طرح کے دلائل دیتے رہے۔ انٹرویو کا وقت ختم ہوا تو انہیں مطلع کیا گیا کہ وہ انٹرویو میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھیں البتہ پوزیشن کیا رہتی ہے۔ اس کا تعین تو بعد میں ہی ہوگا۔

اب عالی کو اندازہ ہوا کہ شاید بورڈ کے ممبران کا یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے کہ امیدوار کو مایوس بھی کرتے ہیں اور گرماتے بھی ہیں۔ یوں اس کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ عالی بہر حال انٹرویو میں کامیاب قرار پائے۔ (۴۵)

اس انٹرویو کے بعد C.S.S میں کامیابی ہوگئی۔ اور محکمہ انکم ٹیکس میں انکم ٹیکس آفیسر تعینات کیے گئے۔ اپنی تعیناتی کے فوراً بعد انھوں نے انکم ٹیکس آفیسرز ایسوسی ایشن بنائی۔ ان کو اس کا معتمد منتخب کر لیا گیا۔ سرکاری ملازمین پر ٹریڈ یونین سازی کی پابندی تھی، اس لئے عالی نے اسے ایسوسی ایشن کا نام دیا۔ اور انکم ٹیکس کے افسران اور ملازمین کی بہبود کے کام کرنا شروع کر دیئے۔

اس زمانے میں گارڈن روڈ پر سرکاری ملازمین کے لئے مکانات تعمیر ہو رہے تھے۔ عالی نے کوشش کر کے اس میں آٹھ کوارٹر انکم ٹیکس کے محکمے والوں کے لئے مخصوص کرا لئے۔ اور یوں یہ روایت پڑی کہ سرکاری ملازمین اپنی ایسوسی ایشن کے ذریعہ کم قیمت پر مکانات حاصل کر سکیں۔ یہ چھوٹی سی بستی بڑھتے بڑھتے کالونی ہوگئی جس میں انکم ٹیکس کے ملازمین کے لئے جگہ مخصوص ہے۔ (۴۶)

جمیل الدین عالی یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ڈیپوٹیشن پر ایوانِ صدر آ گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب جمیل الدین عالی رائٹرز گلڈ اور انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستگی میں مشہور ہو چکے تھے۔ گلڈ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو قائم ہوا تھا۔ (۴۷)

"ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں ادیبوں کی ویلفئیر کی بات اٹھانے کے لئے قرۃ العین حیدر، جمیل الدین عالی، غلام عباس، ابن الحسن، ابن سعید اور رعباسی نے مل کر یہ طے کیا کہ جب مارشل لاء حکومت میں ہر شعبہ زندگی میں فلاح و بہبود کے کام کئے جا رہے ہیں تو ہمیں ایک وفد کی صورت میں قدرت اللہ شہاب سے ملنا چاہئے۔ دیکھیں وہ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ وفد جب قدرت اللہ شہاب کے پاس پہنچا اور انھیں بتایا کہ اس سلسلے میں آپ سے مشورہ لینے آئے ہیں اور بتایا کہ مولوی عبدالحق بھی اس سے متفق ہیں۔ قدرت اللہ شہاب نے کہا میں بھی فوجی حکمرانوں سے اسی قدر واقف ہوں جتنے آپ لوگ ہیں پتا نہیں کب کوئی فوجی حکم ادب و ادیب کی آزادی کو سنسر شپ کی زنجیروں میں جکڑ دے، مگر شہاب صاحب کا خیال تھا کہ ادیبوں کو منظم ہونا چاہئے تاکہ آڑے وقت میں موثر دفاع کر سکیں۔

یہ بات طے پائی کہ پہلے پاکستان کے ادیبوں کا کنونشن بلایا جائے چند روز بعد ہی یہ گروپ دوبارہ شہاب صاحب

کے پاس آیا اور ایک اعلان کا مسودہ انھیں دکھایا۔ یہ اعلان ۴، دسمبر ۱۹۵۸ء کو آٹھ کنو ینز ز کے دستخطوں سے جاری کیا گیا۔ اس پر (۱) قدرت اللہ شہاب (۲) ابن الحسن (۳) ابنِ سعید (۴) جمیل الدین عالی (۵) ضمیر الدین احمد (۶) عباس احمد عباسی (۷) غلام عباس اور (۸) قرۃ العین حیدر کے دستخط ثبت تھے۔

۴، دسمبر ۱۹۵۸ء کے اس اعلان کے بعد شاہد احمد دہلوی کو کنونشن کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر بنا دیا گیا۔ جمیل الدین عالی، عباس احمد عباسی اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ مصروف کار ہو گئے۔ عالی نے دن رات محنت کر کے بہترین منتظم ہونے کا ثبوت دیا۔ تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ اور ۲۹، ۳۰، ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو کل پاکستان رائٹرز کنونشن کراچی میں منعقد ہوا۔ اس کی تفصیلات اپنے مقام پر آئیں گے۔ (۴۸)

انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں قائم کی گئی تھی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق اسکے روح رواں تھے۔ ہندوستان میں وہ اردو کے فروغ اور اسکی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ پاکستان بننے کے بعد مولوی عبدالحق ۱۹۴۸ء میں کراچی آ گئے۔ اب ان کی جدو جہد کا مرکزی نقطہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دلوانا تھا۔ وہ اس کے لئے ہر سطح پر کوشاں تھے۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ (۴۹) مولوی صاحب نے کنونشن کی صدارت کرتے ہوئے صدر ایوب کو خطاب کر کے اردو کے نفاذ پر زور دیا۔ مولوی صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۶۲ء میں انجمن کا نیا دستور بنا اور سابق گورنر اور وفاقی وزیر اختر حسین کو اس کا صدر اور جمیل الدین عالی کو معتمد اعزازی نامزد کر دیا گیا۔ اس وقت جمیل الدین عالی ڈیپوٹیشن پر ایوانِ صدر میں تعینات تھے۔ یہ عالی کے اختیارات اور اعلیٰ سطح پر تعلقات کا سنہرا موقع تھا۔ لہٰذا عالی نے انجمن کیلئے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے وہ بنیادی کام جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے شروع کئے تھے۔ عالی نے بڑی محنت لگن اور جانفشانی واعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہا اور کامیاب رہے۔

آج اردو آرٹس و اردو سائنس کالج کراچی کے معیاری تعلیمی اداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق انھیں یونیورسٹی دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر یہ کام ان کی زندگی میں ممکن نہ ہو سکا۔ آج کل یہ ادارے وفاقی حکومت کے زیر انتظام کام کر رہے ہیں انہیں یونیورسٹی بنانے کی اصولی منظوری عالی کے دور معتمدی میں ہی ہو گئی تھی۔ (۵۰) مگر بعض سیاسی مخالفوں اور بیوروکریسی نے یونیورسٹی نہ بننے دی انھوں نے اختر حسین صاحب کی سرپرستی میں گلشن اقبال کراچی کے علاقے میں اردو سائنس کالج سنگ بنیاد مئی ۱۹۶۴ء میں صدر ایوب سے رکھوالیا اور اعلان کرا دیا۔ یہ اقامتی اردو یونیورسٹی کی ابتداء ہے۔

دیگر سماجی خدمات:

ایوانِ صدر میں ملازمت کے دوران عالی کو کابینہ ڈویژن اور اسٹیبلیشمنٹ ڈویژن جانے کے مواقع ملتے رہے۔ اور وہ اعلیٰ سرکاری ملازمین میں متعارف ہو گئے۔ پھر رفاہِ عامہ کے کام کرنے کا جذبہ عالی کی فطرت میں موجود ہے، رنگ

لایا۔ اس سے پہلے وہ محکمہ انکم ٹیکس کی بہبود کے کاموں میں لگے رہے ۱۹۵۶ء میں محکمہ کے ملازمین کے مطالبات کو اعلیٰ ترین سطح تک پہنچانے کے لئے عالی نے صدر پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا کو ایسوسی ایشن کے سالانہ عشائیہ پر مدعو کیا تھا۔ اس کے علاوہ قمر الاسلام صاحب سے رابطہ کیا۔ یہ صاحب سی۔ ایس۔ پی آفسر تھے۔ اور کسی زمانے میں انکم ٹیکس میں رہ چکے تھے۔ اُنھوں نے مراعات کی فراہمی میں خاصا تعاون کیا۔ اور یوں ایسوسی ایشن کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ مگر ۱۹۵۹ء میں عالی کے ڈیپوٹیشن پر چلے جانے کے بعد ان سرگرمیوں میں روز بروز کمی ہوتی گئی۔

عالی کی سماجی خدمات کا ایک پہلو قیام پاکستان کے فوراً بعد P.E.C.H.S سوسائٹی کے قیام میں ان کی فعال شرکت ہے۔ ۱۹۵۶ء میں P.E.C.H.S کی رکنیت کا احیاء کیا۔ ۱۹۵۶ء میں اس کی انتظامیہ کا انتخاب لڑا اس وقت سوسائٹی کے ارکان کی تعداد سات ہزار کے قریب تھی مکانات زیرِ تعمیر تھے اور تیزی سے آبادکاری ہو رہی تھی۔ مگر پلاٹ ملنے میں اعلیٰ افسران کی سیاست سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایسے میں بار بار انتخابات کی عیاشی سوسائٹی برداشت نہ کر سکی تھی۔ جب عالی نے انتخاب لڑا تو چند ووٹوں سے ہار گئے۔ شکست کا سبب ان کے خیال میں دھاندلی تھی۔ اس لئے عدالتی عذرداری کی۔ اسی دوران ایک ممبر کے تبادلے کی وجہ سے منتظمہ میں ایک نشست خالی ہوگئی اور عالی چونکہ ہارنے والوں میں سرِ فہرست تھے۔ اس لئے حسبِ ضابطہ ان کو لے لیا گیا۔

اب عالی نے سوسائٹی میں آبادکاری کے سلسلے میں جدوجہد شروع کی زمینوں کا الاٹمنٹ اعلیٰ عہدے داروں نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور یوں اندھے کو ریوڑیاں بانٹنے کا سلسلہ جاری تھا۔ عالی نے ادنیٰ عہدیداروں اور معمولی کارکنوں کیلئے پلاٹ کے اجرا کے لئے جدوجہد کی۔ اس طرح درجنوں چھوٹے پلاٹ چھوٹے ملازمین کو الاٹ کئے گئے۔ اسی سوسائٹی میں عالی اور قمر الاسلام کو بھی ان کے ملازماتی استحقاق کی بنیاد پر پلاٹ ملے۔ انہوں نے اپنے محکمے انکم ٹیکس کے کئی افسران کو بھی کمیٹی سے پلاٹ الاٹ کرائے۔

۱۹۵۸ء میں سوسائٹی کے نئے انتخاب ہوئے اس وقت تک عالی سوسائٹی کی بہبود کا بہت کچھ کام کر چکے تھے اور ارکان میں خاصے مقبول تھے۔ اسلئے عالی نے خود اپنا پینل کھڑا کیا اور یہی پینل جیتا۔ اس وقت تک سوسائٹی کی سطح پر صوبائی عصبیتوں کی کارفرمائی نظر آنے لگی تھی۔ مگر عالی کے پینل میں ہر صوبے اور قومیت کے امیدوار موجود تھے اور یہی پینل سب کیلئے قابلِ قبول ہوا۔ جب یہ پینل جیتا تو عالی نے دوسرے دن نئی انتظامیہ کے اعزاز میں کراچی کلب میں عشائیہ رکھا۔ مگر ایک شام پہلے ۷، اکتوبر کو مارشل لاء لگ گیا۔ یہ ایوب خان والا اور ملک کا پہلا مارشل لاء تھا۔ اس کی دہشت بہت پھیلی۔ چنانچہ لوگوں نے چاہا کہ عشائیہ منسوخ کر دیا جائے۔ عالی کا موقف تھا کہ عشائیہ کیوں منسوخ ہو۔ نہ ہم نے چوری کی ہے اور نہ ڈاکہ ڈالا نہ کوئی غیر قانونی کام کیا۔ اس لئے کراچی کلب میں عشائیہ ہوا۔ چنانچہ ۸، اکتوبر ۱۹۵۸ء کو یہ واحد عشائیہ تھا جو کسی پاکستانی ہوٹل یا کلب میں دیا گیا۔ (۵۱)

ابھی عالی محکمہ انکم ٹیکس میں تھے۔ کہ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں ان کی خدمات ایوانِ صدر میں مستعار لے لی گئیں۔ صدر مملکت اس وقت ایوب خان تھے قدرت اللہ شہاب اور عالی کے درمیان خاصے مراسم پہلے سے تھے۔ اس لئے ایک انٹرویو کمیٹی کے ذریعہ شہاب نے عالی کو بھی ایوانِ صدر میں گھسیٹ لیا۔ اور یوں یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء کو عالی ڈیپوٹیشن پر انکم ٹیکس سے ایوانِ صدر پہنچ گئے۔ ایوانِ صدر تک رسائی جمیل الدین عالی کے لئے کئی حیثیتوں سے بڑی مفید رہی صدارت یوں بھی کسی ملک کا اعلیٰ ترین انتظامی اور علامتی منصب ہے۔ لیکن ایوب خان کی صدارت محض دکھانے کی صدارت نہ تھی۔ (۵۲) یہ الگ بات کہ انہیں وہاں نہ کوئی مالی فائدہ ہوا نہ اپنے اسکیل سے بڑی کوئی منصبی ترقی ملی اور وہاں سے رخصت ہونے کے بعد انکے حاسدوں نے ان کی زندگی عذاب کر دی۔ ہاں تجربہ بہت ملا۔

ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے اور اقتدار کے سارے سوتے ان کے ذات میں مجتمع ہو گئے تھے۔ ایسے بااختیار اور مقتدر صدر کا قرب کارکشائی اور کاربرآری کے لئے انتہائی مفید ہو سکتا ہے۔ یہ جہاں عالی کے لئے رفعتوں تک رسائی کی نوید تھی تو دوسری طرف خلق خدا کی کاربراری کیلئے بھی راہ کشائی کا سبب تھی۔ عالی خود حکمرانی کے آداب سے آگاہ اور اس کی خوبو کے حامل تھے۔ اس لئے اقتدار اعلیٰ سے قریب ترین یہ مقام ان کے لئے بہت سازگار اور من پسند رہا۔

عالی کو اس جگہ پہنچنے میں فوائد کیا حاصل ہوئے اور کیا نقصانات پہنچے اس کا اندازہ تو بعد میں ہی لگایا جا سکے گا۔ لیکن یہاں پہنچ کر عالی نے اپنی فطری نفع رسانی کو آزادانہ کام میں لانا شروع کیا ابھی تک وہ اپنے محکمے کے ملازمین کے فلاح و بہبود کے کاموں میں لگے رہے تھے۔ انکم ٹیکس سے ایوانِ صدر تک پہنچ کر انہیں ادیبوں کے مسائل اور انکی فلاح کا بھی خیال آیا اور وہ بھی مارشل لاء کے عہد میں۔ انھوں نے ایک سال پہلے ہی ادیبوں کی ایک انجمن بنانے کا ارادہ کیا تھا اور اس کیلئے قدرت اللہ شہاب کی مدد چاہی۔ قدرت اللہ شہاب کا بیان ہے کہ "ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ کہ اچانک قرۃ العین حیدر، جمیل الدین عالی، غلام عباس، ابنِ سعید اور عباس احمد عباسی تشریف لے آئے باتوں باتوں میں انھوں نے کہا آج کل ہر محفل میں گفتگو کا رخ مارشل لاء کی طرف مڑ جاتا ہے اور ادیبوں میں بھی اس موضوع پر مختلف النوع خیال آرائیاں ہوتی ہیں۔ کچھ ترقی پسند ادیبوں کو خوف بھی ہے۔ غیر سیاسی ادیبوں کے مسائل میں خصوصاً ناشرین سے شکایات ہیں چند دوستوں کی رائے ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں ادیبوں کی فلاح و بہبود کیلئے نہ کسی نے سوچا نہ کبھی کچھ کیا ہے۔ آج کل جب کہ یہ فوجی حکومت زندگی کے ہر شعبہ میں تطہیر و تعمیر و ترقی و بہبود کے نت نئے اعلان کرتی جا رہی ہے۔ تو موقع ہے کہ اس بات کو آزما دیکھیں کہ حکومت کے بلند و بانگ دعووں میں ادیبوں کی ویلفیئر کے لئے بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے یا نہیں؟ انھوں نے مزید بتایا کہ بابائے اردو کی موجودگی میں بھی یہ تذکرہ آ چکا ہے اور وہ بھی اس قسم کی کوشش کر دیکھنے کے حق میں مائل نظر آتے تھے۔ جمیل الدین عالی نے کہا کہ " آج ہم لوگ یہاں اس سلسلے میں آپ کے ساتھ مشورہ کرنے آئے ہیں۔ (۵۳)

بہرحال کسی نہ کسی طرح قدرت اللہ شہاب کو تیار کرلیا گیا اور ادیبوں کا ملک گیر کنونشن بلایا گیا اور دو روزہ محنت کے بعد انکی ایک انجمن پاکستان رائٹرز گلڈ کے نام سے تشکیل دی گئی۔ اس پر ابتدائی دستخط کنندگان میں (۱) ابن الحسن (۲) ابن سعید (مرزا حسن عسکری) (۳) جمیل الدین عالی (۴) ضمیر الدین احمد (۵) عباس احمد عباسی (۶) غلام عباس (۷) قدرت اللہ شہاب (۸) قرۃ العین حیدر کے تھے (۵۴) کنونشن میں چاروں صوبوں سے سب پاکستانی زبانوں کے دوسو بارہ ادیب شریک ہوئے تمام قراردادیں اور مطالبے بڑے سخت مباحث کے بعد منظور ہو گئے۔ تمام کاروائی ماہنامہ ہم قلم کراچی کے سالگرہ نمبر اگست ۱۹۶۱ء میں چھپی ہوئی ہے جسے اب "دنیائے ادب" کراچی نے ایک نہایت ضخیم عالی نمبر میں من وعن شائع کر دیا ہے۔

ایک مرحلہ یہ آیا کے گلڈ کے افتتاحی اجلاس میں صدر ایوب خان کو کیسے شریک کیا جائے۔ اس سلسلے میں شہاب صاحب نے اہم کردار ادا کیا اور صدر ایوب خان کو ادیبوں کی محفل میں آنے پر آمادہ کرلیا۔ اجلاس کی صدارت مولوی عبدالحق نے فرمائی۔ منتخب معتمد عمومی قدرت اللہ شہاب تھے اور نظامت کے فرائض جمیل الدین عالی ادا کررہے تھے اور یوں گلڈ کو صدر ایوب خان کی حمایت اور خوشنودی حاصل ہوگئی۔ (۵۵) مگر اس وقت ایک بڑا تاریخی واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ جب صدر ایوب خان پنڈال میں تشریف لائے تو سب لوگ استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ جب ایوب خان اسٹیج کی طرف بڑھے تو عالی نے آگے بڑھ کر صدر ایوب خان کو سامنے والی نشست پر بٹھاتے ہوئے کہا" ہم تو آپ کو سنتے ہی رہے گے آج آپ یہاں تشریف رکھیئے اور ادیبوں کی گفتگو سنیئے "ایوب خان مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے اور گلڈ کا پورا پروگرام دیکھا (۵۶) ایسا نہ کبھی پہلے ہوا تھا نہ آج تک کہ ایک صدر مملکت کو ایسے جلسے میں بلوا کر صف سامعین میں شمار کیا جائے۔ بیوروکریسی ناراض ہوگئی اور اس کی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں۔ جو بعد میں اپنا رنگ لائیں۔ مگر بہت جلد ایوان صدر میں قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی کی موجودگی نے ان ریشہ دوانیوں کو فوری طور پر کامیاب نہ ہونے دیا اور پہلے ہی دو برسوں میں یہ ہوا کہ عالی نے ملک کے متمول سیٹھ آدم جی اور داؤد گروپ کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ ہر سال منتخبہ تخلیقی ادب پر انعامات دیا کریں گے۔ انعامات کی رقم اور طریقہ کار طے ہو جانے کے بعد پہلے ہی سال سرکاری اعزازات کے موقع پر ہی آدم جی ادبی انعامات بھی صدر ایوب خان کے ہاتھوں دلوائے گئے تقسیم انعامات کی یہ تقریب ایوان صدر میں منعقد ہوئی تھی۔ گلڈ کے انعام سوشلسٹ شوکت صدیقی کی کتاب "خدا کی بستی" اور غلام عباس کی کتاب "جاڑے کی چاندنی" کو تقسیم ہو کر ملا تھا۔ گلڈ کے معاملات ایک علیحدہ داستان ہیں جن کا ذکر اگلے باب میں تفصیل سے آئے گا۔ یہاں یہ ذکر عالی کی سرگرمیوں کو دکھانے کے لئے کر دیا گیا۔ ایوان صدر میں رہ کر عالی نے ادیبوں کی فلاح کے لئے جو کارنامے انجام دیئے انہیں کسی طور پر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ گلڈ کے انعامات کے سلسلے میں بہت کچھ بے اندازہ گر بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ تخلیقی ادب پر مدتوں یہ انعامات ادیبوں کو ملتے رہے۔ شعروادب کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی لیکن

خود عالی نے گلڈ سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ جب تک ایوان صدر میں رہے۔ اپنے منصب اور اثر و رسوخ کو ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرتے رہے۔ (۵۷) انہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مستحق، بیمار، نادار اور مرحوم ادیبوں کے خاندانوں کو مستقل سرکاری وظائف کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے میں قدرت اللہ شہاب کی شہادت قابلِ توجہ ہے۔ "پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری جنرل کے طور پر مجھے دوبارہ منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا مگر اس ابتدائی دور میں گلڈ کی تنظیم و تعمیر کا سہرا دراصل جمیل الدین عالی کے سر ہے۔ اپنی نوابانہ کجکلاہی، شاعرانہ نازک مزاجی، جبلی زود رنجی، ذکی الحسی اور طبعی لاابالی پن کے باوجود انہوں نے جنون کی حد تک دھن لگن اور خلوص کے ساتھ گلڈ کے لئے انتھک کام کیا۔ بعد میں طرح طرح کے نامساعد حالات میں انہوں نے ہر قسم کی مخالفت اور مزاحمت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس معرکہ آرائی میں انہیں انواع واقسام کے مصائب اور اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ ایک بار تو وہ اسی کشمکش میں کچھ عرصے کیلئے اپنی ملازمت تک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن گلڈ کے لئے ان کے جذبہ خدمت میں کوئی کمی نہ آئی میں نہایت ایمانداری سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ گلڈ کے ادارے سے عالی نے اپنی ذات کے لئے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا" (۵۸)

"رائٹر گلڈ جب وجود میں آیا تو اس کے منشور کے مطابق ہمارے عزائم نہایت بلند تھے۔ میں اپنی بے توفیقی اور عدم صلاحیتی کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہم انہیں پورا کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہے۔ ان ناکامیوں میں سرِ فہرست گلڈ اشاعت گھر ہے۔ یہ قائم تو ہوا تھا اور غالباً بائیس کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ اس سے آگے نہ چل سکا۔ "ہم قلم کے نام سے گلڈ کا اپنا ادبی رسالہ بھی جاری ہوا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصے چل کر یہ بند ہوگیا۔" (۵۹)

پیشہ ورانہ خدمات

"قدرت اللہ شہاب کے چلے جانے کے بعد ایوانِ صدر میں اعجاز احمد نائک (C.S.P) پریزیڈنٹ کے سیکریٹری مقرر ہوئے اور ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۳ء تک رہے ان سے عالی کی خوب نبھی لیکن انکے بعد فاروقی سینئر سی۔ ایس۔ پی پرنسپل سیکریٹری ہوکر آئے تو نبھ نہ سکی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں عالی ڈیپوٹیشن پر وزارتِ تعلیم میں آگئے۔ یہاں ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ترمیم شدہ کاپی رائٹ کا محکمہ قائم کریں۔ اس سے قبل عالی ۱۹۶۱ء میں یونیسکو فیلوشپ پر تربیت کیلئے برطانیہ، مغربی یورپ، امریکہ جاپان اور برما گئے تھے۔ وہاں سے واپس آکر انہوں نے حکومت سے کاپی رائٹ قانون میں کچھ ترمیمات منظور کرالی تھیں۔ یہ قانون اس وقت تک مردہ پڑا ہوا تھا اور عالی اس وقت ایوانِ صدر میں تھے۔ ان کے لئے یہ ترمیمات کرالینا مشکل نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں یہ ترامیم کرالی گئیں" (۶۰)

اسی ترمیم کی رو سے کاپی رائٹ قانون کے نفاذ سے قبل اس کا محکمہ قائم ہونا ناگزیر تھا۔ لیکن یہ ابھی رجسٹرار کاپی رائٹ کے عہدے پر نامزد ہوکر نئے محکمہ کے قیام اور دفتر اور اسٹاف کو جما ہی رہے تھے کہ ان کو نیشنل پریس ٹرسٹ میں بطور سیکریٹری (اپریل ۱۹۶۴ء) میں بھیج دیا گیا" (۶۱)

" نیشنل پریس ٹرسٹ ایک غیر سرکاری ادارہ تھا جو قانونی اور مالی ملکیت کے لحاظ سے نئے اخبارات کے قیام، ضابطہ اخلاق، ان کی کارکردگی اور کارکنوں کے مفادات کی نگرانی کیلئے قائم کیا گیا تھا۔ ادارہ تو غیر سرکاری تھا مگر سرکاری ایماء پر وجود میں آیا تھا۔ اس کے سربراہ جناب اختر حسین (ہلال پاکستان، سابق گورنر مغربی پاکستان) مقرر ہوئے تھے۔ اُن ہی کے ایماء پر عالیؔ صاحب کو لیا گیا تھا۔ ٹرسٹ کے دیگر ممبران میں جناب ممتاز حسین صدر نیشنل بینک، معروف تاجر جناب محمد علی رنگون والا، جناب محمد غلام فاروق اور راجشاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

شعبہ ادب میں گلڈ سے تنازعے کے بعد اپریل ۱۹۶۵ء میں اچانک حکومت نے ان کا ڈیپوٹیشن ختم کر دیا اور ان کا تقرر محکمہ انکم ٹیکس کی لاہور کمشنری میں کر دیا۔ ڈیپوٹیشن ختم کرتے وقت اختر حسین صاحب سے بھی مشورہ نہیں کیا گیا۔ اب مسئلہ ان کے وقار کا بھی تھا اور اختر حسین صاحب، عالیؔ کو بڑے عزیز تھے۔ اس لئے عالیؔ نے سرے سے سرکاری ملازمت ہی سے استعفیٰ دے دیا اور اتنی طویل مدت کی ملازمت سے ضابطے کی میعاد کی ایک برس پہلے مستعفی ہونے کے سبب ان کی پنشن بھی ماری گئی۔ اختر حسین صاحب نے یہ کیا کہ ایک نئے معاہدے کے تحت انہیں نیشنل پریس ٹرسٹ میں کنٹریکٹ پر دوبارہ ملازم رکھ لیا۔ (۶۲)

حکومت نے جیسا کہ اندیشہ تھا جلد ہی ٹرسٹ کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی یہ مداخلت اختر حسین صاحب کو پہلے بھی گوارا نہ تھی۔ چنانچہ اب عالیؔ کے اس معاملے نے حکومت کو سخت ناراض کر دیا جلد ہی انہیں مستعفی ہونا پڑا۔ ٹرسٹ کا صدر دفتر راولپنڈی منتقل کر دیا گیا اور اختر حسین صاحب کی جگہ میجر جنرل (ر) ضیاء الدین کو ٹرسٹ کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ وہ چند ہفتے ہی ٹرسٹ کے چیئرمین رہے۔ قاہرہ میں پی۔ آئی۔ اے کا جو جہاز حادثے میں کام آیا اس میں وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ یہ واقعہ اپریل ۱۹۶۵ء کا ہے۔ ان کی جگہ اس وقت کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین اس ٹرسٹ کے چیئرمین مقرر ہوئے اور پھر اس وقت کی قومی اسمبلی کے ممبر جناب اے۔ کے سومار چیئرمین بنا دیئے گئے۔ غالباً اپریل ۱۹۶۶ء میں صدر ایوب کے ایماء پر نواب صاحب کالا باغ نے وزیر خزانہ جناب محمد شعیب کے ذریعہ عالیؔ سے استعفیٰ طلب کر لیا۔

اس بے کاری کے زمانے میں ادارہ جنگ کے لئے "اخبار جہاں" کی منصوبہ بندی کی۔ میر خلیل الرحمٰن مرحوم کے ایماء پر جنگ کے سرمائے سے پاکستان میں ٹائپ رائٹر بنانے کا کارخانہ قائم کرنے کا منصوبہ لے کر یورپ گئے تا کہ وہاں کی کمپنیوں سے اس معاملہ میں معاہدہ کر سکیں۔ لیکن ادھر حکومت پاکستان نے سرمایہ کاری کا نیا شیڈول جاری کیا جس میں سرمایہ کاری کی آخری حد ایک کروڑ روپے رکھی گئی، جبکہ یورپ کی کوئی کمپنی اس پروجیکٹ پر پانچ کروڑ سے کم کی سرمایہ کاری کیلئے تیار نہ تھی چنانچہ بات نہ بن سکی اور یہ واپس آ گئے۔

۱۹۶۷ء کے اوائل میں نیشنل بینک کو انکم ٹیکس کے زیادہ مسائل پیش آئے بورڈ نے انکم ٹیکس ایڈوائزر کی آسامی مشتہر کی یہ عہدہ وائس پریذیڈنٹ کا تھا۔ عالیؔ اس آسامی کے امیدوار ہوئے اور منتخب ہو گئے۔ اس تقرر میں ممتاز حسن صاحب

نے بڑا موثر کردار ادا کیا۔ کچھ دن بعد ٹرسٹ کے نئے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر انور مقرر ہوئے۔ بعض افسران نے ان کے خلاف مہم چلائی۔ میجر ابن الحسن اس وقت چیف پبلک ریلیشنز آفیسر تھے مگر روزنامہ "کوہستان" لاہور کے بند ہونے کے بعد اسکے معاملات طے کرنے کے لئے لاہور میں تعینات تھے۔ میجر ابن الحسن اور عالی نے اس مہم کا ساتھ نہیں دیا۔ میر خلیل الرحمٰن کے ذریعہ وہ مہم ختم کرادی گئی۔ لیکن ایم ڈی کے دل میں غلط فہمی کی گرہ پڑ چکی تھی۔ مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ انہوں نے جنوری ۱۹۷۰ء میں بورڈ کی میٹنگ کی اور ابن الحسن اور عالی کے محکمے ختم کرا دیئے۔ دونوں حضرات کو تین تین ماہ کی پیشگی تنخواہ دے کر فارغ کر دیا گیا۔ عالی چونکہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں تو بعد میں معلوم ہوا۔ لیکن میجر ابن الحسن دوسرے ہی دن ہفتہ وار " گلف اکنامسٹ " میں مدیر ہو گئے۔ عالی نے واپس آکر سول جج کراچی کی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جو سال بھر تک چلتا رہا۔ ادھر اواخر ۱۹۶۳ء میں عالی کو ان کی ایک لاولد سوتیلی بہن نواب زادی مہربانو بیگم مرحومہ سے لاہور، ساہیوال، اوکاڑہ اور لندن میں کچھ رہائشی، زرعی اور کچھ نقد وراثت ملی۔ ایک عزیز نے سب حقداروں کے خلاف دعوے کر رکھے تھے۔ مقدمہ چلتا رہا با لآخر ۱۹۸۸ء میں وہ سپریم کورٹ تک سے ہار گیا۔ عالی وغیرہ نے ایک اور دعویٰ لندن میں سرکاری حصص کا جیت رکھا تھا۔ اس فیصلہ کو لندن کے وکیل سے لندن کی عدالت میں پیش کروا کر توثیق کرائی تھی اور وہیں حصص بیچ کر نقد رقم حاصل کر لی گئی۔ اس غرض سے وہ لندن چلے گئے وہ چاہتے تھے کہ اپنے حصے کی رقم سے وہیں (Paying Guest) کے لئے کرائے پر مکان لے کر یا قسطوں پر خرید کر کوئی جائیداد بنا لیں جس سے معقول آمدنی ہونے لگے۔ ادھر ملک میں یکجہتی ناپید ہو گئی تھی۔ مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی، چنانچہ انہوں نے استحکام پاکستان کیلئے لندن میں ہی جلسے جلوسوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ نومبر ۱۹۷۱ء میں ہندو پاک جنگ چھڑ گئی۔ انہوں نے پاکستان واپس آکر دفاعی کوششوں میں حصہ لینا چاہا مگر پاکستان کیلئے پروازیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو براہ راست فرینکفرٹ، پشاور آئے وہاں سے تیز گام ٹرین میں لاہور خانیوال کی طرف چلے، کوٹ سما بہ پہنچے تو ریلوے لائن پر بم گرا، چند روز وہیں پڑے رہے۔ اس دوران جنگ بند ہو گئی۔

نیشنل بینک سے سبکدوشی کے سلسلے میں ان کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس میں بینک نے یہ موقف اختیار کیا کہ انتظامیہ کو مدعی سے کوئی شکایت نہیں مگر اسے یہ حق حاصل ہے کہ اپنے ملازمین کو کوئی وجہ بتائے بغیر یا اس کے خلاف کوئی کارروائی کئے بغیر ملازمت سے سبکدوش کر دے (بعد میں ایک ایسے ہی کیس میں پنجاب ہائیکورٹ نے ایسے موقف مسترد کر دیا۔ پھر بھٹو حکومت آ گئی اور ایم ڈی کو برخاست کر دیا گیا۔ اسکے بعد نئے ایم ڈی سردار جمیل نشتر سرحد بینک سے نیشنل بینک میں آ گئے۔

انہوں نے ان سے مقدمہ واپس کرایا اور بورڈ آف ڈائریکٹرز نے غیر رسمی طور پر طے کی گئی اس شرط پر کہ وہ زمانہ بیروزگاری کی تنخواہ طلب نہیں کریں گے، نہ پچھلے سالوں کی ملازمت کو نئی ملازمت میں شمار کرنے پر اصرار کریں گے۔ انہیں بحال کروا دیا گیا۔ اب عالی نے سینئر وائس پریزیڈنٹ کے درجہ میں ڈیولپمنٹ ایڈوائزر کا عہدہ سنبھالا ۱۹۷۵ء میں انہیں ترقی

ملی اور وہ ایگز یکٹیو وائس پریزیڈنٹ بنا دیئے گئے۔ اب ان کے عہدے، ذمہ داریوں اور دائرہ کار میں بھی اضافہ ہوگیا۔"

"مارچ ۱۹۷۷ء میں پی پی پی کا ٹکٹ ملا۔ (قومی اسمبلی نشست ۹/۹۱) الیکشن لڑے اور ہار گئے۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء لگا۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۲۵ آیا۔ اس کی رو سے تمام نیم سرکاری اور حکومت کے تمام گرانٹ یافتہ (خواہ نجی) اداروں کے ملازموں پر لازم ٹھہرا کہ اگر کسی عنوان بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہو تو ان کی ملازمت ختم اور یہ کہ وہ خود اپنے اپنے محکموں کو لکھ دیں اور اپنے آپ کو سبکدوش سمجھیں۔ (جب کہ الیکشن سے پہلے حکومت نے پارلیمان سے ایک قانونی ترمیم اس امر کی منظور کرالی تھی کہ پابندی صرف سرکاری ملازمین پر رہے گی۔ یعنی سیاسی کام کرسکیں گے۔) غلط یا صحیح ترمیم کی وجہ سے بے شمار نیم سرکاری اداروں کے ملازمین نے سیاسی اور انتخابی کارروائیوں میں حصہ لیا تھا۔ اب اس مارشل لاء ریگولیشن نے موثر بہ ماضی ہو کر ان سب کو ایک نئی پوزیشن میں ڈال دیا۔ عالی تو قومی اسمبلی کے باقاعدہ کھلے امیدوار رہ چکے تھے، جب اس ضابطے کا اعلان ٹی وی پر رات کی خبروں میں ہوا، وہ اسی رات یوگوسلاویہ کے ادیبوں کی دعوت پر انکے سالانہ جشن آزادی میں پاکستان کے مندوب کے طور پر ان کیمہمان ہو کر جا رہے تھے۔ انہوں نے اسی وقت اپنا استعفیٰ لکھ کر گھر والوں کو دیا اور بلگراد چلے گئے۔

وہاں ان سے ایسے بہت سے کارکنوں نے بذریعہ ٹیلی فون اور تار بھیج بھیج کر رابطہ کیا جو نیشنل بینک اور اردو سائنس کالج اور دوسرے نیم سرکاری اداروں کے ملازمین تھے اور انتخابات کے دوران ان کی محبت میں ان کا کوئی نہ کوئی کام کرنے آجاتے تھے۔ ان لوگوں کو بلیک میلرز نے دھمکیاں دینی شروع کردی تھیں۔ عالی انشا کے پاس لندن جانا چاہتے تھے مگر ان کی پیروی کرنے پاکستان واپس آگئے۔ ایک اور ضابطہ (موافق حکومت سیاسی عناصر کے اصرار پر) آیا اس کی رو سے حکومت کسی کو بھی اطلاق ضابطہ سے مستثنٰی کرسکتی تھی۔ کئی جماعتوں کے افراد نے یہ استثنٰی حاصل کرلیا۔ عالی نے خود حسب ضابطہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو استثنٰی کی درخواست دی، انہیں انکار ہوگیا۔ چار مہینے بے روزگار رہے۔ مارشل لاء حکومت نے تمام تفتیش کرلی کہ انہیں حکومت وقت نے یا کسی پچھلی حکومت نے کوئی پرمٹ، پیٹرول کاروبار، صنعت اور کوئی بھی فائدہ پہنچایا ہو۔ کچھ نہیں نکلا۔ بالآخر اس وقت حکومت کے سیکریٹری جنرل غلام اسحاق خان نے انہیں بلایا اور ان کی فائل دکھا کر کہا۔" عزیزم آپ کو سیاست میں جانے کی کیا ضرورت تھی"؟ ان کے فائل پر اہم ترین چیز چیئرمین پی پی پی بھٹو صاحب کے نام ان کی درخواست تھی جو ایک ٹیلیگرام تھا۔ اس میں جس طرح انہوں نے ٹکٹ مانگا تھا۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ انہیں انتخابی معاملات کا کچھ علم نہیں تھا۔ درخواست کسی کے حکم پر دی گئی تھی۔ بہر حال فروری ۱۹۷۸ء میں غلام اسحاق خان نے استثنٰی دلوا دیا۔ ان کے اور ان کے کارکنوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ انہیں نوکری واپس مل گئی اور انجمن کی اعزازی معتمدی بھی بحال ہوگئی۔

۱۹۷۸ء میں سینئر ایگزیکیٹو وائس پریزیڈنٹ ہونے کا موقع آیا بورڈ کے احکامات کے تحت ان کا نام پاکستان بینکنگ کونسل کو (ترقی کے احکامات کی توثیق کے لئے) بھیجا گیا وہاں مشتاق یوسفی صدر ہو گئے تھے۔ لیکن اپنی وجوہ سے کونسل چھوڑ کر (پی۔سی۔سی۔آئی) جا رہے تھے۔ انہوں نے وہ سفارشات یہ کہہ کر واپس کر دیں کہ مناسب ہے کہ وہ ان کے جانشین کو بھیجی جائیں اس دوران جمیل نشتر کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ ایگری کلچر ترقیاتی بینک کے صدر ہو کر اسلام آباد چلے گئے۔ (۶۳)

وزارتِ خزانہ کے ایڈیشنل سیکریٹری محمد نواز خان نیشنل بینک کے صدر ہو کر آ گئے انہوں نے وہ سفارشات یوسفی صاحب کے جانشین سے واپس منگا لیں اور کہا کہ اب تو میں خود یہ کام دیکھوں گا۔ انہوں نے دوسرے بہت سے (نسبتاً جونیئر) افسران کے احکاماتِ ترقی بھی واپس لے لئے۔ یعنی بے ضابطہ عملاً ان کی تنزلی کر دی۔ ان لوگوں نے بینک کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ (کئی برس بعد عدالت عالیہ سے سب جیت گئے بینک ہار گیا)۔ نواز صاحب نے ۱۹۷۸ء میں چارج لیا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے عالی سے بہت جونیئر ایک ایگزیکیٹو وائس پریزیڈنٹ جناب سعید بٹ کو سینئر ایگزیکیٹو پریزیڈنٹ بنانے کے لئے پاکستان بینکنگ کونسل کو سفارش بھیجی اور عالی کا نام نہ بھیجا یہ خبر سن کر عالی نے نواز صاحب سے احتجاجی گفتگو کی اور یہ کہہ کر دفتر سے چلے گئے کہ سعید بٹ سے انہیں پرخاش یا ان کی ترقی پر اعتراض نہیں لیکن وہ اس وقت تک دفتر نہیں آئیں گے جب تک سعید بٹ کے ساتھ انہیں ترقی نہیں دی جاتی۔ انہوں نے رخصت بھی نہیں لی۔ یہ ایک خطرناک قدم تھا۔ یہ خبر وزارتِ خزانہ پہنچی تو وزیر خزانہ (غلام اسحٰق خان) نے حکم دیا کہ آئندہ سے اس درجے میں ترقی کی سفارش نہ صرف بینکنگ کونسل بلکہ وزارتِ خزانہ کی منظوری کیلئے بھی آئے گی۔ چنانچہ وہ سفارش وزارت چلی گئی اور وہاں منظوری یا منظوری، کے بغیر پڑی رہی یہ واقعہ میکلوڈ روڈ کے مالیاتی اداروں میں گشت کرتا رہا۔ تقریباً تین ہفتے بعد نواز خان صاحب نے عالی کو فون کیا کہ وہ ان کی ترقی کی سفارش بھی کر رہے ہیں۔ مگر شعبے میں ان کا بھرم رکھنے کے لئے یہ اچھا ہو گا۔ اگر منظوری وصول ہونے کے بعد عالی صاحب احکامات کا اجراء ہونے کی صبح ایگزیکیٹو وائس پریزیڈنٹ کی حیثیت سے ہی دفتر آ جائیں اور ترقی کا پروانہ دوپہر کے بعد وصول کریں۔ یہ مان گئے وزارتِ خزانہ نے دونوں کی ترقیاں منظور کر کے بھیج دیں اور ایسا ہی ہوا جیسا نواز خان صاحب سے طے ہوا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں بینکوں کے ایگزیکیٹو بورڈ میں آسامیاں خالی ہوئیں تو مختلف قومیائے ہوئے بینکوں کے ایس۔ای۔وی۔پی کے نام اس ترقی کے لئے زیر غور آئے۔ نواز خان صاحب صدر تھے۔ وزیر خزانہ میاں یاسین خان وٹو تھے نواز صاحب نے عالی کا نام اس شرط پر حکومت کو بھیجا کہ وہ نیشنل بینک کے ایگزیکیٹو بورڈ میں تعینات نہ کئے جائیں۔ عالی نے کسی اور بینک میں جانے سے انکار کر دیا۔ کونسل اور حکومت نے ایک آسامی بینکنگ کونسل میں پیدا کی اور انہیں رکن ایگزیکیٹو بورڈ کے عہدے پر ترقی دے کر کونسل میں ایڈوائزر کارپوریٹ پلاننگ ڈیولپمنٹ اینڈ پبلسٹی تعینات کر دیا۔ اس طرح پانچوں قومیائے ہوئے بینکوں میں کارپوریٹ پلاننگ کا تصور نافذ کرنا، کاروبار کی چیکنگ، باہمی روابط اور تشہیر کی نگرانی و رابطہ ان کے تحت آ گئے۔

۱۹۸۵ء میں محمد خان جونیجو کی حکومت بنی تو ڈاکٹر محبوب الحق وزیرِ خزانہ مقرر ہوئے انہوں نے اس سال کے بجٹ میں تین نئی اسکیمیں متعارف کرائیں۔

(۱) اسپیشل نیشنل فنڈ بونڈز (کالے دھن کی بار عایت برآمدگی کے پلان کا بونڈ Bond)

(۲) زیرو کوپن بونڈ (اسی قسم کا ایک مخصوص بانڈ جو کاروباری حلقوں میں بطور ادائیگی گشت کر سکے)

(۳) ایف۔ای۔بی۔سی (فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکیٹس جو مشہور ہیں)

ایک کونسل نے ڈاکٹر محبوب الحق کی بنائی ہوئی مجلسوں میں سے ایک کے لئے عالی سے اپنی نمائندگی کرائی تو ڈاکٹر محبوب الحق اور گورنر اسٹیٹ بینک اے۔اے قاضی نے انہیں ان تینوں اسکیموں کی تشہیر اور مانیٹرنگ کیلئے منتخب کر لیا اور وہ عملاً گورنر اسٹیٹ بینک کے تحت وزارتِ خزانہ میں کسی باقاعدہ تبادلے کے بغیر بار بار آنے جانے لگے (۶۴)

چند مہینے بعد وزارتِ خزانہ کی ایک کانفرنس میں اسکیموں اور ان پر کام کرنے والے سینئر بینکاروں کے کام کا جائزہ لیا گیا تو اچھے نتائج دکھانے والے صدر اور سینئر زایگزیکٹیو بورڈ کو کیش انعام دینے کا فیصلہ بھی ہوا۔ حکومت نے کسی کو اسی ہزار روپے اور کسی کو ایک لاکھ روپے دیئے۔ لیکن گورنر اسٹیٹ بینک اے۔جی قاضی کی کھلی سفارش پر عالی کو دو لاکھ روپے نقد دیئے گئے۔(بعد میں اس پر انکم ٹیکس لگا۔ عالی نے اپیل کی اور جیتے، اس فیصلے کے خلاف محکمہ انکم ٹیکس نے اپیل کی اور ٹریبونل میں بھی ہار گیا)۔ ساتھ ہی ان کی مدت ملازمت میں دو برس کی توسیع کر دی گئی۔ ۱۹۸۷ء میں جب میاں یاسین وٹو وزیر خزانہ تھے جونیجو نے میاں یاسین وٹو کی سفارش پر ان کی ملازمت میں ایک برس کی مزید توسیع کر دی۔

۱۹۸۸ء میں جب ڈاکٹر محبوب الحق دوبارہ وزیرِ خزانہ مقرر ہوئے تو انہوں نے عالی کو کونسل کی ذمہ داریوں کے ساتھ اضافی طور پر وزارتِ خزانہ واقتصادی امور اور سی بی آر کا چیف ایڈوائزر اور افسر رابطہ بنا دیا اور انھیں نیم سرکاری ملازمتوں کا اعلیٰ ترین گریڈ ایم ون مل گیا۔ جب صدر پاکستان محمد ضیاء الحق فضائی حادثے میں ہلاک ہو گئے اور غلام اسحاق خان قائم مقام صدر مملکت ہوئے۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے شعبہ بینکاری میں بینکنگ کونسل کے ذریعے مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم نافذ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تو انتخابات ہو رہے تھے اور عالی امیدوار نہ تھے۔ بینکنگ کونسل نے سسٹم نافذ کرنے کے حوالے سے اور جاریہ فرائض بھی برقرار رکھنے کے لئے وزارتِ خزانہ سے سفارش کی کہ مدتِ ملازمت میں مزید دو برس کی توسیع کر دی جائے۔ اب ایک ترقیاتی کمیٹی بن چکی تھی۔ صدر، وزیرِ خزانہ، اراکین، گورنر اسٹیٹ بینک (اس وقت آئی۔آئی قاضی) سیکریٹری وزارتِ خزانہ (اس وقت جناب سعید قریشی) اور صدر پاکستان بینکنگ کونسل (تجمل حسین) اس کمیٹی کے سیکریٹری، ایڈیشنل سیکریٹری، وزارتِ خزانہ تھے۔ اس کمیٹی نے وہ سفارش منظور کر لی۔ وزیرِ خزانہ نے اسے حسبِ ضابطہ قائم مقام صدر مملکت غلام اسحاق خان کو بھجوا دیا۔ (کیونکہ اس وقت وزیراعظم کوئی نہ تھا اور صدر مملکت ہی وزیراعظم کے فرائض بھی ادا کر رہے تھے) مدتِ ملازمت میں توسیع ۳۱، دسمبر کو ختم ہوئی تھی، اگست کے بعد مہینے بڑی پریشانیوں کے تھے۔ عالی کو

اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑی دوڑ بھاگ کرنی پڑ رہی تھی سفارش اسٹیبلشمنٹ ڈویژن اور ایوانِ صدر کے مختلف شعبوں میں گھومتی رہی اور نومبر میں اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کے مخالفت کے بعد صدر صاحب سے مسترد ہو کر واپس آ گئی۔ انہیں فوراً ہی معلوم ہو گیا۔ کہ سفارش میں متعلقہ کمیٹی کی منظوری والی قرارداد کا ذکر ہی نہیں کیا گیا (۲۵) اسٹیبلشمنٹ ڈویژن مخالفت کرنے کے مجاز نہ تھا۔ یہ ایک سازش تھی۔ سیکریٹری وزارتِ خزانہ سعید احمد نے وزیر ڈاکٹر محبوب الحق کی منظوری سے صدرِ مملکت کو ایک معذرتیہ نوٹ بھیجا جس میں اس فروگزاشت پر معافی مانگی گئی اور گزارش کی گئی کہ صدر مملکت از سرِ نو غور فرمائیں صدر مملکت نے اپنا پچھلا فیصلہ تو واپس نہیں لیا (انتخابات ہو چکے تھے اور نئی حکومت کی تشکیل کیلئے پارٹیوں سے مذاکرات ہو رہے تھے اور ہر صورت میں ان کے فرائض بطور وزیر اعظم جلد ختم ہونے والے تھے) لیکن انہوں نے یہ بھی لکھا کہ عالی کو ان ہی کے درجہ میں وزارتِ تعلیم یا وزارتِ اطلاعات میں مامور کرا کر توسیع دے دی جائے۔

ڈاکٹر محبوب الحق اور دوسرے سب وزیروں کو ۱۶، نومبر تک سبکدوش ہو جانا تھا۔ عالی کی توسیع ۳۱، دسمبر تک ہو جانی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر محبوب الحق سے کہا آپ تو جا رہے ہیں کسی نئی نوکری کے چکر میں آپکو کیا تکلیف دوں، اب میں کہاں مارا مارا پھروں گا۔ بس میں بھی اپنی مدت پوری کر کے چلا جاؤنگا۔ پھر بے نظیر حکومت آ گئی شالیمار ریکارڈنگ کے ایم۔ ڈی راشد لطیف وزارتِ اطلاعات کے سیکریٹری ہوئے۔ انہوں نے براہ راست ایک سمری وزیر اعظم کو بھیجی ایک خط بیرسٹر اعتزاز احسن وزیر قانون نے جو عالی کو جانتے تھے از خود وزیر خزانہ کو لکھا کہ ان کی مدت ملازمت میں توسیع کی جائے۔ ایڈوائزر خزانہ وسیم جعفری اور وزیر مملکت برائے خزانہ احسان الحق پراچہ تھے۔ پراچہ اور عالی میں ڈاکٹر محبوب الحق کے بارے میں ان کی معترضانہ گفتگو کے دوران تلخ کلامی ہو گئی۔ عالی نے کہا "مجھے آپ کے تحت نوکری منظور نہیں۔ ادھر عالی وزارتِ اطلاعات میں بھی نوکری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت وہاں اسٹاف و پوسٹنگ کے حوالے سے حالات بھی دگرگوں ہو رہے تھے۔ وہ ۳۱ دسمبر کو مستقل گھر آ گئے۔

۱۹۸۹ء کے اوائل میں آج جو حبکو HUBCO ہے، اسے قائم کرنے والی کمپنی ZELIN CORP اسلام آباد میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے دریائے حب پر بند بنانے اور بجلی فراہم کرنے کا منصوبہ پیش کر رکھا تھا۔ وہ منظور نہیں ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی سرمایہ کاری کیلئے بہت بڑا سرمایہ جمع کرنا تھا۔ جس کیلئے عالمی بینک اور دوسرے بین الاقوامی بینکوں سے روابط ہو رہے تھے۔ اس کمپنی کے کرتا دھرتا سعودی عرب میں قائم کمپنی کے صدر جناب علی رضا تھے اور پاکستان میں مقامی نمائندے سردار یوسف خان (متعین ریاض اس وقت مقیم اسلام آباد) تھے۔ انہوں نے جدہ سے آنے والے افسر مسٹر جیمس کو عالی سے ملوایا اور یہ پانچ ہزار ڈالر ماہوار بامقطع پر ان کی مالیاتی ٹیم کے مشیروں میں شامل ہو گئے۔ عالمی بینک واشنگٹن۔ ڈی۔ سی گئے۔ سردار یوسف کے ساتھ لندن جا کر مرچنٹ بینک مورگن گرین فیلڈ سے مذاکرات کئے۔ بات خاصی آگے بڑھی۔ لیکن ان کی والدہ سخت بیمار ہو گئیں۔ کراچی واپس آ کر والدہ کی خدمت میں لگ گئے۔ کمیٹی ان کی طویل غیر

حاضری برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ ان کی یہ نوکری دو مہینے چلی (یہ نوکری ختم ہونے کے بعد ان کی والدہ بہتر ہوگئیں) یہ نارتھ امریکہ مشاعروں کیلئے گئے۔ پھر ۱۹۹۱ء میں جرمن ثقافتی مرکز کی دعوت، اردو کانفرنس میں برلن گئے، ۱۹۹۱ء اپریل میں واپس آئے تھے کہ والدہ پھر بیمار ہوکر اسپتال میں داخل ہوئیں۔ یہ وہیں منتقل ہوگئے۔ (ڈیڑھ برس اسپتال ہی میں رہے) وہیں ان کو بھی دل کا دورہ پڑا۔ والدہ کا انتقال گھر آکر ۱۲، اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ہوگیا۔ (کچھ عرصے بعد حبکو HUBCO قائم ہوگئی۔ آج وہ ایک بڑی کمپنی ہے مگر انہوں نے کوئی اور نوکری نہیں کی۔ البتہ ۱۹۹۷ء میں وہ سینیٹ کی رکنیت کے آزاد امیدوار ہوئے اور منتخب ہوگئے۔ ۲۱، مارچ ۱۹۹۷ء کو اس کا حلف اٹھایا اسکی مجلسِ قائمہ برائے تعلیم وسائنس کے صدر نشین منتخب ہوئے اور سرگرم رہے لیکن ۱۲، اکتوبر ۱۹۹۹ء کو حکومت اسمبلیوں اور سینیٹ کی تحلیل عمل میں آئی تو ان کی رکنیت بھی ختم ہوگئی۔

اب ان کو سرکاری اور سماجی کاموں کے جھنجھٹوں سے نجات ہے اور وقت مل سکتا ہے کہ وہ اپنی نامکمل نظم "انسان" کو مکمل کرسکیں اور کسی قدر اطمینان سے شعروادب کی طرف توجہ دے سکیں مگر ان کے مزاج میں جو سیمابی کیفیت ہے وہ انہیں فارغ نہیں بیٹھنے دیتی اور وہ کوئی نہ کوئی کام اپنے ذمے لگا لیتے ہیں" (۲۶)

جمیل الدین عالی کی شخصیت

جمیل الدین عالی ایک تہہ دار شخصیت کے حامل فرد ہیں۔ وہ کئی پشتوں کی حکمرانی کی روایت رکھتے ہیں۔ ان کے پردادا نواب احمد بخش خان والئی لوہارو، فیروز پور جھرکہ تھے۔ یہ نوابی عالی کے بڑے بھائی کے بیٹے آخری والئی لوہارو نواب امین الدین احمد خان ثانی تک جاری رہی حکمرانی شخصیت میں بعض مخصوص قدروں کو داخل کردیتی ہے۔ اس میں انصاف پسندی، فیاضی، دادودہش (جاو بیجا) رعایا پروری اور نفع رسانی اور غیض کی صورت میں عقوبت وسزا، آتش مزاجی، درباداری کی طلب شامل ہوتی ہے۔ یہ ایک مخصوص کلچر کو پیدا کرتی ہے اور کلچر ہی کی آفریدہ ہوتی ہیں۔

ہمارے دیسی حکمران بھی اسی روایتی کلچر کے حامل تھے۔ اپنی رعایا کے بہی خواہ، ان کے لئے نفع رسانی، اگر کسی نے طلب کیا تو خالی ہاتھ اس کو جانے دینا اپنی توہین خیال کرتے۔ جس بات پر خوش ہوتے۔ دادودہش کے انبار لگادیتے۔ ناراض ہوتے تو زن بچہ کولہو میں پلوادیتے۔ اپنے کہے کو قانون سمجھتے اور اس کی اطاعت کو امرِ خداوندی کی طرح ضروری خیال کرتے۔ دربار میں موجود اُمرا، وزرا حکمرانوں کی ہر بات پر صاد کرتے اور ہر چیز کی داد دیتے، درباداری کی یہ طویل روایت حکمرانوں کو چاپلوسی اور خوشامد پسندی کا عادی بنادیتی ہے۔ پھر غیر مشروط اطاعت کا چسکا بھی عجیب ہوتا ہے اور اس کا لطف وسرور وہی محسوس کرسکتا ہے جس کی اطاعت اس طرح کی گئی ہو۔

عالی اپنی ریاست کے حکمران نہیں رہے، مگر انہوں نے حکمرانی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ وہ نواب زادے تو تھے ہی اس لئے درباداری کے سارے انداز ان کے دیکھے بھالے اور برتے برتائے تھے۔ ان کی شخصیت میں حکمرانوں کے یہ انداز غیر محسوس طور پر در آئے ہیں۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہنا چاہیئے ۔ کہ عالؔی کا ننھیال خواجہ میر دردؔ دہلویؒ کے والد حضرت ناصر عندلیب کا گھرانا ہے۔ اس خانوادے میں تصوف کی سچی اور کھری روایات موجود ہیں ۔ دنیا سے بے رغبتی، اہل دولت واقتدار سے کنارہ کشی اور بے نیازی اور لا ابالی پن تصوف کی دنیا کی معروف خصوصیات ہیں ۔ننھیال کی یہ خصوصیات بھی عالؔی کو ورثے میں ملی ہیں اور یوں حکمرانی اور فقر و شخصیت گیری و نرم مزاجی دولت اور اقتدار سے بے رغبتی جیسی متضاد خصوصیات ایک انسان میں جمع ہوجائیں تو اسے مجموعہ اضداد بنا دیتی ہیں ۔ ددھیال اور ننھیال کا یہ مزاجی بعد عالؔی کی شخصیت میں شیر و شکر ہو گیا اور ان متضاد اوصاف نے عالؔی کی شخصیت میں ایک گنگا جمنی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ ایک طرف ان میں حکمرانہ نخوت ہے تو دوسری طرف متصوفانہ کسر نفسی ۔ ایک طرف اپنی بات منوانے کا شاہی انداز ہے تو دوسری طرف صوفیانہ لا ابالی پن اور کہہ کر بھول جانے کی ادا ۔ نفع رسانی ان کے یہاں نوابی سے بھی آئی ہے اور خانقاہ سے بھی، اس لئے دو آتشہ ہو گئی ہے ۔ عالؔی دوسروں کے مسائل سنتے ہیں، ان کی فکر کرتے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ہاؤسنگ سوسائٹیز کا قیام، اور ملازمینِ سرکار کی بہبود کی فکر، گلڈ کی تشکیل، اور ادیبوں کے مسائل کا حل، انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو زبان کو درپیش معاملات سے ان کی دلچسپی اسی نفع رسانی کے جذبے کی مرہون منت ہے ۔ وہ ہر فورم سے متعلقہ افراد کے مسائل حل کرنے کی دُھن میں رہتے ہیں ۔ مرحوم ادیبوں اور فن کاروں کے لئے جس طرح وہ فکر مند رہتے ہیں اور ان کے پس ماندگان کیلئے جس طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہیں وہ ان کی فطری جبلت کا عطیہ ہے ۔

عالؔی کی شخصیت کا ایک پہلو ان کی شاعرانہ حیثیت ہے ۔ نوابزادگی کے تقاضے اور تصوف کی روایات مختلف ہوتی ہیں ۔ اسی طرح سول سروس کے انداز مختلف اور شعر و ادب کا طرزِ فکر مختلف ہوتا ہے ۔ عالؔی نوابزادے بھی ہیں اور طویل عرصے سول سروس اور بینک کی ملازمت سے بھی وابستہ رہے ہیں ۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ عناصر ان کی شخصیت میں کسی قدر رعونت اور خشکی پیدا کر دیتے، لیکن شاعری آڑے آگئی ۔ عموماً شعر و ادب کے آدمی کو وسیع النظر، انسان دوست اور نرم دل ہونا چاہئے ۔ عالؔی کی شعر گوئی کی وجہ سے یہ تمام صفات ان میں در آئی ہیں ۔ وہ انسانی مسائل کو سمجھتے اور انفرادی مسائل پر ہمدردانہ غور کرتے ہیں ۔ انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ذاتی محرومیوں اور لاچاریوں سے انہیں دلچسپی ہے اور وہ ان کا حل تلاش کرتے رہے ہیں ۔ ان کی وسیع النظری انہیں اپنے اور پرائے کے امتیاز سے بے نیاز رکھتی ہے اور کبھی کبھی طرارہ آ جاتا ہے تو اس میں ان کے "مغل بچہ" ہونے کا بھی دخل ہے، حکمرانی کا بھی اور افسری کا بھی ۔ یہ اثرات یکسر نابود ہوجائیں، یہ بجائے خود ایک غیر فطری بات ہے ۔

عالؔی کو اکثر یہ شکایت رہی ہے کہ جن لوگوں کی فکر میں وہ گھلتے رہے، جن کے لئے اپنا وقت اپنے دست و بازو اور اثر و رسوخ کو استعمال کر کے آسائشیں فراہم کیں ۔ جن کو مناصبِ عالیہ تک پہنچانے کے لئے کوشاں رہے اور جن لوگوں کو ادبی انعامات دلانے کے انتظامات کیئے وہی ان کے درپے ہوئے ۔ اس میں جہاں اہلِ غرض اور دنیا والوں کی فطرت کا قصور

ہے، وہیں عالی کی بعض فطری کمزوریوں کو بھی دخل ہے۔ عالی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں، ایوانِ صدر سے وابستگی کے زمانے میں تو ان کے اثر ورسوخ کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آج بھی وہ وسیع اثر ورسوخ کے حامل ہیں۔ اہلِ دنیا ان کے رسوخ کے باعث ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تیمور لنگ نے کسی درباری سے پوچھا کہ "بتاؤ اگر ہمیں فروخت کیا جائے تو ہماری کیا قیمت لگے گی۔" درباری نے جواب دیا "پانچ ہزار درہم" تیمور نے کہ "یہ تو صرف ہمارے پٹکے کی قیمت ہے" اس نے عرض کیا۔ "حضور! میں بھی اسی کی قیمت لگا رہا ہوں۔ ورنہ حضور کو تو کوئی مفت بھی نہ لے گا۔"

یہی صورتِ حال عالی کے ساتھ ہے۔ ان کے اردگرد جو لوگ ہیں وہ ان کے رسوخ کے باعث ہیں۔ اس رسوخ کا فائدہ اٹھانے کے لئے وہ جس چرب زبانی سے کام لیتے ہیں۔ عالی اس سے دھوکا
کھا جاتے ہیں۔ دھوکا کھانے کی یہ "معصوم عادت" حکمرانوں اور حاکموں میں خوب ہوتی ہے۔ عالی کو یہ بھی وراثت میں ملی ہے اور ان کا اکتساب بھی ہے۔ اس لئے اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ جس کے ساتھ احسان کرتے ہیں وہی پلٹ کر کاٹتا ہے۔ انسانوں کی پہچان ان میں مطلق نہیں۔ چرب زبانی کے سحر اور خوشامد کے جادو سے وہ محفوظ و مامون نہیں، اس لئے بار بار دھوکہ کھاتے ہیں اور ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جاتے ہیں۔

وہ شاعر ہیں اور اعلیٰ پائے کے شاعر، شعر و ادب اور فن کاری خواہ کسی قسم کی ہو داد چاہتی ہے اور اس سے ہی جلا پاتی ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن غالب کو ستائش کی تمنا بھی تھی اور صلے کی پرواہ بھی۔ وہ پوری زندگی مناسب اور حسبِ طلب ستائش میسر نہ آنے کے شاکی رہے اور صلے کے لئے عرضی گزار بھی رہے۔ یہ غالب جیسے عظیم شاعر کا حال ہے اگر دیگر شعرا اس کے متمنی رہیں تو کیا عیب ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ فنکار یا شاعر کو ہم عام آدمی کی سطح پر رکھ کر دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ شاعر یا ادیب کا سارا سرمایہ حیات اس کا فن ہوتا ہے اور وہ فن کی قدر کے معاملے میں بڑا حساس ہوتا ہے، اس کا قدر دانی کا مطالبہ نہ تو غیر ضروری ہوتا ہے نہ مبالغہ آمیز، تخلیقی تجربے سے گزرنے کا کرب اور اس کے اظہار کا اطمینان و مسرت ایسی انوکھی چیز ہے جس میں فنکار و شاعر دوسروں کو شامل کرنا چاہتا ہے اور اسی کا نام داد ہے۔ قاری یا سامع تجربے کے کرب اور اظہار مسرت کو نہیں سمجھتا، وہ تو تحسین و تفہیم کے مرحلے سے گزرتا ہے اور محض اتنا ہی لطف اندوز ہوتا ہے، یہیں سے شاعر کے مطالبات معاشرے سے شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ عالی کو شہرت و نام وری کا چسکا ہے۔ مگر اسی قدر اور اسی انداز کا جتنا تمام فن کاروں کو ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نہ ان کا عیب ہے نہ ہنر، یہ فن کار کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کا مطالبہ فطری ہے۔ ہمارے معاشرے میں جہاں گروہ بندیوں، مطلب پرستیوں اور خود غرضیوں نے اپنے

معاصرین کے اعتراف وتوقیر کی روایات کو معدوم کر دیا ہے، اپنے مقام کا تعین فن کار کو خود کرنا پڑتا ہے۔ نہ تو نقد میں اعتدال رہا ہے نہ بصیرت میں توازن، ایسے میں شاعر کو اپنی فکر خود کرنی ہوتی ہے۔ اس کے لئے شاعر یا فن کار کو مورد الزام قرار دینا مناسب نہیں، یہ ہمارے معاشرے کا مسئلہ ہے۔

حوالے و حواشی باب اوّل

۱۔	داغ	ازتمکین کاظمی	ص ۱۸
۲۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۹۰
۳۔	داستان خانوادہ	محمود علی قصوری	ص ۱۹۲

ریاست لوہارو

ریاست لوہارو۔ 1904 گزٹ مطبوعہ 1907

ریاست لوہارو کی قدیم تاریخ کے بارے میں کتابی ذخیرہ کمیاب ہے۔ لوہارو قدیم زمانے میں ریاست جے پور میں شامل تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں بعض جانبار ٹھاکروں نے اس وقت کے رواج کے مطابق جے پور کے تسلط کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی آزاد ریاست قائم کی۔ مہاراجہ نے مرہٹوں کے خلاف برطانیہ کی حکومت کی وفاداری سے امداد کی۔ اور اس وفاداری کے صلہ میں حکومت برطانیہ نے مہاراجہ الور کو لوہارو کا علاقہ سپرد کیا۔ اس کے بعد برطانیہ کی حکومت کی اجازت سے مہاراجہ الور نے ریاست لوہارو نواب احمد بخش خان کو عطا کی۔

۴۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۹۲
۵۔	یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی نئی دہلی	ص ۹
۶۔	ایضاً	ایضاً ایضاً	ایضاً
۷۔	حیاتِ غالب کا ایک باب	ڈاکٹر ملک حسن اختر	ص ۱۰، ۱۱
۸۔	یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی لوہاری گیٹ	ص ۲۰
۹۔	داغ	تمکین کاظمی	ص ۲۰، ۲۱
۱۰۔	ایضاً	ایضاً	ص ۲۳: ۲۶
۱۱۔	ایضاً	ایضاً	ص ۲۶
۱۲۔	آبِ حیات	محمود حسین آزاد	ص ۱۸۹
۱۳۔	داستان خانوادہ	محمود حسین قصوری	ص ۱۸۷
۱۴۔	غالب کا روزنامچہ	خواجہ حسن نظامی	ص ۱۴

۱۵۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۵
۱۶۔	ایضاً	ایضاً		ایضاً
۱۷۔	داستانِ خانوادہ	محمود علی قصوری		ص ۱۸۹
۱۸۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۹۰
۱۹۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۹۰
۲۰۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۹۲
۲۱۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۹۲
۲۲۔	ماہنامہ چہارسو	محمد عمر	راولپنڈی نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء	ص ۲۵
۲۳۔	ایضاً	ایضاً	ایضا	ص ۸۳
۲۴۔	ماہنامہ چہارسو	راولپنڈی نومبر دسمبر	۱۹۹۵ جمیل میرا ایک نام بدنام یار محمد عمر	ص ۸۳
۲۵۔	ایضاً			ص ۸۵

۲۶۔ اعتزاز الدین احمد خان پاکستان مرکزی حکومت میں ایف۔ آئی۔ اے (سابق اسپیشل پولیس) کے آئی۔ جی تھی جو لیاقت علی خان کے قتل کی انکوائری کے دوران کھیوڑہ کی فضاؤں میں فضائی حادثہ میں شہید ہوئے۔ طیارے کا حادثہ ۱۹۵۲ء میں پیش آیا تھا۔ انٹرویو جمیل الدین عالی از فہمیدہ عتیق

۲۷۔	انٹرویو جمیل الدین عالی	۹۸۔۵۔۳۱	از راقمہ
۲۸۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً

۲۹۔ آپا شمیم جالندھری کے والد اور طیبہ بانو کے والد کی دوستی تھی۔ اس لیے طیبہ بانو اور آپا شمیم کی بھی دوستی ہوگئی۔ اس زمانے میں لڑکیاں آپس میں دوستی نہیں کر سکتی تھیں جب تک گھر والوں کی دوستی نہ ہو۔ "طیبہ بانو"

۳۰۔	انٹرویو جمیل الدین عالی	۹۸۔۵۔۳۱	از راقمہ
۳۱۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۳۲۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۳۳۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۳۴۔	ایضا	ایضاً	ایضاً

۳۵۔ یہ واقعہ میرے والد بیان کرتے تھے۔ ظہور الدین میرے پھپا تھے۔ اس لئے یہ روایت خاندانی طور پر مشہور تھی۔ از فہمیدہ عتیق

۳۶۔	انٹرویو طاہرہ حجاب		از فہمیدہ عتیق
۳۷۔	کچھ بڑا زیور اور تمام آرائشی ہتھیار مالائیں وغیرہ لوہارو کے شاہی توشہ خانے میں محفوظ تھیں		
۳۸۔	انٹرویو طاہرہ حجاب	اسلام آباد	از راقمہ
۳۹۔	ایضاً	ایضاً	از فہمیدہ عتیق
۴۰۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۴۱۔	انٹرویو جمیل الدین عالی		از راقمہ
۴۲۔			
۴۳۔	انٹرویو جمیل الدین عالی		از راقمہ
۴۴۔	ایضاً		ایضاً
۴۵۔	ایضاً		ایضاً
۴۶۔	قومی زبان	راولپنڈی نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء	ص ۴۱
۴۷۔	شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	ص ۴۷۸
۴۸۔	ایضاً	ایضاً	ص ۴۷۹
۴۹۔	قومی زبان	راولپنڈی نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء	ص ۶
۵۰۔	حرفے چند جلد	جمیل الدین عالی	ص ۶۲
۵۱۔	ماہنامہ۔ چہار سو	راولپنڈی نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء	ص ۴۲
۵۲۔	شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	ص ۷۲۱
۵۳۔	ایضاً	ایضاً	ص ۷۲۲
۵۴۔	ہم قلم	سالگرہ نمبر ۱۹۶۱ء	ص ۲۲۰
۵۵۔	شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	ص ۷۲۲
۵۶۔	ایضاً	ایضاً	ص ۷۵۹
۵۷۔	ایضاً	ایضاً	ص ۷۵۹
۵۸۔	ایضاً	ایضاً	ص ۷۵۰
۵۹۔	ایضاً	ایضاً	ص ۷۵۹
۶۰۔	پیشہ ورانہ خدمات	از جمیل الدین عالی	ص ۵
۶۱۔	ایضاً	ایضاً	ص ۵

۶۲۔	ایضاً	ایضاً	ص ۶
۶۳۔	1989PhD		
۶۴۔	پیشہ ورانہ خدمات از جمیل الدین عالی		ص ۸۔۹۔۱۰
۶۵۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۰تا۱۲
۶۶۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۲۔۱۳
۶۷۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۶
۶۸۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۷تا۱۹

باب دوم

حالی کی شاعری کا پس منظر

۱۸۵۷ء کا سال برصغیر کی سیاسی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کے نتیجے میں برصغیر ہندو پاک پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوگئی اور ہوا کا رخ متعین ہوگیا اس فیصلہ کن صورتحال کے بعد دو ہی راستے رہ جاتے تھے یا تو انگریزوں کے خلاف ایک مسلح جدوجہد کی جائے جو ماضی کی طرح ایک بار پھر ناکام ہو یا پھر حقیقت کو تسلیم کر کے انگریزی عملداری کو قبول کر لیا جائے ۔ اور زندگی کو نئے حالات کے تحت ڈھالا جائے ۔ سرسید اس دوسرے نقطہ نظر کے نقیب تھے ۔ انہوں نے مسلمانوں کو نئی صورتحال سے آشنا کرانے کی جدوجہد کی ۔ مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کرنے اور انگریزی علوم کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ۔ مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ تقلید و جمود کے راستے کو چھوڑ کر نیا طرز زندگی اپنائیں ۔ یہی "علی گڑھ تحریک" تھی جس کے لئے سرسید نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ان کی مخالفت بھی کی گئی لیکن بالآخر وہ "مسلم اورینٹیل کالج ۱۸۷۵ء علی گڑھ میں قائم کرنے اور مسلمانوں کو نئی ڈگر پر لانے میں کامیاب ہو گئے ۔ (۱)

بیسویں صدی کا آغاز ایک ایسی فضا میں ہوا جب انگریز برصغیر میں مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے تھے ۔ اب ان کا انتظامی مقصد انگریزوں کو دیسی زبان سکھانا بھی نہ رہا تھا بلکہ سازگار فضا میسر آجانے کے سبب وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو بڑے پیمانے پر انگریزی زبان اور مغربی علوم سے آشنا کیا جائے چنانچہ دیسی زبانوں میں انگریزی تعلیم کی ترویج و اشاعت پر زور دیا گیا تاکہ ایسا طبقہ میسر آسکے جو ہندوستانی ہوتے ہوئے انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو ۔ دہلی کالج کا قیام بھی اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور اسی کالج سے پڑھ کر نکلنے والے ابتدائی لوگ یہی کام انجام دے رہے تھے ۔

ادھر برصغیر کے لوگ تصور آزادی کی نعمتوں سے آشنا ہو رہے تھے اور اس کے خواہش مند تھے ۔ ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگریس" کا وجود عمل میں آچکا تھا ۔ (۲) ۳۰، دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے بھی اپنے مخصوص مسائل کے حل کی جدوجہد کیلئے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی ۔ (۳) اس طرح برصغیر میں آزادی کی جدوجہد بھی شروع ہوگئی ۔ ہندوستان کی تحریک آزادی مشترکہ طور پر چل رہی تھی ۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات الگ الگ تھے اس لئے کبھی کبھی مفادات کا ٹکراؤ ہو جاتا تھا ۔ مسلم لیگ کا قیام بھی اسی لئے عمل میں آیا تھا ۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ نے بنگالی مسلمانوں کی پس ماندگی کے پیش نظر یہ مطالبہ کیا کہ بنگال کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ۔ جو ہندو اور مسلم اکثریت پر مشتمل ہوں تاکہ مسلمانوں کو تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے بہتری کے مواقع حاصل ہو سکیں لیکن کانگریس نے اس تقسیم پر شدید رد عمل کا اظہار کیا اور ۱۹۱۱ء میں یہ تقسیم منسوخ کروا کر ہی چین سے بیٹھے ۔ اس واقعہ نے ہندو مسلم اضطراب کو زیادہ شدید کر دیا ۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کی تحریک آزادی مختلف سمتوں میں کام کرنے لگی ۔ (۴)

جنگ عظیم اوّل ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی ۔ اس جنگ کی تباہ کاریوں نے جہاں ترکی کو شکست آشنا کیا وہیں انگریزی اقتدار کی جڑیں کاٹ ڈالیں ۔ جنگ عظیم اوّل میں ترکی انگریزوں کے خلاف محاذ آراء تھا اور امکان

یہ تھا کہ اگر اس جنگ میں ترکی کو شکست ہوئی تو جہاں ایک طرف سلطنت ترکی کے حصے بخرے ہوں گے وہیں سلطان ترکی کی حیثیت بھی متاثر ہوگی جو اس وقت تک برائے نام ہی امیر المومنین سمجھا جاتا تھا چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں نے انگریزوں سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر جنگ میں ترکی کو شکست ہو بھی جائے تو خلافت کا خاتمہ نہ کیا جائے۔ یہ بظاہر ایک عجیب وغریب مطالبہ تھا کیوں کہ کوئی بھی فاتح مفتوح کی شرائط پر امن قائم کرنا پسند نہیں کرتا لیکن ہندوستانی مسلمان یہ احمقانہ مطالبہ کر رہے تھے اور اسی مطالبے کو لے کر انہوں نے تحریک خلافت شروع کی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کے اس مطالبے کی پرزور حمایت کی اور برصغیر کی سیاست میں ایک بار پھر ہندو مسلم شیر وشکر ہو گئے۔ لیکن اقبال نے "دریوزہ خلافت" لکھ کر مسلمانوں کے اس موقف سے اپنے طور پر اختلاف کیا۔ لیکن ابھی جنگ عظیم ختم نہیں ہو پائی تھی کہ خود ایک ترکی جرنیل مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنے طور پر خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ جنگ عظیم ختم ہوئی تو ترکی شکست خوردگان میں شامل تھا۔ انگریزوں نے بڑی ذلت آمیز شرائط پر ترکوں سے صلح کی تھی۔ اردن، عراق، شام، لیبیا، سعودی عرب اور خلیج کی ریاستیں اس معاہدے کے تحت ترکی سے الگ ہو گئیں۔ اور ترکی کی سلطنت سمٹ کر اپنی سرحدوں تک محدود رہ گئی۔ (۵)

۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا جس کا مقصد ہندوستانی سیاست کو مجرمانہ سازشوں سے پاک کرنا تھا۔ اسی رولٹ ایکٹ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں ہونے والے جلسے کے خلاف انتہائی سنگین قدم یہ اٹھایا کہ جنرل ڈائر نے بڑی بے دردی سے جلیانوالہ باغ کے جلسے کو سیاسی سازش کا نام دے کر فائرنگ کی اور وہاں موجود ہزاروں انسانوں کو مچھر اور مکھیوں کی طرح مارا گیا۔ (۶) رولٹ ایکٹ کے بعد اس سانحے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل یہ ہوا کہ اگست ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات شروع ہوئی۔ (۷) ترکِ موالات کی اس تحریک پر قابو پانا انگریزوں کیلئے کافی مشکل ہو گیا تھا لیکن جب مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں ازخود خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا (۸) تو ہندوستان میں تحریک خلافت بے معنی ہو کر رہ گئی اور لوگوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی کیوں کہ ترک موالات کے دوران بہت سے لوگوں نے اپنے خطابات واپس کئے تھے۔ اپنی نوکریاں چھوڑ دی تھیں اور بعض تو ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے تھے۔ یہ غیر معمولی اور بڑھا ہوا جوش وخروش جب یکدم ختم ہوا تو جو دھچکا مسلمانوں کو لگا ہوگا وہ بیان سے باہر ہے۔ بہر حال اس صورتحال نے مسلمانوں کو ایک عام بے سروسامانی اور بے چارگی میں مبتلا کر دیا۔

جنگ عظیم اوّل کے خاتمے نے ہندوستانیوں میں ایک بے چینی پیدا کر دی۔ وہ مایوس ہو چکے تھے۔ وہ افراد جو فوج سے وابستہ تھے اور دور دراز علاقوں میں برطانوی استحکام کیلئے لڑتے رہے، اپنی جانیں گنوارتے رہے۔ ان کے اہل وعیال محرومیوں کا شکار ہو گئے جو بچ گئے وہ یہ سوچتے تھے کہ آخر وہ کس مقصد کیلئے جان دے رہے ہیں وہ تو صرف کرائے کے سپاہی تھے جو محض تنخواہ کیلئے اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔ مایوسی کے اس احساس نے انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ شدید

کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک اور قابلِ ذکر واقعہ جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا وہ روس میں مارکسی انقلاب تھا۔ ۱۹۱۹ء میں لینن کی سربراہی میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا اور زار روس اور اس کے خاندان کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ (۹) آسودہ حال اور اہم عہدوں پر فائز افراد کو قتل کر دیا گیا، جلاوطن کیا گیا یا سائبیریا میں موسم کی صعوبتیں اٹھانے کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ یہ دراصل بورژوا طبقے کو قوت سے کچل دینے کے کمیونسٹ فلسفے کا اظہار تھا۔ اس طرح لینن نے مزدوروں اور کسانوں کی آقائی کا اعلان کیا اور ایک ایسے معاشرتی تشکیل کی نوید سنائی جس میں سب انسانوں کا تقسیم زر بھی برابر ہو اور ترقی کے مواقع بھی یکساں ہوں۔

کچھ ہندوستان کے سپاہی اس مارکسی انقلاب میں روسیوں کے ساتھ ساتھ شریک رہے اور جب یہ سپاہی ہندوستان واپس آئے تو ان کے دل اور ذہن اس اشتراکی تحریک کے اثرات سے بھرپور تھے برطانوی حکومت کی ناانصافیوں اور ظلم واستبداد کے آگے یہ اشتراکی تحریک ہندوستانیوں کیلئے روشنی کی کرن تھی۔

یوں تو پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد ہی ہندوستان میں اشتراکی فضا در آئی تھی لیکن یہ دور تحریکِ خلافت کی ناکامی کا دور تھا۔ سیاسی صورتحال منجمد ہو کر رہ گئی ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن نے اس جمود کو توڑا۔ (۱۰) یہ کمیشن سر جان سائمن کی سربراہی میں منعقد کیا گیا۔ اس کے تمام ارکان انگریز تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اس کمیشن میں کوئی نام ونشان نہ تھا اور یوں سوائے پنجاب کے پورے ہندوستان کے ہندو اور مسلمان اس سائمن کمیشن کے مخالف ہو گئے۔ ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ تھیں۔ ہندوؤں کی جماعت کانگریس کے سربراہ جواہر لال نہرو تھے اور مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کے سربراہ مسٹر جناح تھے۔

۱۹۲۸ء میں کانگریس نے موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک رپورٹ مرتب کی جس کا نام نہرو رپورٹ رکھا گیا۔ (۱۱) یہ رپورٹ صرف اور صرف ہندوؤں کے مفاد میں تھی لہٰذا مسلم لیگ نے اس کا بائیکاٹ کیا اور اس کے جواب میں قائد اعظم نے چودہ نکات پیش کئے جو کہ کانگریس کیلئے قابل قبول نہ تھے اور یوں ہندوستان قومی اتحاد سے محروم رہا اور کسی قوم نے اُسے تسلیم نہ کیا۔ پورے ہندوستان میں فتنہ وفساد کی سرگرم فضا پیدا ہو گئی۔ ۱۹۲۹ء میں لارڈ ارون نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی منزل مقصود نوآبادیات ہے اور حکومت ہندوستان کی سیاسی صورتحال متوازن کرنے کیلئے ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے کیلئے تیار ہے۔ (۱۲) کانگریس پارٹی چاہتی تھی کہ نہرو رپورٹ کی منظوری کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کی جائے جب کہ مسلم لیگ اس حق میں نہ تھی۔ حکومت نے ان سیاسی جماعتوں کی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں نظر انداز کیا اور ہندوستان کی دوسری جماعتوں کے تعاون سے ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد کی۔ (۱۳) اس کانفرنس میں مسلمانوں اور ہریجنوں (اچھوتوں) کیلئے جداگانہ طریقہ انتخاب کی منظوری دے دی گئی۔ نہرو رپورٹ کے مسترد کئے جانے پر کانگریس نے احتجاج کے طور پر نمک سازی کے قانون کو توڑ کر سول نافرمانی کا آغاز کیا۔ جس کے نتیجے میں کانگریس

کے لیڈران کو گرفتار بھی کیا گیا۔ (۱۴) اس تمام صورتحال کے بعد ہی کانگریس نے ۱۹۳۱ء میں کراچی کے اجلاس میں باقاعدہ اشتراکیت کی حمایت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گاندھی جی نے ہندوؤں اور اچھوتوں کو الگ الگ کرنے پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور احتجاجاً مرن برت شروع کیا۔ گاندھی جی کا یہ مرن برت سنگین صورتحال اختیار کر گیا لیکن حکومت کسی قسم کے تعاون کیلئے تیار نہ تھی۔ بالآخر ڈاکٹر امبید ے اعلان کیا کہ ہریجن خود رضا کارانہ طور پر جداگانہ حق رائے دہی سے دست بردار ہوتے ہیں۔ (۱۵) یہ فیصلہ تمام سیاسی جماعتوں نے خوش دلی سے قبول کر لیا اگرچہ مسلم لیگ ہریجنوں کو ہندو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی مگر جب خود ہریجن اس کیلئے تیار ہو گئے تو مسلم لیگ کو کیا اعتراض ہوتا۔ ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کا نفاذ ہوا اس ایکٹ کے دو بڑے جز و یعنی وفاقی اور صوبائی حصے تھے۔ وفاقی حصہ اختلاف کا باعث بنا کیوں کہ اس میں تمام اختیارات گورنر جنرل برائے ہند کو دیئے گئے۔ (۱۶) یوں وفاقی حصے کو مسترد کر دیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں اس ایکٹ کی رو سے صوبائی حصے پر عملدرآمد کر کے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ اکثر صوبوں میں کانگریس کو بھرپور کامیابی ہوئی اور مسلم لیگ کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔

کانگریس نے اپنی فتح کے زعم میں ہندوستان کے ایک بڑے طبقے مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا اور ہندوستان کی ان جماعتوں کو عہدے دیئے گئے جو مسلمانوں کیلئے غیر اہم تھے۔ نہ صرف یہ کہ انھیں وزارتوں سے دور کیا گیا بلکہ ان کے مذہبی اور تہذیبی حقوق کو بھی پامال کیا گیا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتائج میں جو صوبائی حکومتیں بنیں وہ کانگریسی تھیں۔ ان حکومتوں نے جو رویہ اختیار کیا اور جس طرح کھل کھیلیں اس سے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں میں بڑی بد دلی اور خوف پیدا ہوا۔ واردھا اسکیم کے تحت تعلیم کو جس طرح ہندوایا گیا اور اکثریت کے بل بوتے پر جس طرح مسلم تہذیب و تمدن اور مذہب و زبان کو پامال کیا اس سے مسلم رہنماؤں اور عوام کو یقین ہو گیا کہ آزاد ہندوستان میں ہندو اکثریت ان کا نام و نشان مٹا دے گی۔ کانگریس کی وزارتیں قائم ہوئے ابھی ایک دو سال ہی گزرے تھے کہ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور یوں دوسری جنگ عظیم کی ابتداء ہوئی اس جنگ میں برطانیہ اور فرانس کے علاوہ امریکہ اور روس بھی برطانوی اجلاس میں شامل تھے۔ دوسری طرف جرمنی، اٹلی اور جاپان کی قومیں بھی دنیا کی عظیم قوتوں سے برسرِ پیکار تھیں۔ اس موقع پر گاندھی جی کا موقف یہ تھا کہ اس وقت انگریزی حکومت کو چھیڑنا مناسب نہیں اور جنگ میں ان کی پوری پوری حمایت کرنی چاہئے لیکن خود کانگریس نے بھی ان کے اس موقف کو تسلیم نہ کیا اور ۱۹۴۰ء کے بمبئی اجلاس میں کانگریس نے ایک قرارداد منظور کی کہ اگر حکومت برطانیہ یہ وعدہ کرے کہ جنگ کے بعد وہ ہندوستانیوں کو موثر اختیارات دے گی اور بالآخر اسے آزاد کر دے گی تو کانگریس برطانیہ کی حمایت کرنے کو تیار ہے۔ (۱۷) پھر مسلم لیگ چونکہ کانگریسی حکومتوں کی زخم خوردہ تھی اس لئے اس نے مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے جن حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انھیں ایک علیحدہ ملک قرار دے دیا جائے (ہندوستان سے باہر بننے والی) اور مجوزہ ملک کا نام پاکستان پڑا۔

تیسرا عنصر سوباش چندر بوس کی آزاد ہند فوج تھی جو کسی صورت انگریزی بالادستی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ وہ اپنی فوج کے ساتھ جاپان روانہ ہو گئے تاکہ جرمنی اور جاپان کی فوجی امداد کر سکیں۔

جنگ جاری تھی اور انگریزوں کو جرمنوں کے ہاتھ بڑی ہزیمتیں اٹھانی پڑ رہی تھیں۔ ادھر جنوبی ایشیا میں آزادی کی تحریک میں نہایت جوش اور ولولہ آ گیا تھا۔ کانگریس نے ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلا کر برطانوی حکومت کیلئے بڑے مسائل پیدا کر دیئے لیکن برطانیہ ہندوستان پر اپنی حکمرانی قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ جنگ ختم ہوئی تو برطانیہ میں نئے انتخابات ہوئے اور "قدامت پسند" وزیراعظم چرچل کی تمام ذہانت اور اس کی خدمات کے باوجود برطانیہ میں لیبر پارٹی برسراقتدار آئی یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ جنگ نے فتح کے باوجود برطانیہ کی کمر توڑ دی ہے اور اس کے قدم ڈانواں ڈول ہیں۔ ایٹلی نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا عندیہ دیا چنانچہ ایک وزارتی مشن بھیجا گیا جس کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کو ایک یونین بنایا جائے صوبوں کو علیحدگی کا اختیار حاصل ہو اور مرکز میں عبوری سیاسی حکومت قائم کی جائے جس میں تمام قابل ذکر گروہوں کی نمائندگی حاصل ہو۔ (۱۸) ان مقاصد کے حصول کیلئے ۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن شاہی خاندان کے فرد تھے اور جنگ کے دوران برما کے محاذ پر اپنی جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اگرچہ برطانیہ کا منصوبہ تھا کہ ہندوستان کو ۴۸ء تک آزاد کر دیں لیکن ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے ہندوستان کی آزادی کیلئے بڑے تیز رفتار اقدامات کئے اور یوں ۱۴، اگست اور ۱۵، اگست کو پاکستان اور ہندوستان کی مملکتیں وجود میں آ گئیں۔ (۱۹)

لیکن آزادی کا یہ حصول اتنا سادہ نہ تھا۔ حیدرآباد، جوناگڑھ، مانادوی کشمیر کے مسائل الجھن اور کشمکش پیدا کرنے کیلئے کافی تھے۔ پورے جنوبی ایشیاء میں بڑے پیمانے پر ظالمانہ اور وحشیانہ فسادات نے نہ صرف زندگی کو دشوار بنا دیا بلکہ دونوں مملکتوں کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دیئے جو آسانی سے حل نہ ہو سکتے تھے۔ بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری، آتش زنی، اغوا اور آبرو ریزی نے زندگی سے انسانوں کا اعتماد اٹھا دیا۔ کروڑوں افراد بے گھر اور جلاوطن ہو گئے۔ ان میں بیشتر اپنے پیاروں سے جدا ہو گئے۔ وطن اور رشتے داروں کی جدائی کے زخم ایک پوری نسل کیلئے تاحیات نہ مٹنے والے زخم تھے۔ پاکستان کیلئے خصوصاً نئی مملکت کے قیام، مہاجرین کی آبادکاری اور قبائلی علاقوں میں نظم و نسق اور حکمرانی کے تصورات کو بیدار کرنا بڑے مسائل تھے۔ پاکستان کا وجود ان مسائل کے ساتھ عمل میں آیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے جہاں دیگر سیاسی، معاشی، معاشرتی امور میں تبدیلی پیدا کی وہاں ادبی معیار کو جس نئی جہت سے متعارف کروایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ادب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور کو ادبی تاریخ میں نظر انداز کرنا اردو ادب کے ساتھ ناانصافی کی بات ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے نتیجے میں مسلمان معاشی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی، تعلیمی غرض ہر لحاظ سے پس ماندہ ہو چکے

تھے۔سرسید احمد خان اس تاریکی میں روشنی کی کرن ثابت ہوئے۔سرسید وہ واحد شخص تھے جو مسلمان قوم کو ایک زندہ قوم کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔انہوں نے اپنے اس مقصد کو ایک تحریک کی شکل دے کر "علی گڑھ" تحریک کے نام سے منسوب کیا۔اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ایک زندہ قوم بنانا تھا چنانچہ اس مقصد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے سرسید کے رفقاء کار نے ادب میں جدیدیت کو متعارف کروایا۔نثر اور شاعری کی اصناف کے ذریعہ ادب کو کلی طور پر زندگی سے قریب تر کر دیا گیا۔اس تحریک سے وابستہ حالی نے شاعری میں حقیقت پسندی کو فروغ دیا (۲۰) اور، مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر شاعری کو ایک نئی کروٹ دی غزل کو حسن و عشق کے موضوعات تک محدود نہ رہنے دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسدس "مدوجزر اسلام" لکھ کر نظم نگاری کی تاریخ میں ایک کارنامہ انجام دیا۔حالی کی منظوم تصانیف میں مثنویاں، مسدس حالی، شکوہ ہند، مناجات بیوہ اور چپ کی داد وغیرہ اہم ہیں۔سرسید احمد خان کو ادب میں جدیدیت کو فروغ دینے میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی اس کامیابی میں ان کے اصلاحی نقطہ نظر نے اہم کردار ادا کیا۔

ادب میں جدید اردو شاعری کے آغاز کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد کے سر ہے۔انھوں نے میجر فلر کی رہنمائی میں ایک انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے قائم کی۔(۲۱) یوں تو اس انجمن کے مقاصد وسیع تھے لیکن اس تحریک انجمن کو کامیاب بنانے میں ۱۸۷۴ء سے ۷۵ سے منعقد ہونے والے مشاعروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ان مشاعروں میں جدت کا نقطہ یہ تھا کہ مصرعہ طرح دینے کے بجائے اب ایک خاص موضوع مقرر ہوتا جس کے مطابق شعرأ کو اصلاحی موضوعات پر مختصر نظمیں لکھنے کیلئے کہا جاتا۔(۲۲) یہ مشاعرے اپنی انفرادیت کی بنا پر خاصے مقبول ہوئے آزاد اور حالی نے ان مشاعروں کو بامقصد اور کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس دور میں آزاد اور حالی کا مقصد ایک ہی تھا اور دونوں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔شاعری میں حقیقت پسندی کے رجحان کے مخالفین بھی پیدا ہوئے لیکن یہ آزاد اور حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی ثابت قدمی تھی کہ وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول کیلئے کوشاں رہے اس تحریک سے وابستہ افراد میں شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کا ذکر بھی آتا ہے لیکن یہ لوگ بہت کم وقت اس سے وابستہ رہ سکے۔(۲۳) اس انجمن کے سرکردہ رہنماؤں کے ابتدائی موضوعات اخلاقی اقدار اور مناظر فطرت تھے۔آہستہ آہستہ عوام الناس کی دلچسپی کے باعث موضوعات کو وسعت دی گئی۔حالی کی مسدس "مدوجزر اسلام" اسی دور کی پیداوار ہے۔آزاد نے اخلاقی نظمیں لکھیں اور اسمٰعیل میرٹھی نے انگریزی نظموں کے تراجم لکھنا شروع کئے اس کے علاوہ شرر نے نظم، طباطبائی اور اکبرالہ آبادی نے بھی یہی راہ اختیار کی اور یوں اردو ادب کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں ان لوگوں نے اہم کارنامہ انجام دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں سرسید تحریک ماند پڑ چکی تھی تاہم اس تحریک کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔اور وہ آزادی کی جدوجہد میں سرگرداں ہو گئے تھے۔اس فضا کو شاعروں نے محسوس کیا۔حالی کی "حب وطن "چکبست کی "خاک ہند" اقبال کی "نیا شوالہ" اور "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اسی احساس کی پیداوار ہے۔(۲۴) اس دور میں شاعروں کے ہاں

وطنی رجحان اس قدر شدید ہو گیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے ہندوستان کے شہروں، دریاؤں، وادیوں، کو اپنے تخیل کی بدولت حسن و جمال کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ جدید شعراء نے آزادی کے جذبہ میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے کیلئے تاریخی موضوعات کو قلم بند کرنا شروع کیا۔ اس کا آغاز حالی کی مسدس "مدوجزر اسلام" سے ہوا اور پھر شبلی کی نظم "عدل جہانگیری" چکبست کی "رامائن کا ایک سین" اقبال کی "محاصرہ" اور جنگ یرموک کا واقعہ، اور جوش کی" حسین اور انقلاب " جیسی شاہکار نظمیں وجود میں آئیں، اسی دور میں حفیظ جالندھری کا قابل قدر کارنامہ "شاہنامہ اسلام" ہے۔

تحریکِ خلافت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات اور واقعات کا اثر شاعروں کے ہاں بھرپور نظر آتا ہے مثلاً اقبال کی "دریوزہ خلافت" اہم ہے رولٹ ایکٹ کا نفاذ مارشل لاء اور جلیانوالہ باغ کا حادثہ ایسے واقعات تھے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا ردعمل اقبال کی نظم "خضر راہ" ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نظم "طلوع اسلام" وغیرہ یہ نظمیں جابر حکمرانوں کی ظلم و ستم کی داستان پیش کرتی ہیں۔ جوش چکبست اور ظفر علی خان کی شاعری بھی ان سیاسی حالات سے متاثر ہوئی۔

جنگ آزادی کو کامیاب بنانے کیلئے معاشرتی اصلاح بہت ضروری تھی۔ اس وقت معاشرے کی اصلاح کا اہم پہلو یہ تھا کہ مسلمان قوم کو مغربی تہذیب سے بچایا جائے اور مسلمان صرف اور صرف مذہبی اقدار کا تقدس، برقرار رکھیں۔ نوجوانوں کی بے راہ روی کی سب سے بڑی وجہ انگریزی زبان کو سمجھا جا رہا تھا کہ انگریزی زبان بولنے سے نئی نسل مغرب پسند ہو رہی تھی اور یہ بڑی حد تک درست بھی تھا چنانچہ اس رجحان کو روکنے میں اکبرالہٰ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اردو شاعری میں مزاح کا عنصر برقرار رکھتے ہوئے معاشرے کی اصلاح اور اپنی تہذیب سے اپنائیت پر جس طرح زور دیا ہے۔ وہ صرف ان ہی کا حصہ ہے۔ اقبال نے بھی اکبرالہٰ آبادی کے اصلاحی نقطہ نظر کی حمایت کی اور اپنی شاعری میں قوم کو متحرک رہنے اور انہیں اپنی ذات سے آگاہی کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ جدید شاعری کا ایک بڑا حصہ ہے۔

رومانوی تحریک:

علی گڑھ تحریک نے جدید اردو ادب کی داغ بیل ڈالی۔ ادب کو حقیقی زندگی سے قریب کر کے با مقصد بنایا پھر ہر تخلیق اس زاویئے سے منظر عام پر آئی کہ اس میں کسی نہ کسی اصلاحی عنصر کا ہونا ضروری تھا۔ مقصدیت اور اصلاح اپنی جگہ اہم سہی مگر جب ادب واعظ خشک کی تقریر غیر دل پذیر بن جائے تو اکتاہٹ پیدا ہونا لازمی ہے۔ ادب کا جمالیاتی تقاضوں سے کسی طور منہ نہیں موڑا جا سکتا ہے چنانچہ اس یکسانیت، خشک روی، بے لطفی کے خلاف بے چینی پیدا ہونے لگی۔ اس کلاسیکی رجحان کا ردعمل یہ ہوا کہ ادب میں لطف و سرور، حسن و جمال کا عنصر پیدا کرنے کیلئے رومانی ادب تخلیق کیا جانے لگا۔

رومانیت، کلاسیکیت کے ردعمل کا نام ہے۔ کلاسیکیت سے مراد توازن، تعقل پسندی، اصولوں اور حد بندیوں کا نفاذ ہے۔ جبکہ رومانیت ان اصولوں اور حد بندیوں کے خلاف ردعمل ہے۔ کلاسیکیت اور رومانیت کے اس تصور کو انگریزی ادب

نے متعارف کروایا لیکن اردو میں یہ رجحان محض انگریزی ادب کے مطالعے کا مرہون منت نہیں اس سلسلے میں سرسید تحریک کی حد سے بڑھی ہوئی مقصدیت بیسویں صدی کے آغاز سے ہی عوام میں جذبہ آزادی اور جنگ عظیم اوّل کے دوران کے حالات بھی یکساں ذمہ دار ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی عوام میں جذبہ آزادی بڑے جوش وخروش سے پیدا ہو گیا تھا۔ حالات کے مطابق نئی نسل انگریزی زبان سے بھی بڑی حد تک واقف ہو گئی تھی چنانچہ انگریزی ادب ان کے زیر مطالعہ رہا۔ دوسرے یہ کہ طلباء کی کچھ تعداد تعلیم کی غرض سے یورپ گئی اور جنگ کے دوران بھی لا تعداد لوگ جنگی مقاصد کیلئے ملک سے باہر گئے، یہ لوگ مغربی ماحول میں رہ کر ان کے نظریات سے متاثر ہوئے ان کی آزادی کی تحریکوں کا مطالعہ کیا اور اپنے ساتھ ایک کامیاب قوم کی ترقی کے راز زندگی کے اصول نظریات اور طرز فکر لے کر ہندوستان آئے۔ حکومت وقت ہندوستانی عوام کے دلوں میں موجود جذبہ آزادی کو دبانے کیلئے جو حربے استعمال کر رہی تھی وہ ہندوستانی عوام کو جذباتی لحاظ سے مجروح کر دینے کیلئے کافی تھے۔ جنگ عظیم اوّل کی تباہ کاریاں تحریک خلافت اور جلیانوالہ باغ جیسے دل دوز واقعات کے دور میں سرسید تحریک کا اصلاحی ادب ناموزوں ہو چلا تھا۔ یہ دور جذبہ آزادی کا دور تھا۔ عوام کے دلوں میں سے جمود کی کیفیت ختم کر کے ان میں زندگی کی رمق پیدا کرنا تھی۔ جذبہ آزادی کے اس دور میں عوام کے دلوں میں سے غم وغصہ، رنج وغم، اور مایوسی کی فضا کو ختم کرنے کیلئے ضروری تھا کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو انھیں لطف وانبساط بھی فراہم کر سکے۔ ان کے دماغ کو ہی متحرک نہ کرے بلکہ دل کے تاروں کو چھونے کا فریضہ انجام دے چنانچہ ان عوامل کے تحت اردو ادب میں مغربی ادب کا عطا کردہ رومانوی تاثر پیدا ہونا شروع ہو گیا اور ایک رومانوی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ اس تحریک کے بانیوں کی رسائی انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں تک بھی تھی اور وہ دوسرے ممالک کے ادب کے مطالعے سے روشنی حاصل کرتے تھے۔ اردو نثر میں رومانیت کی ابتداء ترکی تراجم سے ہوئی۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی ادبیات میں بہت زیادہ دلچسپی لی اور تراجم کے ذریعہ ترکی کے رومانی ادب سے اردو کو روشناس کرایا۔ اس کے علاوہ ماضی پرستی نے بھی رومانیت کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔ لوگوں نے ماضی کی روایات کو برقرار رکھنا اس دور کی اہم ضرورت سمجھا کیونکہ ماضی پرستی رومانیت کیلئے بڑی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں رومانیت کی جھلک ہمیں سب سے پہلے اقبال کے ہاں نظر آتی ہے۔ اقبال کی شاعری کو رومانیت کا نام تو ہرگز نہیں دیا جا سکتا البتہ وہ بعض ایسے موضوعات اس طرح پیش کرتے ہیں جو رومانیوں کا رویہ ہے۔ مثلاً حسن فطرت سے لطف اندوزی کی نظموں میں والہانہ سرمستی، کیف دوام، سرخوشی اور سرشاری کی کیفیت نمایاں ہے۔ اقبال کے کلام میں خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال اُنھیں رومانیت سے قریب لے آتا ہے۔ (۲۵)

اقبال کے بعد حفیظ جالندھری کی شاعری فطری جمال ایک نغمگی صورت میں ابھرتا نظر آتا ہے۔ حفیظ کی غنائیت آگے چل کر ہمیں عاؔلی کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ اس دور کے ایک اور اہم شاعر جوؔش ملیح آبادی ہیں دیگر رومانوی شعراء کی

طرح ان کے ہاں فطری حسن و جمال خاص اہمیت رکھتا ہے تاہم ان کے ہاں جذبہ اظہار کی قوت ان کے رومانی شاعر ہونے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بیک وقت شاعرِ شباب بھی ہیں اور شاعرِ انقلاب بھی۔ (۲۶) جوش کی رومانیت میں فرد کی داخلیت اہمیت نہیں رکھتی وہ خارجی حسن کو ہی اپنے جذبے اور احساس سے تخیل کی بلندی عطا کرتے ہیں۔ جوش کی شاعری میں حسن و جمال، انقلاب، عشق، حسین مناظر کی تصویر کشی وغیرہ جیسے موضوعات رومانی اثرات سے بھرپور نظر آتے ہیں۔

اسی دور کے ایک اور شاعر عظمت اللہ خان کا شمار بھی رومانی شعراء میں ہوتا ہے۔ عظمت اللہ خان نے اردو نظم میں نئے نئے تجربے کئے ہیئت کے بھی تھے اور عروض کے بھی۔ ان کی غنائیت بڑی حد تک داخلی ہے جسے انہوں نے گیت نگاری سے ہم آہنگ کر کے ایک رومانی انداز بیدار کر دیا ہے۔ عظمت اللہ کے اس رومانوی انداز نے نظم میں داخلیت کی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی رومانیت موجود حقیقت کو منقلب کرنے اور نئے افق تلاش کرنے پر فرد کو آمادہ کرتی ہے۔ اختر شیرانی رومانی تحریک کا ایک بہت بڑا نام ہے ان کا شمار اس تحریک کے ابتدائی اور بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔ اختر کے نزدیک عورت یا نسوانیت ہی کائنات کی حسین ترین شے ہے۔ وہ دنیا کے تمام اچھے نام اور خوبصورت الفاظ عورت کیلئے استعمال کرتا ہے۔ اختر جیتی جاگتی گوشت پوست کی عورت کے شیدائی ہیں مگر وہ اس کے تقدس کے قائل ہیں وہ عورت کے پجاری ہیں۔ اختر کا ایوانِ زندگی سلمٰاؤں، عذراؤں اور ریحاناؤں کے رومانوی، شراب کی سرمستیوں، سگریٹ کے مرغولوں، احباب کی خوش گپیوں اور حسن و عشق کے دل گداز افسانوں سے مزین نظر آتا ہے۔ (۲۷) اس رومانی تحریک کے دیگر شعراء میں حامد اللہ افسر، روشن صدیقی، ساغر نظامی، احسان دانش، الطاف مشہدی وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں ان شعراء کی بدولت رومانوی تحریک کے آغاز و ارتقاء میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی اور یہ تحریک بامِ عروج تک پہنچی۔

ابوالکلام آزاد ایک ایسے نثر نگار ہیں جس کی نثر رومانوی انانیت، تخیل کی فراوانی اور شدت جذبات کا اعلیٰ ترین اظہار ہے۔ ابوالکلام آزاد کی نثر ان کی انفرادیت کی ترجمان ہے ان کی خودداری اور حد درجہ کی انانیت انھیں بہترین نثر نگار بناتی ہے۔ ابوالکلام آزاد کی نثر میں وہ روانی ہے جو چڑھتی ندیوں میں ہوتی ہے۔ وہ آہنگ ہے جو نثر کے بجائے نظم کا خاصہ ہے۔ وہ تخیل پسندی ہے جو رومانیت کی دین ہے۔ ان کے یہاں انانیت اور انفرادیت کی جو بلند آہنگی نظر آتی ہے اور جس طرح وہ لفظ "میں" کا استعمال کرتے ہیں اردو ادب میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ یہ بے باکی اور بلند آہنگی مولانا کو ایک اہم رومانی نثر نگار بناتے ہیں۔

محمد حسین آزاد حقیقی رومان کے پروردہ ہیں حال انھیں متاثر نہیں کرتا وہ افسردگی، مایوسی، تاریکی، ناامیدی کے جذبوں کے ساتھ انفرادیت کا دامن تھامے ہوئے تخیل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے، ماضی پرستی کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ان کی انفرادیت پسندی کا رجحان مغرب کا عطا کردہ نہیں ہے لیکن ان کی شخصیت ان کی تصوراتی دنیا اور تخیل کا عنصر وغیرہ مشرقی ہے۔

اس دور میں نوجوان نسل جو مغربیت سے متاثر ہورہی تھی ٹیگور، اقبالؔ اور آزادؔ کی نثر نے انفرادیت پرستی کا رجحان عام کر کے نوجوانوں کو شخصیت اور انفرادیت کی خوبی سے متعارف کروایا۔ ان ادیبوں کی وجہ سے ادب میں جاذب نظر شخصیت اور حسن پرست کرداروں کا رجحان نظر آیا "مخزن" اور "نقاد" نے بھی اس خوبی کو عام کرنے اور جدید ذہنوں میں سمونے میں اہم کردار ادا کیا۔ مخزن میں لکھنے والے سرسید تحریک کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب سے سخت خائف تھے۔ انھوں نے حالیؔ اور آزادؔ کی طرح مشنری کے جوش اور مصلح کی تڑپ کو ادب کا موضوع نہیں بنایا۔ انہوں نے ادب میں حسن و جمال، تفریح، خوش مذاقی کا عنصر پیدا کیا۔ انہوں نے ادب کا صحیح معنوں میں جذبوں کا عکس قرار دیا۔ "مخزن" اور "نقاد" کے تمام مصنفین مغربی ادب خصوصاً آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کے انداز نگارش سے متاثر نظر آتے ہیں۔ "مخزن" میں چھپنے والے مضامین میں یلدرم کے مضامین کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے۔ ان مضامین کو رومانوی تحریک کا سب سے پہلا اور باقاعدہ اسلوب کہا جاسکتا ہے۔ رومانوی نثر نہ ہی انفرادیت پسندی سے عبارت ہے اور نہ افسردگی اور تنہائی کی دین ہے۔ بلکہ ان کے ہاں جو خوش مذاقی، حسن اور جذبے کی چاشنی ہے۔ وہ تازگی، شادابی، اور رنگارنگی کا بہترین عکاس ہے۔ یلدرم بحیثیت رومانوی افسانہ نگار خاص انفرادیت کے حامل ہیں افسانوں میں تخیل کی گہرائی اور جذبے کی فراوانی اُنھیں رومانوی ادیب بناتی ہے۔ یلدرم کا تخیل ارضی نہیں ماورائی ہے۔ ان کے مضامین حقیقتوں اور معاشرتی عوامل سے بے بہرہ ہیں۔ رومانوی افسانہ نگار یلدرم کے ہاں عورت حسن و جمال کا مجسمہ نہیں ہے۔ وہ عورت کو ہی کائنات کا نام نہیں دیتے اور نہ ہی ان کے نزدیک عورت عیاشی اور گناہ کا مظہر ہے بلکہ ان کے ہاں عورت خوش مذاقی کی دلیل ہے، لطف اور تفریح، اور صحت مند اور متحرک زندگی کے تصور کی علامت ہے۔ گویا وہ عورت کیلئے لفظ عزت کا تصور لاتے ہوئے اسے انسانیت، شعریت اور لطافت کا پیکر گردانتے ہیں۔ یلدرم کے مضامین ہوں یا افسانے وہ ہر جگہ ایک بہترین رومانوی ادیب نظر آتے ہیں۔ ان کی نثر جذباتیت، ماورائی حسن کی تلاش، تخیل کی فراوانی، عورت کا مخصوص اور منفرد مقام کا تعین وغیرہ ایسی خوبیاں ہیں جو انہیں بہترین رومانوی نثر نگار گردانتی ہیں۔

خلیقی کا شمار ان رومانوی ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تصوراتی دنیا میں رہتے ہوئے رومانیت کے ساتھ انصاف کیا۔ خلیقی کے موضوع نسائیت سے متعلق ہیں۔ ان کے نزدیک عورت اور عشق ملکوتی و ماورائی ہیں۔ ان کے جذبات ایک طلسماتی فضا رکھتے ہیں الہامی ہے گویا عام معنوں میں وہ غیر حقیقی فضا میں رہتے ہیں۔ رومانوی تحریک کی ایک بڑی خوبی یہی تصوراتی دنیا تھی اور اس تصوراتی دنیا نے نوجوان نسل کو اس طرح متاثر کیا کہ ان کے یہاں حسن اور عشق تخیلاتی و تصوراتی چیز بن گئے اور حقیقت سے ان کا واسطہ برائے نام ہی رہ گیا۔ ان رومانوی نثر نگاروں کی تحریروں کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں رومانوی تحریک سے پہلے عورت کا ذکر اتنے کھلے اور واضح الفاظ میں نہیں کیا جاتا تھا۔ خلیقی اور ان کے ساتھیوں نے نسائیت کو ادب کا موضوع خاص بھی بنایا اور اس اظہار میں بے باکی اور دلیری سے کام لیا۔

نیاز کی نثر زیادہ تر افسانوں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ماورائی کیفیت کی حامل ہے۔ ان کے کردار بھی ماورائی نوعیت کے ہیں۔ ان کے کرداروں کا اپنا لہجہ، زبان، اور انداز گفتگو ہے۔ نیاز اپنے کرداروں کی زبان کو بنا کر، سجا کر، سنوار کر بہت زیادہ ادبی زبان بنا دیتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارات کی بھرمار سے ان کی نثر ماورائی تاثر دینے لگتی ہے۔ مجنوں گورکھپوری اور نیاز ہم عصر ادیب ہیں مجنوں کے افسانے رومانیت کی ایک سلجھی ہوئی اور بھرپور تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں جذبے کی فراوانی اور مخصوص نوعیت کی قنوطیت انھیں رومانوی نثر نگار بناتی ہے۔ ان کے افسانوں کا اختتام دردانگیز ہوتا ہے۔ محبت ان کے نزدیک دکھ اور درد کی علامت ہے۔ وہ اس دکھ اور درد کو ہی زندگی کا نام دیتے ہیں۔ اور اس سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ ایک رومانوی نثر نگار ہونے کے ناتے ان کے کرداروں میں بھی تصور پرستی نظر آتی ہے۔ ان کے کردار خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ جن کی تعبیر مایوسی اور افسردگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مجنوں کے نزدیک محبت صرف اور صرف ناکامی کا نام ہے وہ محبت کو آسمانی جذبے کا نام دیتے ہیں اور زندگی سے اس کے تعلق کو برائے نام قرار دیتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی کے نزدیک محبت زندگی ہے۔ ان کی محبت تصوراتی ہے اور یہ تصوراتی محبت ان کے ہاں مرکزی مقام رکھتی ہے۔ ان کا رومانی تخیل بے ساختہ اور تخلیقی ہے۔ وہ فطرت میں خاص دلچسپی لیتے نظر آتے ہیں۔ ان کا لطف فطرت کا مرہون منت ہے وہ جس رومانی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ حقیقی نہیں ماورائی ہے وہ تصورات کی دنیا میں رہ کر اپنی رومانیت کا بہتر تاثر دیتے ہیں۔

مہدی افادی، قاضی عبدالغفار اور سجاد انصاری وغیرہ کو رومانی نثر میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ ان تمام ادیبوں نے رومانوی نثر کو رومانیت کے دور میں جو بلندی عطا کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ رومانوی تحریک میں اردو تنقید کے حوالے سے مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں جس تنقیدی جہت کو متعارف کروایا اس نے مستقبل کے تنقیدی زاویے کو وسعت دی آج تنقید کے میدان میں بڑے نام ان ہی افراد کے ہیں جنہوں نے رومانوی تحریک کے دور عروج کی تنقید کے طرز کو اپنایا ہے۔ رومانیت کی فضا ہندوستان میں کافی عرصہ تک قائم رہی اور اس نے لفظ، جذبہ اور خیال کی تمام جہتوں سے اردو ادب کو روشناس کرایا۔ اس سے نہ صرف نوجوان نسل کو خود آگہی کے جذبے سے روشناس ہوئی بلکہ تخلیقی ادب میں بھی گراں قدر اضافہ ہوا۔ رومانوی تحریک میں تخیل کی بلندی نے شاعری میں شعریت کو فروغ دیا اور جذبے کی فراوانی اور داخلیت کو اہمیت دی جانے لگی۔ موضوعات میں تنوع اور الفاظ و تراکیب میں جدت کا دائرہ وسعت اختیار کر گیا۔ رومانیت کا دور اگرچہ اردو میں مختصر رہا پھر بھی اس تمام عرصہ میں جہاں ادب اور معاشرے پر اس تحریک کے اچھے اثرات مرتب ہوئے وہاں کچھ ایسی خامیاں بھی پیدا ہونے لگیں جن کا مداوا ضروری تھا۔ رومانیت نے اصلاح فکر کے بجائے جذباتیت کو فروغ دیا۔ رومانوی ادیب کے پاس

حقیقی دنیا موجود نہیں تھی۔ وہ عقل کے بجائے جذباتیت سے زیادہ کام لیتا تھا۔ اس طرح ادب میں ایک بار پھر گھٹن اور یکسانیت کا احساس ہونے لگا اردو کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کے ہاں رومانیت کو صرف خالی دنیا، لذت انگیزی اور خوابناک فضا کا احساس ہوتا ہے۔ رومانوی تحریک میں جذبے کی شدت تو عروج پر نظر آتی ہے۔ ادب میں جب تک جذبے کی شدت قائم رہی لطافت بھی قائم رہی۔ جب یہ شدت ماند پڑنے لگی تو ادب سے لطافت بھی خود بخود خارج ہوتی چلی گئی۔ ان تمام اختلافات سے قطعہ نظر یہ ادبی نظریہ آج بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس رومانوی تحریک نے جو مسحور کن فضا پیدا کر کے ادبی تخلیقات کو ایک نہج دی وہ اردو میں نئی تھی۔ تحریک نے ناصحانہ بے نمکی کو دور کر کے ادب کی اپنی ادبیت کو اجاگر کیا اور شاعری میں شاعرانہ فضا کو اور نثر میں لطف و سرور کو بحال کیا جو کہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ (۲۸)

ترقی پسند تحریک:

"ہندوستان میں جب رومانیت کی تحریک اپنے عروج پر تھی تو روس میں ۱۹۱۷ء میں مارکسی انقلاب کا آغاز ہوا۔ کارل مارکس مشہور فلسفی تھا۔ مارکس کا نظریہ معاشی تھا، اس کا کہنا تھا کہ سرمایہ دار کو منافع غریب کا پیٹ کاٹ کر ملتا ہے۔ وہ مزدور کو سرمایہ دار سے برتر سمجھتا ہے۔ روس میں اس سوشلسٹ انقلاب کا بانی لینن تھا۔ اس نے پہلی بار کارل مارکس کے نظریے کی تائید کرتے ہوئے انسان پر انسان کی حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کیا۔ (۲۹)

انسان اور اس کی حقیقی زندگی کے حوالے سے مارکسی تحریک نے ادب میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے اثرات نہ صرف روس تک محدود رہے بلکہ پوری دنیا میں پھیل گئے۔ مارکسی نظریات کی یہ تحریک پوری ادبی دنیا میں "ترقی پسند تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی یعنی جو ادیب مارکسی نظریات سے متفق ہوگا وہی ترقی پسند ہوسکتا ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر ادب میں مزدور، کسان، غریب کے ساتھ ظلم، معاشرتی ناانصافیاں اور روتے سسکتے عوام کے معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا گیا۔ اس تحریک نے ہندوستانی عوام کو بھی بے حد متاثر کیا کیوں کہ وہ قوم اپنی حکومت کے ہاتھوں ان تمام مسائل کا شکار تھی۔ تحریک خلافت کے دور میں کچھ افراد ترکِ وطن کر کے تاشقند گئے تو وہاں سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ ترقی پسند خیالات لے کر آئے۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات ہندوستان کی سرزمین میں پھیلنے لگے تھے۔ پنڈت نہرو بھی اس اشتراکیت سے متاثر ہوئے اور اپنے اجلاسوں میں اس کی حمایت کا باقاعدہ اعلان بھی کیا، ہندوستانی طلباء کی کچھ تعداد لندن تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئی یہ طلباء بھی اس ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور لندن ہی میں ۱۹۳۵ء میں انھوں نے انجمن ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی اور پھر ہندوستان واپس آ کر انہی طلباء نے سجاد ظہیر کی زیر صدارت ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس لکھنو میں منعقد کروائی۔ ہندوستان کے ادبی حلقے نے اس ترقی پسندی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہوگا جس نے مارکسی نظریات کو اپنے ادب میں موضوع نہ بنایا ہو۔ اس ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء میں سردار جعفری، مخدوم محی الدین، احسان دانش، فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، مجاز لکھنوی، وامق جونپوری، جاں

نثار اختر اور ساحر لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں۔

علامہ اقبال نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری میں اشتراکیت کو موضوع بنایا۔ سوویت یونین کے عروج سے اقبال کو خاص دلچسپی تھی انھوں نے لینن کے نام سے ایک نظم بھی لکھی جو کہ "بال جبریل" میں شائع ہوئی۔ یہ نظم اشتمالیت اور مذہبی تصوریت کے امتزاج کی کوشش ہے۔ مارکسی انقلاب کا سب سے بڑا تو نہیں البتہ نمائندہ شاعر جوش کو کہا جاتا ہے۔

جوش کی شاعری میں ابتدا ہی سے جوش وخروش اور غیر معمولی ہمت اور مردانگی نظر آتی ہے اور یہ ہمت اور بہادری ان کی شاعری کی عظمت کی بڑی وجہ ہے۔ جوش کی شاعری ترقی پسندی کی ابتدائی شاعری ہے اور ان ہی کی طرز کو کچھ ترقی پسند شعراء نے اپنایا ہے۔

فیض کی شاعری مکمل انقلابی نہیں ہے۔ ان کے یہاں رومان و ترقی پسندی کی ایک گنگا جمنی فضا ملتی ہے۔ فیض کا کلام ترقی پسند شاعری کیلئے ایک مثالی نمونہ ہے۔ ان کی یہ خصوصیت ان کی نظموں "تنہائی" اور "موضوع سخن" میں نظر آتی ہے۔ فیض کی حقیقت نگاری میں علامتی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ فیض نے ترقی پسند شاعری کو معیاری رنگ و آہنگ عطا کیا۔

ن م راشد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے آزاد نظم کو اردو شاعری میں متعارف کرایا چوں کہ اردو شاعری میں آزادی کا رجحان بڑھ رہا تھا لہذا اردو نظم نے بحر و قافیے سے آزادی حاصل کر کے اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا آزاد نظم میں قافیے اور ردیف کی پابندی سے آزادی کے باعث نئی تشبیہات آئیں جو کہ معاشرے سے ہی اخذ کی گئیں۔ راشد ایک منتقم المزاج اور احتجاجی ذہن کے حامل تھے اس لئے ان کی شاعری میں تیکھا پن ہے۔

اسرار الحق مجاز نے شاعری کو انقلاب پر قربان نہیں کیا۔ مجاز کی بہترین نظم "آوارہ" ہے۔ وہ بنیادی طور پر رومانوی شاعر ہیں لیکن انہوں نے ترقی پسند تحریک کی بھی ہم نوائی کی اور اچھے عناصر کو موضوع شعر بنایا مگر وہ بار بار "پٹری" سے اتر جانے والے شاعر تھے۔ ان کی آزاد روی کسی تحریک سے ان کی مکمل وابستگی میں آڑے آتی رہی۔

احسان دانش کا مزدور طبقے سے تعلق رہا ہے۔ احسان دانش مارکس ازم پر یقین نہیں رکھتے تھے لیکن وہ مزدور کسانوں اور محروم طبقوں کے سچے حمایتی تھے۔ انہوں نے اس زندگی کو قریب سے دیکھا اور برتا بھی تھا اس لئے ان کی نظمیں محض خیال یا اصول نہیں بلکہ اصل حقائق سے مملو ہیں۔ اس لئے احسان دانش کو "شاعر مزدور" کہا جاتا ہے۔

مخدوم محی الدین نے کم لکھا مگر جو کچھ لکھا وہ ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ مارکسزم پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے اس کے لئے انہوں نے عملی جدوجہد کی اور تلنگانا کی تحریک کے وہ رہنما تھے اپنے نظریات کی تبلیغ و فروغ کے سلسلے میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانا پڑیں اس سے کچھ اور ہوا ہو یا نہ ہوا ان کی شاعری کو بڑا فائدہ پہنچا اور وہ ایک ایسے سپاہی کا نعرہ مستانہ بن گئی جو محاذ پر ڈٹا ہوا/ ڈٹے ہوئے اور اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہو۔

ترقی پسندی کےنعرے میں انسان دوستی اور محروموں سے ہمدردی کا ایک ایسا عنصر موجود تھا کہ اس عہد کے تمام قابل ذکر شعراء ترقی پسندی کی طرف مائل ہو گئے۔ ان شعراء میں جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، فیض، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، معین الدین احسن جذبی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، خلیل الرحمان اعظمی، احمد ندیم قاسمی، اختر الایمان اور خود جمیل الدین عالی شامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کو حقیقت پسندی سے آشنا کیا اور اسے تصوراتی جمیلوں سے نکال کر زندگی کے اصل حقائق سے وابستہ کیا۔ محروم طبقوں سے ہمدردی اور استحصال سے بغاوت کا جذبہ بیدار کیا۔ بیکار امیدوں اور بے ہودہ خیالوں کی دلدل سے ادب کو نکال کر زندگی کے خارزار سے حوصلہ مندانہ گزرنے کا سلیقہ عطا کیا۔ ادیبوں اور شاعروں کی ایک ایسی نسل پیدا کی جو ان روایات کی امین تھی۔ کچلے ہوؤں اور محروموں کی حمایت پر کمر بستہ تھی اور اپنے شعر و فن کو ان مقاصد کیلئے موقوف کئے ہوئے تھی۔

ترقی پسند تحریک کی بنیاد مارکسزم پر رکھی گئی ہے کارل مارکس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ کائنات میں ازل سے محروموں اور آسودہ حال لوگوں کے درمیان ایک کشمکش جاری رہی ہے جسے وہ اپنی اصطلاح میں جدلیاتی مادیت کہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لوگ جو کسی سبب سے آسودہ حال ہو جاتے ہیں مفلوک الحالوں کا استحصال شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجے میں مفلوک الحال ان کے خلاف جدو جہد کرتے ہیں اور کسی طرح ان میں کا ایک طبقہ خوشحال ہو جاتا ہے یہ نومولود طبقہ پھر دوسرے کمزوروں کا استحصال شروع کر دیتا ہے اس طرح عمل، در عمل اور Synthesis کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مارکس کے خیال میں سرمایہ دار جو غیر معمولی منافع حاصل کرتا ہے اور مالدار سے مالدار تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا سبب مزدور کی مزدوری میں کمی کرنا ہے یعنی مزدور کو اس کی محنت کا معاوضہ کم دے کر سرمایہ دار اپنے لئے خوشحالی حاصل کرتا ہے۔ اس نظریہ کو اس نے Theory of Surplus Value قرار دیا۔ اس کے نزدیک اس استحصالی نظام میں مذہب استحصالی نظام کا آلہ ءکار بنتا ہے اور کمزور طبقوں کو ملائے رکھنے کے لئے افیون کا کام دیتا ہے۔

اس استحصال سے نجات کا طریقہ اس نے تجویز کیا کہ دنیا سے بادشاہتوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور مراعات یافتہ طبقے کو جسے وہ بوژوا کہتا ہے بزور قوت کچل دیا جائے اور سرمائے کو اجتماعی ملکیت قرار دے کر ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ یوں اک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آجائے گا جس میں ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام کرنے اور ضرورت کے مطابق دولت حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے اور استحصال کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ اس کے خیال میں مذہب چونکہ اس غیر طبقاتی نظام کے قیام میں رکاوٹ اور استحصالی قوتوں کا آلہ کار رہا ہے اس لئے اس کے نظام حیات میں مذہب کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

اسی فلسفے کی بنیاد پر لینن نے وہ انقلاب برپا کیا جو " کمیونسٹ انقلاب " کہلاتا ہے اور روس کو تجربہ گاہ بنا کر مارکسزم کے فروغ اور سرمایہ داری کے خاتمے کے لئے ایک عالمی جدو جہد شروع کی گئی اور مارکسزم ایک عالمی تحریک بن گیا۔

ترقی پسندی کے نعرے میں انسان دوستی اور محروموں سے ہمدردی کا ایک ایسا عنصر موجود تھا کہ اس عہد کے تمام قابل ذکر شعراء ترقی پسندی کی طرف مائل ہو گئے۔ ان شعراء میں جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، فیض، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، معین الدین احسن جذبی، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، خلیل الرحمان اعظمی، احمد ندیم قاسمی، اختر الایمان اور خود جمیل الدین عالی شامل ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کو حقیقت پسندی سے آشنا کیا اور اسے تصوراتی جھمیلوں سے نکال کر زندگی کے اصل حقائق سے وابستہ کیا۔ محروم طبقوں سے ہمدردی اور استحصال سے بغاوت کا جذبہ بیدار کیا۔ بیکار امیدوں اور بے ہودہ خیالوں کی دلدل سے ادب کو نکال کر زندگی کے خارزار سے حوصلہ مندانہ گزرنے کا سلیقہ عطا کیا۔ ادیبوں اور شاعروں کی ایک ایسی نسل پیدا کی جو ان روایات کی امین تھی۔ کچلے ہوؤں اور محروموں کی حمایت پر کمر بستہ تھی اور اپنے شعر و فن کو ان مقاصد کیلئے موقوف کیے ہوئے تھی۔

ترقی پسند تحریک کی بنیاد مارکسزم پر رکھی گئی ہے کارل مارکس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ کائنات میں ازل سے محروموں اور آسودہ حال لوگوں کے درمیان ایک کشمکش جاری رہی ہے جسے وہ اپنی اصطلاح میں جدلیاتی مادیت کہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لوگ جو کسی سبب سے آسودہ حال ہو جاتے ہیں مفلوک الحالوں کا استحصال شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجے میں مفلوک الحال ان کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں اور کسی طرح ان میں کا ایک طبقہ خوشحال ہو جاتا ہے یہ نومولود طبقہ پھر دوسرے کمزوروں کا استحصال شروع کر دیتا ہے اس طرح عمل، ردعمل اور Synthesis کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مارکس کے خیال میں سرمایہ دار جو غیر معمولی منافع حاصل کرتا ہے اور مالدار سے مالدار تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا سبب مزدور کی مزدوری میں کمی کرنا ہے یعنی مزدور کو اس کی محنت کا معاوضہ کم دے کر سرمایہ دار اپنے لئے خوشحالی حاصل کرتا ہے۔ اس نظریہ کو اس نے Theory of Surplus Value قرار دیا۔ اس کے نزدیک اس استحصالی نظام میں مذہب استحصالی نظام کا آلہء کار بنتا ہے اور کمزور طبقوں کو ملائے رکھنے کے لئے افیون کا کام دیتا ہے۔

اس استحصال سے نجات کا طریقہ اس نے تجویز کیا کہ دنیا سے بادشاہتوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور مراعات یافتہ طبقے کو جسے وہ بوژوا کہتا ہے بزور قوت کچل دیا جائے اور سرمائے کو اجتماعی ملکیت قرار دے کر ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ یوں اک ایسا غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آجائے گا جس میں ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام کرنے اور ضرورت کے مطابق دولت حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے اور استحصال کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ اس کے خیال میں مذہب چونکہ اس غیر طبقاتی نظام کے قیام میں رکاوٹ اور استحصالی قوتوں کا آلہ کار رہا ہے اس لئے اس کے نظام حیات میں مذہب کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

اسی فلسفے کی بنیاد پر لینن نے وہ انقلاب برپا کیا جو " کمیونسٹ انقلاب " کہلاتا ہے اور روس کو تجربہ گاہ بنا کر مارکسزم کے فروغ اور سرمایہ داری کے خاتمے کے لئے ایک عالمی جدوجہد شروع کی گئی اور مارکسزم ایک عالمی تحریک بن گیا۔

مارکس کے نظریات صرف زندگی کے معاشی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں تک محدود نہیں رہے بلکہ پوری انسانی زندگی کو احاطہ کیئے رہے۔ شعروادب میں اس نظریئے کے حامل افراد سرمایہ داری کے مخالف، محنت کشوں اور استحصالی طبقوں کے رفیق اور محروم لوگوں کی زبان بن گئے۔

ادب میں یہ تحریک روسی سرحدوں کو توڑتی پھوڑتی ہنگری اور پولینڈ سے ہوتی ہوئی فرانس اور انگلستان تک پہنچی تو دوسری طرف چین، برصغیر اور دیگر ترقی پذیر ملکوں میں پھیلتی چلی گئی اور یوں اس نے عالمی تحریک کی حیثیت حاصل کی۔

۱۹۳۶ء لکھنو میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد ڈالی گئی اور یوں اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں "ترقی پسند تحریک" کی ابتداء ہوئی اردو میں اس تحریک نے بڑی تیز رفتاری سے مقبولیت حاصل کی اس کا سبب حُبِ علی نہیں بغضِ معاویہ تھا، دراصل برصغیر کے لوگ ہر اس تحریک کے حامی ہو جاتے تھے جو انگریز دشمنی پر مبنی ہو۔ ترقی پسند تحریک سرمایہ داری کے خلاف تھی اور اس وقت برطانیہ سب سے بڑا سرمایہ دار ملک تھا اس طرح سرمایہ داری کی مخالفت گویا برطانیہ کی مخالفت تھی وجوہ کچھ بھی رہے ہوں بہر حال اس وقت کا ذہین طبقہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوگیا اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے اپنا وزن ترقی پسندی کے پلڑے میں ڈال دیا۔ جمیل الدین عالؔی نے بھی اپنے وقت کے اس خیر کی ہمنوائی کی اور ترقی پسند تحریک میں شامل ہو کر ان نظریات کی تقویت کا باعث بنے جو ترقی پسندی سے وابستہ ہیں گو وہ سکہ بند ترقی پسند نہ کہلا سکے۔ سچ کہ تھے بھی نہیں۔

اپنے طور پر جمیل الدین عالؔی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ضرور تھے اور ان کی ذہنی اور ادبی تربیت میں ترقی پسند تحریک کا بڑا ہاتھ رہا۔ خود ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے اور اسکی ترقی میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔ جس عہد میں وہ شعر کہہ رہے تھے اس عہد میں علی سردار جعفری، مجروحؔ سلطان پوری، مخدوم محی الدین، مجازؔ، منیب الرحمٰن، ساحرؔ لدھیانوی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، فیض احمد فیضؔ، جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ کے علاوہ تمام ترقی پسند شعراء شامل تھے۔ ترقی پسندی اس وقت کی مقبول ترین تحریک تھی اور اپنے آپ کو ترقی پسند کہلوانا ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ایسے سب ترقی پسندوں میں اپنا مقام اور امتیاز پیدا کرنا اور اسے برقرار رکھنا آسان کام نہ تھا مگر عالؔی صاحب نے اپنی شاعرانہ مہارت اور فنکارانہ بصیرت کے باعث نہ صرف یہ کہ اردو کی ترقی پسند شاعری میں اپنا مقام بنایا۔ بلکہ خود ترقی پسند تحریک کے فروغ وارتقا کا سبب بھی بنے۔ سرکاری نوکری کی وجہ سے وہ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان پر پابندی لگ جانے کی وجہ سے اسکی باقاعدہ رکنیت میں نہ رہ سکے۔

نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی ترقی پسند ادیبوں کی ایک ٹیم تیار ہوگئی یہ لوگ نثر میں ان ہی ذہنی رجحانات کی تبلیغ کر رہے تھے جو نظم میں رائج تھے۔ نثر میں ترقی پسند رجحانات کی ابتداء "انگارے" کی اشاعت سے ہوئی انگارے مذہبی جبر اور معاشی استحصال کے خلاف ردِعمل کے افسانوں پر مشتمل مجموعہ تھا جس کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر اور احمد علی نمایاں تھے۔ یہ مجموعہ اشاعت کے فوراً بعد ہی ضبط ہوگیا مگر اس نے جرات اظہار کی جو روایت قائم کی اسے کوئی نہ

روک سکا۔ اس کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جو زندگی کے حقائق کو لگی لپٹی رکھے بغیر جرات مندی اور وضاحت سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ نہ حکومت وقت کے غیض وغصب سے ڈرتے تھے نہ مذہب کے روایتی حمایتوں سے خائف تھے پھر یہ کہ جنسی مسائل پر اظہار خیال میں بھی ان کو باک نہ تھا چنانچہ خاص طور پر اردو افسانے اور عام طور پر اردو نثر میں موضوعات کے تنوع اور بے باک اظہار و خیال کی ریت چل نکلی۔ اس نسل کے لکھنے والوں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہیں جمیل الدین عالی ترقی پسندوں کی اس نسل کے ایک فرد ہیں وہ نثر میں اگر چہ بعد میں آئے مگر جرآت اظہار اور فنکارانہ تصورات کے اعتبار سے وہ اسی مکتبہ فکر سے وابستہ رہے۔

ترقی پسند نظم ونثر کے وجود میں آنے کے بعد ترقی پسند تنقید کا وجود میں آنا بالکل فطری عمل تھا چنانچہ تنقید کے میدان میں پروفیسر احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری، آل احمد سرور، سردار جعفری، احمد علی، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور ممتاز حسین وغیرہ وغیرہ ناقدین تھے جنہوں نے اردو میں مارکسی تنقید کی بنیاد رکھی اور اسی بنیاد پر تنقید نو کی عمارت بھی تعمیر کی۔ ان حضرات نے اردو تنقید کو ایک فکری جہت اور وزن و وقار عطا کیا اور ادب کی افادیت پر زور دیا۔ یہی عناصر جمیل الدین عالی کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں بنیاد کا پتھر بنے ہیں۔ (۳۰)

حوالے، حواشی وتعلیقات ۔ بابِ دوم

۱۔	مسلم لیگ کا دورِ حکومت ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء	ڈاکٹر صفدر محمود	ص ۱۲۔۱۳
۲۔	پاکستان ناگزیر تھا	سید حسن ریاض کراچی یونیورسٹی	ص ۳۳
۳۔	ایضاً	ایضاً	ص ۵۳
۴۔	اقبال کا سیاسی کارنامہ	محمد احمد خان کاروانِ ادب کراچی ۱۹۵۲ء	ص ۵۱
۵۔	مسلم لیگ کا دورِ حکومت ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء	ڈاکٹر صفدر محمود	ص ۲۲
۶۔	اقبال کا سیاسی کارنامہ	محمد احمد خان کاروانِ ادب کراچی ۱۹۵۲ء	ص ۷۷
۷۔	ایضاً	ایضاً	ص ۷۸
۸۔	پاکستان ناگزیر تھا	سید حسن ریاض کراچی یونیورسٹی۔ ۱۹۷ء	ص ۱۳۳
۹۔	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	ڈاکٹر یونس حسنی انجمن ترقی اردو، پاکستان	ص ۹۸
۱۰۔	اقبال کا سیاسی کارنامہ	محمد احمد خان کاروانِ ادب، کراچی ۱۹۵۲ء	ص ۹۵
۱۱۔	ایضاً	ایضاً	ص ۹۶
۱۲۔	ایضاً	ایضاً	ص ۹۹
۱۳۔	تاریخ مسلم لیگ	از مظہر انصاری	ص ۳۳۰۔۳۳۱
۱۴۔	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	ڈاکٹر یونس حسنی انجمن ترقی اردو، پاکستان	ص ۱۰۰
۱۵۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۰۱
۱۶۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۷۔	اپنی کہانی	از راجندر پرشاد	ص ۱۰۱
۱۸۔	بحوالہ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	ڈاکٹر یونس حسنی انجمن ترقی اردو، پاکستان	ص ۱۰۳
۱۹۔	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	ڈاکٹر یونس حسنی انجمن ترقی اردو، پاکستان	ص ۱۰۶
۲۰۔	ایضاً	ایضاً	ص ۱۰۸
۲۱۔	یادگارِ غالب	صالحہ عابد حسن انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	ص ۱۰۲
۲۲۔	جدید شعراء اردو	از ڈاکٹر وحید قریشی	ص ۲
۲۳۔	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید انجمن ترقی اردو، پاکستان ۱۹۵۸ء	ص ۳۸۳

۲۴۔	تاریخ انجمن پنجاب	صفیہ بانو تمنائی	
۲۵۔	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	ڈاکٹر یونس حسنی انجمن ترقی اردو، پاکستان	ص ۱۱۳
۲۶۔	اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید	ص ۴۴۷
۲۷۔	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	ڈاکٹر یونس حسنی انجمن ترقی اردو، پاکستان	ص ۱۴۹
۲۸۔	اردو ادب کی تحریکیں ابتدائے اردو تا ۱۹۷۵ء تک	ڈاکٹر انور سدید	ص ۱۰۱ تا ۱۰۵
۲۹۔	دروان روس دید و شنید	حکیم محمد سعید	ص ۳۳
۳۰۔	اردو ادب کی تحریکیں ابتدائے اردو تا ۱۹۷۵ء تک	ڈاکٹر انور سدید	ص ۳۳

باب سوم

حالی کی شاعری کے ارتقائی منازل

جمیل الدین عالیؔ کا شمار ہمارے دور کے ان اہم شعراء میں ہوتا ہے جو جدید اردو شاعری کے نئے اسالیب کی پہچان مانے جاتے ہیں عالیؔ کی تخلیقی صلاحیتوں کے کئی پہلو ہیں غزل، نظم، گیت، دوہے اور ملی نغمات غرض شعر کی مختلف اصناف پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر جگہ ان کی قد آور شخصیت اور ان کی فنی ذکاوت نمایاں نظر آتی ہے۔

عالیؔ کی شاعری پر گفتگو میں ایک دشواری یہ ہے کہ ان کی شاعری میں متعدد وقفے آتے ہیں وہ محض شاعر نہیں ایک بیوروکریٹ، ایک سماجی کارکن، ایک سیاسی شخصیت اور نظم کے شیدائی بھی ہیں۔ وہ کبھی ہاؤسنگ سوسائیٹیوں کی تشکیل میں خود کو پھنسا لیتے ہیں تو کبھی ادیبوں کی بہبود کیلئے گلڈ کے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں کبھی اردو یونیورسٹی کے قیام میں مشغول تو کبھی سینٹر کی حیثیت سے ایوان ھائے حکومت میں متمکن نظر آتے ہیں یہ مصروفیات ادب کش بھی ہیں اور ادیب کش بھی ان سرگرمیوں کی وجہ سے عالیؔ کی شعر گوئی میں بار بار وقفے آتے ہیں اور شاعری کا ارتقاء یکساں نہیں ہو پاتا درمیانی وقفے میں رجحانات کی تبدیلیاں شاعر اور معاشرے میں بُعد پیدا کر دیتے ہیں۔

عالیؔ نے شاعری کی ابتدا کیسے کی اس سلسلے میں خود ان کا بیان ہے۔

"یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ میں دسویں جماعت میں تھا میرے بھائی مرزا اعتزاز الدین شاید جہلم سے دہلی آئے ہوئے تھے میری والدہ ان کی سوتیلی ماں تھیں مگر وہ سلام کو ضرور آتے تھے اس بار وہ شب کو بارہ بجے پہنچے تو معلوم ہوا کہ میں بارہ دری خواجہ میر دردؔ میں مشاعرہ سننے گیا ہوا ہوں صبح کو میری پیشی ہوئی اور کافی زجر و توبیخ کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر مجھے شاعر ہی بننا ہے تو شریفوں کی طرح بنوں اور چچا سائلؔ صاحب کی شاگردی اختیار کروں اسی دن انہوں نے مٹھائی کا انتظام کیا۔ میرے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بلا کر تنبیہ کی میرے پرائیویٹ ٹیوٹر کو برخاست کر دینے کی دھمکی دے کر جہلم چلے گئے۔ (۱)

عالیؔ کے شاعر بننے کا فیصلہ ہو گیا لیکن بننے میں ابھی قطرے سے گوہر ہونے تک کا مرحلہ تھا۔ عالیؔ نے بڑے اہتمام سے ایک غزل کہی اُسے اپنے خوش رقم دوست سے اچھے کاغذ پر لکھوایا اور سائلؔ صاحب کے گھر پہنچ گئے سائلؔ صاحب ایک حادثے میں زخمی ہونے کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتے تھے بیٹھے رہتے تھے۔ فارغ التحصیل شاگرد پرا جمائے بیٹھے رہتے تھے اسی محفل میں عالیؔ نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا۔ (۲)

تیری دوری کے سبب دل بھی خفا ہوتا ہے

مدتوں کا میرا ساتھی یہ جدا ہوتا ہے

شاگردوں نے تمسخر آمیز انداز میں عالیؔ کی طرف دیکھا پھر استاد پر نظر ڈالی اور کھسر پھسر کرنے لگے استاد نے کچھ توقف کے بعد جھک کر قاب میں سے مٹھائی کی ڈلی اُٹھائی اور عالی کی طرف یوں متوجہ ہوئے جیسے اب کھلانے ہی والے ہیں۔ اور ساتھ ہی یوں فرمایا کہ دوسرے مصرعے کو یوں کر دو۔

مدتوں کا مراہم سا یہ جدا ہوتا ہے۔

اس طرح مصرعے میں یہ کا تنافر دور ہو گیا۔ سائل صاحب اپنے ذہنی رجحان کی وجہ سے مضمون پر توجہ نہیں دیتے بلکہ زبان پر توجہ دیتے تھے سائل صاحب کی اصلاح پر شاگردوں نے واہ واہ کے ڈونگرے برسائے لیکن عالی اصلاح کو تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوئے یہ انکار سن کر شاگردوں میں کھلبلی مچ گئی ادھر چلمن کی اوٹ سے چچی جان کی آواز گونجی

"اے مرزا سراج الدین یہ فرخ مرزا کی اولاد ہے

ہے نا امین الدین خانی۔"

شاید وہ چلمن کے قریب کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں اس لئے مداخلت کر بیٹھیں سائل صاحب نے مسکراتے ہوئے عینک اتار کر رکھی اور نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"بیگم یہ مٹھائی اٹھوالو گھر ہی میں بٹے گی جمیل میاں ہمارے شاگرد نہیں ہوں گے انہیں زبان سے کوئی علاقہ نہیں ہمیں کچھ اور آتا نہیں۔" (۳)

یہ کہہ کر حضرت سائل نے بات کو اڑا دیا اور یوں محسوس ہوا جیسے اس محفل میں کوئی ناگوار بات ہوئی ہی نہ ہو۔ عالی کو معلوم تھا کہ سائل اور بےخود میں باہمی چشمک ہے چنانچہ چچا کو زچ کرنے کیلئے انہوں نے کہا کہ اگر آپ ہمیں شاگرد نہیں بناتے تو ہم استاد بےخود کے شاگرد ہوئے جاتے ہیں لیکن پھر خود عالی کو استاد بےخود کا مزاج یاد آ گیا اور کہنے لگے ہم پنڈت امرناتھ ساحر کے یہاں جا کر فارسی پڑھیں گے ہمیں رقعہ لکھ دیجئے عالی کی یہ فرمائش سن کر سائل صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے عینک صاف کر کے آنکھوں پر جمائی قلم اٹھایا اور رقعہ لکھنا شروع کیا۔

"برادر بجان برابر یہ لڑکا بھائی مرزا امیر الدین کا ہے۔ ماں اس کی بزرگ زادی سیدانی خواجہ میر درد رحمتہ اللہ علیہ کی ذریات سے ہے شاگردی اس کی مطلوب ہے امید ہے کہ بڑا ہو کر شعر اچھا نکالے گا۔ پوتا علائی کا اور نواسا درد کا ہے چونکہ طبیعت کا ضدی اور شوخ ہے اور سائل گھر کی مرغی ہے آپ اسے سنبھالیے اور اپنا لختِ جگر جان کر اس کی پرورش کیجئے گا کل سہ پہر حسبِ دستور آستانے پر حاضری دینے آؤں گا تو آپ کے سامنے اس کے کان کھینچوں گا یہ آپ کو تکلیف نہ دیوے اور خدمات مناسب طور بجا لاوے۔"

آثم

ابو المعظم سائل (۴)

لیکن ساحر کے بھی شاگرد نہ ہو سکے ہوا یہ کہ ساحر کا خط لے کر ملک نسیم الظفر کے پاس پہنچ گئے انہوں نے سارا قصہ سنا تو فیصلہ صادر فرمایا بھئی تم کسی کے شاگرد کیوں بنو غالب کسی کا شاگرد تھا؟ بڑے آدمی کسی کے شاگرد نہیں ہوتے۔" (۵)

کچی عمر اور مزاج کی شوخی کی وجہ سے اس لئے یہ بات بڑی پسند آئی چنانچہ شاگردی کا بستر لپیٹ دیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دلی کے متوسط طبقے میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ شاعری، پتنگ بازی، شطرنج، تیراکی اور اگر وسائل ہوں تو گھڑ سواری شکار ایک طرح کے لوازم تھے۔ عالی نے نصابی نظمیں بھی رٹ لی تھیں اور انھیں خوش الحانی سے پڑھتے تو مخالفین بھی داد دیے بغیر نہ رہتے۔ دلی میں طرحی مشاعروں کا عام رواج تھا یہ بھی ملازم کے ساتھ دو ایک بار مشاعرے میں گئے مگر بے پیروں کو مشاعرہ پڑھنے کی اجازت نہ تھی اس زمانے میں بھی دلی سائیوں اور بے خودیوں میں بٹی ہوئی تھی تیسرا کوئی اور ممکن نہ تھا مجبوراً عالی نے سائلیے کی حیثیت سے غزل پڑھی حالانکہ استاد سائل انھیں شاگرد بنانے سے صاف انکار کر چکے تھے عالی کے تخلص، کا معاملہ بھی عجیب ہے عالی کے ایک چچا نواب ضمیر الدین خان عالی تخلص کرتے تھے فارسی شعر میں کہتے تھے لیکن وہ اہل حدیث عالم تھے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے کسی قدر خشک مزاج بھی ہوں گے اس لئے انھوں نے اپنا تخلص عالی کو بخش دیا یہ تخلص ان پانچ میں سے ایک ہے جو غالب نے انکے دادا علائی کو شاگرد کرتے وقت انکے لئے تجویز کئے تھے۔ علائی نے اردو کیلئے علائی اور فارسی کیلئے نسیمی پسند کیے۔ اس سلسلے میں عالی کا بیان ہے:

"جب میں نے ان سے جنگ نامہ اور انوریکی پڑھ لئے تو شاید میری بدشوقی کی بنا پر انہوں نے اندازہ لگایا کہ مجھ سے فارسی اور نحو نہیں چلے گی نہ کوئی اور ڈھنگ کا کام ہوگا چنانچہ انہوں نے کہا کہ بھئی ایک اچھا تخلص تھا مگر میں تو اپنی خشک مزاجی، حق گوئی اور فارسی گوئی کے سبب اس میدان میں نام پیدا نہیں کر سکا تم اردو سے شوق رکھتے ہو یہ زمانہ بھی اردو کا ہے سو یہ تخلص تم لے لو۔ (۶)

یوں یہ تخلص عالی نے اپنا لیا۔

۱۹۴۳ء کی بات ہے نواب ضمیر الدین خان کا انتقال ہوگیا ان کا کتب خانہ ریاست کے کتب خانہ میں داخل کر دیا گیا اور کسی کو ورثے میں کچھ نہ ملا لیکن عالی کو ان کی ایسی میراث ملی جس کے اثرات ان کی زندگی پر بڑے گہرے مرتب ہوئے اور یہ میراث تھی تخلص۔ عالی کہتے ہیں:

"مجھے خوشی ہے کہ مجھے ان سے ایسی میراث پہنچی جس کا میری زندگی پر بڑا اثر ہوا مجھے نصاب سے کبھی شوق نہ ہوا سوائے تاریخ اور شعر سے، سو نتیجہ ظاہر ہے میں فیل تو کبھی نہ ہوا فقط پاس ہوتا رہا مگر اس زمانے میں روز کئی غزلیں ہوتی تھیں، کچھ چوری، کچھ مستعار، غرض جو سمجھ میں آیا کیا۔" (۷)

عالی نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل ۱۹۴۰ء میں سوہاوہ کے ڈاک بنگلے میں کہی وہ چھٹیوں میں اپنے بھائی مرزا اعتزاز الدین کے پاس جہلم گئے بھائی صاحب دورے پر گئے تھے اُن کو بھی ساتھ لے گئے سوہاوہ کے ڈاک بنگلے پر قیام تھا شام کو جہلم کے معززین مدعو تھے بھائی کا حکم آیا کہ اس زمین میں غزل کہے کم سے کم سات شعر ہوں شام تک کہہ کر مجھے دکھا دیجئے موزوں ہوئی تو احباب کو بھی سنواؤں گا یوں ان کی پہلی غزل جہلم میں وجود میں آئی۔ (۸)

بس یوں شاعری کی ابتداء ہوگئی جلد ہی ان کا داخلہ دلی کالج میں ہوگیا یہاں اختر الایمان ان کے سینئروں میں تھے

ان سے وہ متاثر بھی ہوئے مگر دلی کی شاعری کا اپنا مزاج تھا۔ دلی میں داغ کا طوطی بولتا تھا غزل گوئی پسندیدہ صنف سخن تھی عالی دہلوی اثر سے خود کو نہ بچا سکے مگر نظم گوئی کی طرف بھی راغب رہے۔

دوہا نگاری کی ابتداء ۱۹۴۴ء میں ہوئی طویل بیماری کے بعد عالی تبدیلی آب وہوا کیلئے بلند شہر چلے گئے یہاں ان کے چچازاد بھائی صمصام الدین فیروز رہتے تھے وہیں قیام کیا۔ بلند شہر کے نواح میں میلوں ٹھیلوں میں جانے اور دیہاتی فضا اور ماحول سے آشنائی کا موقع ملا اس فضا نے وہ ثقافتی شعور بیدار کیا جو دوہا نگاری کا سبب بنا۔ اس دوران وہ صمصام الدین فیروز کی صاحبزادی میں دلچسپی لینے لگے اس صورت حال نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ وہ نہ مالی طور پر مستحکم تھے، نہ نوکری کیلئے آمادہ۔ نیم سوشلسٹ خیالات کے حامل ہونے کے باعث ریاست میں بھی مقبولیت حاصل نہ تھی اس بے سروسامانی کے عالم میں نکاح پر بضد تھے سسرال والے بھی بظاہر آمادہ تھے مگر تفاوت عمری کے باعث ہچکچا رہے تھے اسی بے بسی میں پہلا دوہا ہوا (۹)

دوہے کہت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھی نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

دوسرا دوہا نکاح کے بعد ہوا

ناں میرے سر کون طرہ کلغی نہ کھیسے چھدام
ساتھ میں ہے اک ناری سانوری اور اللہ کا نام

پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور عالی دوہے کہنے لگے۔

۱۹۴۵ء میں عالی شادی کر چکے تھے اور کالج بھی چھوڑ چکے تھے۔ اس وقت ان کے مطالعے میں فیض، راشد اور میراجی رہتے تھے۔ ان کے دوستوں میں اختر الایمان، مختار صدیقی اور خورشید الاسلام جیسے لوگ شامل تھے یہ سب عالی سے سینئر تھے اور ان سے متاثر بھی تھے یہ سائل صاحب کا آخری زمانہ تھا وہ اپنی بینائی کھو چکے تھے ان دنوں کا احوال خود عالی نے یوں بیان کیا ہے۔

"میں ان کی بینائی سلب ہو جانے کے بعد دو تین برس ان کا کاتب بھی رہ چکا تھا (وہ شعر کہتے اور میں لکھتا تھا) اور ہفتہ میں دو تین بار حاضری کا معمول جاری تھا ایک دن میری بیوی چچا جان کے رومال تہہ کر رہی تھیں میں ان کے ماہانہ وظیفہ کے متعلق والئی ریاست کو ایک احتجاجی یادداشت لکھ رہا تھا اور وہ بھق بھق سگریٹ پی رہے تھے چچی جان حسب دستور ان کی بد پرہیزی پر خفا ہو رہی تھیں میری بیوی سخت سعادتمندی کے موڈ میں تھیں "دادا جان آپ انھیں شاگرد کر لیں تا آپ اب تو ان کی امیدواری کو اتنے دن ہوئے" وہ بولیں وہ ان کی پوتی ہوتی تھیں برادری رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں" "اے لڑکی ڈر تجھ پر" چچی جان دھاڑیں" ہمارا بچہ اچھا خاصہ چل نکلا ہے اب عمر ہولے تو مقابلے کا امتحان دلوا دیں یہ شاگردی استادی

کے چکر میں نہ ڈال دیجواسے۔ ہر آدمی تو نواب مرزا خان نہیں ہوتا ناں" وہ داغ کی بیٹی تھیں۔

"ہوں" چچا جان لیٹے لیٹے مسکرائے ان کا چہرہ دودھ کی طرح ہو گیا تھا اور ہڈیاں رخساروں کو چیر کر ابھر آئی تھیں۔

"اب سفارش پر اتر آئے ہیں مرزا صاحب۔ نہ بیٹی ہم ان کے قابل نہیں ہیں"

میراجی چاہا کہ رو دوں میں نے پہلی بار سنجیدگی سے سوچا جانے کیوں مگر میں نے اس احساس میں بہت شدت محسوس کی۔" چچا جان سیریس لی آپ شاگرد کر لیجئے اب میں سچ سچ کہتا ہوں" میں کڑھ رہا تھا۔"

"نا بیٹا ہمیں زبان سے لگاؤ ہے اور تمہیں شاید کسی چیز سے بھی لگاؤ نہیں۔" انھوں نے منہ پر مکھیوں سے بچنے کیلئے ململ کا ٹکڑا ڈال لیا اور آہ بھر کر غافل سے ہو گئے۔ وہ اسی مہینے انتقال کر گئے۔(۱۰)

سائل صاحب کی شاگردی عالی کو میسر نہ آسکی مگر شعر کا سلسلہ جاری رہا غزل اگرچہ اردو کی مقبول ترین صنف سخن ہے اور عالی نے اس میں طبع آزمائی بھی کی مگر ان کا رجحان دوہا نگاری کی طرف زیادہ ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ دہلی کو چھوڑ کر پونا روانہ ہو گئے مقصد روزگار کی تلاش تھی کیونکہ اب ان کے ساتھ بیوی کا دم بھی لگا ہوا تھا۔ قیام پاکستان سے بالکل قریب کا زمانہ تھا فسادات شروع ہو چکے تھے اور ایسے میں ریل کا سفر خطرے سے خالی نہ تھا اب عالی کو یہ بھی یاد نہیں کہ یہ قیام دلی کے دوران ۱۹۴۵ء کی بات ہے یا پونا کے قیام میں ۱۹۴۶ء کی کہ انھوں نے میراجی کو اپنے دوہے سنائے میراجی نے دوہے بہت پسند کئے اور کہا۔

"اگر میں اب بھی "ادبی دنیا" کا مدیر ہوتا تو تمھیں بڑے زور و شور سے متعارف کرواتا مگر میری بات یاد رکھنا دوہا غزل سے زیادہ مشکل صنف ہے۔" "دوہے میں بالکل سچ بولنا اور غزل جیسی معنی آفرینی نہ کرنا اور ہندی زبان نہ پڑھنا ورنہ اردو کیلئے مشکل لفظیات میں پھنس جاؤ گے یہ تازگی اور شادابی اس کی بحروں کی پابندی کا شکار ہو جائے گی۔" (۱۱)

عالی نے بڑی حد تک میراجی کے کہنے پر عمل کیا انھوں نے ہندی نہیں پڑھی اس لئے دوہے کی عروضی پیچیدگیوں سے بے نیاز رہتے ہوئے انہوں نے اردو میں دوہے کی اک نئی روایت کو جنم دیا۔ وہ دلی، پونا، بمبئی اور حیدرآباد دکن میں جہاں بھی گئے اپنے دوہے سنانے لگے جو بہت پسند کئے جاتے تھے کہ دوہا نگاری کے رچے ہوئے مذاق نے ہی انھیں نغمہ نگاری کی طرف مائل کیا اور آگے چل کر وہ اردو کے اک انتہائی مقبول اور کامیاب نغمہ نگار ہوئے اور ان کے نغمے پاکستان کے بیشتر مقبول اور ماہر نغمہ سراؤں نے گائے اور انھیں قابل رشک پذیرائی حاصل ہوئی۔ ابھی ان کا پہلا مجموعہ بھی شائع نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اک طویل نظم "انسان" کا ڈول ڈالا اور اس کے ابتدائی حصے بعض ادبی رسائل میں شائع ہوئے یہ نظم ہنوز تشنہ تکمیل ہے لیکن اس سے عالی کی طویل نظم نگاری کی ابتداء ہوئی۔

پاکستان آنے اور یہاں بسنے میں جو قیامتیں گزریں اس سے نبرد آزما ہونے کے ساتھ ساتھ عالی نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا ۱۹۵۸ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام "غزلیں، دوہے، گیت" شائع ہوا اس مجموعہ کا نام ہی عالی کی نظم نگاری کے

ابتدائی امکانات کا عکاس ہے اس وقت وہ یا تو غزلیں کہہ رہے تھے یا دوہے لکھ رہے تھے یا پھر گیت اگر چہ وہ اپنی طویل نظم نگاری کی ابتداء کر چکے تھے مگر اس صنف میں ان کے بازو ابھی آزمائے نہیں گئے تھے۔

"غزلیں، دوہے، گیت" کا دیباچہ محمد حسن عسکری نے لکھا تھا اور یہ شکایت کی تھی کہ عالی "اپنی شاعری کو اتنی سنجیدہ چیز نہیں سمجھتے جتنی دراصل ہے۔" (۱۲)

محمد حسن عسکری بڑے سخت گیر نقاد تھے مگر اسی مجموعے کے دیباچے میں انہوں نے عالی کو اپنے دو ڈھائی پسندیدہ شعراء میں شمار کیا تھا۔ (۱۳) تقریباً اسی زمانے میں نظیر صدیقی نے عالی کو "فیض کے بعد شعراء کی نسل پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا شاعر قرار دیا تھا۔ (۱۴)

"غزلیں، دوہے، گیت" عالی کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا اس میں ۷۰ غزلیں، ۱۳ گیت، باقی دوہے شامل ہیں۔ غزل اردو کی قدیم ترین صنف بھی ہے اور مقبول ترین بھی اس کی مقبولیت میں وقتی طور پر معمولی کمی واقع ہوئی ہو گی مگر اردو مزاج کبھی بھی اس سے بے نیاز نہ ہو سکا یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند شعراء نظم سے اپنی دلچسپی اور غزل سے مخاصمانہ رویہ رکھنے کے باوجود غزل کہنے پر مجبور ہوئے اردو کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شاعر ایسا ہو جس نے غزل نہ کہی ہو عالی بھی اپنی تمام تر ترقی پسندی کے باوجود غزل کی طرف مائل ہوئے یہ ایک طرح سے ان کی مجبوری بھی تھی سائل دہلوی سے تلمذ نہ ہونے کے باوجود وہ ان سے متاثر تھے۔ داغ اور غالب کی روایات ایک طرح سے ان کی گھریلو روایات تھیں اس لئے غزل کی طرف ان کا مائل ہونا فطری تھا اور جس انداز کی انھوں نے غزل کہی وہ اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک غزل کسی کے مزاج اور توارث کا حصہ نہ بن گئی ہو۔ عالی کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ تو ہم کسی اگلے باب میں لیں گے لیکن ان کی غزل سے سرسری واقفیت کیلئے درج ذیل شعر ملاحظہ ہوں

یوں تو نہ رہ سکوں گا میں اے نگہ غلط خرام
یا کوئی منزل سکوں یا کوئی راہ بے مقام

کچھ تو یہ نشتر وجود جس کی خلش سے جاں فگار
کچھ تیری راہ کی مشکلیں جس سے ہے روح بے قیام

ذہن تمام بے بسی روح تمام تشنگی
سو یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے انتظام

کوئی خطا نہ ہوئی جس کی یہ ملے پاداش
مگر یہی کہ زمینوں کو آسماں نہ کہا

یہ احترام تعلق یہ احتیاط تو دیکھا

کہ زندگی کو کبھی ہم نے رائیگاں نہ کہا

ہزار دوست ہیں وجہ ملال پوچھیں گے
سبب تو صرف تمہی ہو میں کیا کہوں گا تمہیں

تجھ میں کیا بات ہے جو مجھ میں نہیں ہے طامؔ
ہاں مگر تیرے لئے میرا پریشاں ہونا

اچھا مجھے قبول عذاب رہ و مقام
اب تم بتا بھی دو کہ ملو گے کہ کہاں مجھے

عمر بھر آسانی بار غم اٹھانے سے
ان پر اعتبار آیا خود کو آزمانے سے

جب بھی بزم عالم میں کوئی فتنہ اٹھتا ہے
یا تمھاری محفل سے یا غریب خانے سے

تو آج ترک تعلق پہ ہے مصر کہ یہاں
ترے سوا کوئی جینے کا آسرا نہ رہا

وہ نہ جانے کس ادا سے کوئی وعدہ کر گئے تھے
کہ تڑپ رہے ہیں اب تک مرے اشک نیم خنداں

یہ اشعار ایک رچے ہوئے شعری مذاق کے آئینہ ہیں ایسے ہی اشعار کو دیکھ کر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کہا تھا۔

"جو اپنے آپ کو دہلوی کہتا ہے آل میر درؔد میں اپنا شمار کرتا ہے میرؔ اور غالبؔ سے اپنا ذہنی ناتا جوڑتا ہے اور جو شعوری طور پر اقبالؔ سے بھی متاثر ہے جسے فیضؔ کی بڑائی کا احساس ہے وہ غزل کہے گا اور ضرور کہے گا۔ "(۱۵)

عالیؔ کی غزل ان کی شخصیت کا مکمل اظہار ہے اور اس میں ان کی زندگی کے مختلف روپ ملتے ہیں اس اعتبار سے ان کی غزل خصوصیت کی حامل ہے اس میں ان کی افتاد طبع و ذہنی رجحانات، افکار و خیالات، عقائد و توہمات اور نظریات و تصورات کا واضح عکس نظر آتا ہے اس مجموعہ میں شامل غزلوں میں عالیؔ کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے، عالیؔ کے مشاہدات و تجربات ان کی ذہنی واردات اور جذباتی کیفیات کی تصویریں ملتی ہیں۔

عالیؔ کی غزل میں عشق کی کارفرمائی اسی طرح موجود ہے جس طرح دوسرے غزل گویوں کے یہاں لیکن عالیؔ نے اسے پیش کرتے وقت سماجی، اجتماعی محرکات کو بھی اہمیت دی ہے اس لئے یہ اشعار وسیع پس منظر رکھتے ہیں ان کی غزل میں غم روزگار اور گیسوئے جاناں کے ساتھ کل گیتی کو سنوارنے کا بھی حوصلہ موجود ہے۔ عالیؔ عشق کے پردے میں زندگی کی باتیں

کرتے ہیں۔

دوہا

دوہا ایک ہندی صنف سخن ہے ہندی میں یہ شعر کی اکائی ہے دوہا اسی طرح مکمل ہوتا ہے جس طرح غزل میں شعر گو متعدد شعر ایک ہی ردیف وقافیہ کے اور ایک ہی وزن و بحر کے یکجا کر دیئے جاتے ہیں چاہے ان کے مضامین کتنے ہی مختلف و متضاد کیوں نہ ہوں مگر دوہا ہر حیثیت میں صرف اکائی کی صورت میں رہتا ہے اور کسی دوسری صنف یا ہیت کا حصہ نہیں بجائے خود صنف ہے۔

اس لفظ کا ماخذ ہندی علماء "دوئی پد" کو بتاتے ہیں (۱۶) اس سے یہ بات خود بخود آشکار ہوتی ہے کہ دو مصرعوں پر مشتمل چھند ہے۔ دوہا وہ صنف ہے جس میں پہلی بار قافیہ بندی کی کوشش کی گئی ہے دوہے کے پہلے اور تیسرے چرن میں تیرہ تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں (۱۷) اور دوسرے اور چوتھے مصرعے میں ماتراؤں کی تعداد گیارہ گیارہ ہے اس کے علاوہ دوہے میں بلحاظ حروف موضوع اور عروض میں بھی کئی پابندیاں ہیں اور اس اعتبار سے ہندی میں دوہے کی متعدد اقسام ہیں لیکن دوہا بنیادی طور پر سادھوؤں، سنتوں اور بھگتوں کی دلچسپی کی چیز رہا ہے یہی وجہ ہے کہ جن اردو شعراء نے دوہے کی صنف کو ابتداء میں اپنایا وہ سب صوفی اور فقیر تھے۔ اردو دوہے نے اپنا ایک علیحدہ روپ دھارا جس میں ماتراؤں، سکتوں، اور ہندی عروض کے قواعد کی پابندی کے بجائے اردو کے رائج عروض کا سہارا لیا گیا ہے گیت کی شیرینی، دوہے کی موضوعاتی روایت اور موسیقی کی لے نے مل ملا کر اردو دوہے کے مزاج کی تشکیل کی ہے اس لئے اردو دوہے کو قدیم ہندی روایات کی کسوٹی پر کسنا مناسب نہیں۔

عالی کے دوہے اردو دوہے ہیں اس لئے انہیں بھی ہندی یا پراکرت زبانوں کے معیار پر نہیں پرکھا جاسکتا عالی نے کیا یہ ہے کہ ہندی کے بجل اور مدھر شبدوں کو جو اردو میں بڑی حد تک مستعمل بھی ہیں اختیار کیا ہے دوہے کی فضا ہندی رکھی ہے لیکن اُسے اردو مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ کر دیا ہے اس لئے ان کے دوہے بہت مقبول بھی ہوئے اور اردو والوں کے لئے ان میں اک تنوع آمیز شیرینی پیدا ہوئی دوہے کی آزاد اور رنگین فضا عالی کے مزاج شعری کیلئے بڑی سازگار ثابت ہوئی اور وہ بات جو غزل کے رچے ہوئے اور شائستہ لہجے میں کہنا دشوار ہوتی تھی دوہے کے عوامی اور فقیرانہ مزاج میں آسانی اور خوبصورتی سے ادا ہونے لگی محمد حسن عسکری نے بجا طور پر لکھا ہے۔

"وہ ہرے بھرے اور جیتے جاگتے احساسات جو عالی کے دوہوں میں ملتے ہیں وہ ان کی غزلوں میں بھی دکھائی نہیں دیتے۔"

اپنی جمالیاتی حس کے آزادانہ استعمال کے لئے عالی نے چنا ہی اس صنف کو ہے۔ عالی کی جذباتی معصومیت جو

غزلوں میں بھی نمایاں رہی ہے یہاں آ کے دو چند ہو گئی

محمد حسن عسکری کے دعوی کی دلیل میں چند دوہے ملاحظہ ہوں ۔

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے

جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار

پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

یہ ہر سندر نار کو تکنا یہ جھک جھک پرنام

عالیؔ تو تو گیانی دھیانی یہاں ترا کیا کام

عالیؔ اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار

ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بسیا کہہ گئی نار

یہ گدرایا بدن ترا یہ جوبن رس یہ چال

اری مرالکھن ہم پردیسی سن تو ہمارا حال

گھاٹن نرم بدن جیسے دودھ اور شہد کی دھار

دھیمرن سخت بدن کی جس پر کند پڑے تلوار

بول ہزاروں روپ بھرے پر دھرم ہے میرا پیت

نا مری بانی غزل ہے پیارے نا دوہے نا گیت

عالیؔ کے دوہوں میں جہاں رنگینی اور غنائیت ہے وہیں زندگی کی حقیقتیں سادگی اور سیدھے انداز میں اس طرح بیاں کر دی گئی ہیں کہ ان میں شہری زندگی کا نہ دکھاوا ہے نہ احتیاط نہ رکھ رکھاؤ۔ یہ وہ صنف ہے جس میں لگی لپٹی رکھے بغیر شاعر اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے زندگی کی تمام تہیں کھل جاتی ہیں اور انسان ویسا ہی نظر آنے لگتا ہے جیسا وہ ہے۔ عالیؔ کی شخصیت کو ان کے دوہوں میں آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اس مجموعے میں ایک درجن کے قریب گیت بھی شامل ہیں یہ گیت بھی دوہے کی طرح ایک ہندی صنف سخن ہے۔ گیت گائے جانے کے لئے لکھے جاتے ہے۔ عوامی صنف سخن ہے۔ اور اس میں عام انسانی جذبات کا سادہ اور بے اختیار اظہار ہوتا ہے موضوع کے اعتبار سے بھی گیت کی تقسیم کی گئی ہے۔ مثلاً پوجا کے گیت، برکھا کے گیت، موسم کے گیت، تہوار کے گیت، ہجر کے گیت اور وصال کے گیت۔ (۱۸)

گیتوں میں ہندی کے کئی الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور ایسی بحریں استعمال کی جاتی ہیں جن کو گایا جانا آسان ہوتا

ہے۔عموماً گیت کا مصرعہ یا چند الفاظ گیت کی دھن کو متعین کرتے ہیں اور گانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

جمیل الدین عالی ایک موسیقار کا ذہن رکھتے ہیں موسیقی ان کے خمیر میں داخل ہے۔ترنم سے پڑھتے ہیں اور لے کو سمجھتے ہیں۔اس لئے ان کے گیتوں میں ایک رعنائی ہے اور تیکھا پن۔ یہ موضوعاتی گیت نہیں بلکہ احساساتی گیت ہیں جو شاعر کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑے ہیں۔

یہ کنوارے کنوارپنے کی تیز مہک

یہ ان دیکھے ؟ موں کی دھمک

یہ اپنی لگن

گھنگھرو بن کے لہراتی ہے

چھنن چھنن چھنن

ایک اور گیت دیکھئے

سخت اور تیز کلہاڑے جیسے

دیکھے لوگ پہاڑوں جیسے

کتنی جلد بکھر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

عالی کی موسیقیت کا اظہار ان مصرعوں میں دیکھئے

ہم دھندلے ہیں بے نور نہیں

ہے دیر پہ وہ دن دور نہیں

جب اپنے پیار کا پرچم بھی

لہرائے گا

کوئی آئے گا

مجموعی طور پر عالی کے گیتوں کی صدا جذبات و احساسات کے ہنگاموں سے پُر اور نغمگی سے لبریز ہے۔اس کتاب کے آخر میں ایک چھوٹی سی کہانی ہے جو بظاہر نثر میں لکھی گئی ہے۔مگر پوری کہانی بحر (فعولن فعولن فعولن فعولن) میں لکھی گئی ہے جو شعر گوئی پر ان کی غیر معمولی گرفت کی آئینہ دار ہے اتنی طویل کہانی کو اس طرح منظوم کرنا اسی وقت ممکن ہے جب شعر گوئی کسی کے لئے اظہارِ ذات کا وسیلہ بن کر رہ گئی ہو۔

حوالے، حواشی و تعلیقات ۔ بابِ سوم

۱۔	ماہنامہ چہارسو	راولپنڈی نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء		ص ۱۳
۲۔	ایضاً	ایضاً		ایضاً
۳۔	ایضاً	ایضاً		ایضاً
۴۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۴
۵۔	ایضاً	ایضاً		ایضاً
۶۔	ایضاً	ایضاً		ص ۲۴
۷۔	ایضاً	ایضاً		ایضاً
۸۔	ایضاً	ایضاً		ص ۳۰
۹۔	ایضاً	ایضاً		ص ۲۳
۱۰۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۵
۱۱۔	ایضاً	ایضاً		ص ۳۲
۱۲۔	ایضاً	ایضاً		ص ۱۰۱
۱۳۔	ایضاً	ایضاً		ایضاً
۱۴۔	غزلیں، دوہے، گیت	چھٹا ایڈیشن اپریل ۲۰۰۲ء	جمیل الدین عالی	فلیپ
۱۵۔	ایک نیا شعری مجموعہ	غزلیں، دوہے، گیت	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	حریم روز کراچی ۱۹۵۸ء
۱۶۔	اردو شاعری میں دوہے کی روایت		سمیع اللہ اشرفی	ص ۲۲
۱۷۔	ایضاً		ایضاً	ایضاً
۱۸۔	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب		ڈاکٹر یونس حسنی	ص ۲۸

باب چہارم

عاؔلی کی شاعری

عالی کی شاعری

جمیل الدین عالی کا شمار ہمارے دور کے ان اہم ترین شعراء میں ہوتا ہے جو جدید اردو شاعری کے نئے اسالیب کی پہچان مانے جاتے ہیں۔ عالی کی تخلیقی صلاحیتوں کے کئی پہلو ہیں۔ غزل، نظم، گیت، دوہے، ملی نغمات غرض شاعری کی کسی صنف کو لیجئے عالی کی قد آور شخصیت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔

عالی کی شاعری کے ارتکاز پر لکھنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ شاعری کرتے کرتے کبھی وہ گلڈ کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں تو کبھی اردو کالج کے کام کی افادیت کے پیش نظر شاعری کو روک دیتے ہیں اور اردو سائنس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلوانے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی معاشی، معاشرتی اور سیاسی مصروفیات سے ذرا سا بھی وقت ملتا ہے تو وہ شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کیوں کہ بنیادی طور پر تو عالی شاعر ہی ہیں۔

عالی کو خود بھی اپنی شاعری پر زیادہ توجہ نہ دینے کا افسوس ہے کہتے ہیں کہ "شاعری پر توجہ نہ دینے اور اسے اتنا وقت نہ دینے کا جتنا شاعری کے لئے درکار ہے مجھے افسوس ضرور ہے کیونکہ عام آدمی نے محبت مجھے زیادہ تر میری شاعری، میرے دوہوں، غزلوں، گیتوں اور ملی نغموں کے حوالے سے دی ہے۔ اس معاملے میں خوش قسمت بھی ہوں۔ دیگر شعراء کے لئے ایک ایک جشن منعقد ہوا، میرے لیے کئی کئی جشن منائے گئے۔ دوبئی، جدہ اور ٹورنٹو وغیرہ میں کئی کئی "جشنِ عالی" منائے گئے"۔ (۱) وہ عالی جس کے جشن دنیا کے مختلف حصوں میں منائے جا چکے ہیں اور جس کے کئی منفرد قومی نغمے پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی مقبول ہو چکے ہیں۔ وہ ایسی خوبصورت اور ترنم آواز کا شاعر ہے جس نے جنوبی ایشیا میں دوہے گوئی کو کئی سو برس بعد مقبول کیا۔ محمد عمر نے لکھا ہے کہ عالی " کثیر التصنیف، کثیر الاحباب اور کثیر الاغیار ہے"(۲) عالی کی خدمات کئی سمتوں میں ہیں۔ عالی نے کئی ادبی اور ثقافتی ادارے بنائے اور چلائے، عالی جو اپنی ذات میں انجمن ہے جسے بات کرنے کا فن اور انجمن سجانے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس نے شعر کہنا کیسے شروع کیا؟ اس کی شاعری کا ابتدائی دور کن حقائق پر مشتمل ہے؟ اس کی تفصیلات خود عالی کی زبانی کچھ یوں ہے۔

"یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے میں دسویں جماعت میں تھا۔ میرے بھائی مرزا اعتزاز الدین شاید جہلم سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ میری والدہ ان کی سوتیلی ماں تھیں مگر وہ سلام کو ضرور آتے تھے۔ اس بار وہ شب کو بارہ بجے پہنچے تو معلوم ہوا کہ میں بارہ دری خواجہ میر دردؔ میں مشاعرہ سننے گیا ہوں۔ صبح کو میری پیشی ہوئی اور کافی زجر و بیج کے بعد انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر مجھے شاعر ہی بننا ہے تو شریفوں کی طرح بنوں اور چچا سائلؔ صاحب کی شاگردی اختیار کروں۔ اسی دن انھوں نے مٹھائی کا انتظام کیا۔ میرے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بلا کر تنبیہ کی اور میرے پرائیویٹ ٹیوٹر کو برخواست کر دینے کی دھمکی دے کر جہلم چلے گئے"۔ (۳) یوں عالی کے شاعر بننے کا فیصلہ تو ہو گیا مگر اس کے بعد کے واقعات خاصے دلچسپ ہیں۔ عالی کے بھائی

کے جہلم چلے جانے کے بعد وہ دوسرے دن چچا سائل کے ہاں بڑے اہتمام سے حاضر ہوئے اور صبح و شام محنت کر کے ایک غزل کہی اور اسے اپنے ایک خوش رقم دوست سے لکھوایا۔ سراج الدین خان سائل چل پھر نہیں سکتے تھے۔ اس لئے کہ (اُن کے) "دونوں پاؤں ایک حادثے میں زخمی ہو کر متورم ہو چکے تھے، وہ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ بس بیٹھے رہتے تھے۔" (۴) ان کے فارغ الاصلاح شاگرد سلیقے سے بیٹھ گئے اور انہوں نے مسکرا کر عالی کو دیکھا جس پر ان کے شاگرد بھی از رہِ ادب مسکرا دیئے۔ عالی سب کے بیچ میں دوزانو بیٹھے تھے اور مارے گرمی کے ان کا برا حال تھا۔ اپنی حالت انہوں نے خود یوں بیان کی ہے کہ "میری پوتھی کی شیروانی گرمی میں میرا بدن جلائے دے رہی تھی۔ سر پر چوگوشی مخملی ٹوپی نے بھیجا جھلسا دیا تھا سامنے مٹھائی رکھی مجھے زہر معلوم ہو رہی تھی یا اللہ یہ شاعری ہے یا عذاب ہے" (۵) اس کے بعد سراج الدین خان سائل نے عالی سے کہا کہ مرزا صاحب غزل ارشاد فرمایئے۔ وہ عالی کو مذاقاً مرزا صاحب کہتے تھے۔ عالی کی کیفیت عجب تھی ماحول کی ہیبت، شاگردی کا ہیجان، جھجک اور سخت غصہ الگ آ رہا تھا۔ بہر حال ہمت کر کے مطلع پڑھ دیا جو کچھ یوں تھا کہ

تیری دوری کے سبب دل بھی خفا ہوتا ہے

مدتوں کا مرا ساتھی یہ جدا ہوتا ہے

شاگردوں نے تمسخر سے عالی کو اور استفسار سے استاد کو دیکھا کچھ نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ استاد نے کچھ توقف کے بعد جھک کر قاب میں سے مٹھائی کی ڈلی اٹھائی اور عالی کی طرف یوں متوجہ ہوئے کہ بس اب کھلانے ہی والے ہیں اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ دوسرے مصرعے کو یوں کر دو کہ جو لکھے کا تھا۔ "ہمسایہ جدا ہوتا ہے"
کیونکہ سائل مضمون سے زیادہ زبان کو اہمیت دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ "بھئی میں مضمون نہیں تھے بدلا کرتا پہلے زبان دیکھتا ہوں یوں "یہ" کا تنافر دور ہو جائے گا" (۶)

استاد کا یہ ارشاد فرمانا تھا کہ شاگردوں کی واہ واہ آسمان کو چھونے لگی انہوں نے مٹھائی کی ڈلی عالی کو عنایت فرمائی اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ مگر عالی کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہ بھایا۔ انہوں نے صرف یے وےاور زبان و بیان کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ مطلع بدلنے پر بھی آمادہ نہ ہوئے۔ عالی کا یہ انکار سُن کر شاگردوں کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں کچھ نے ہمت کر کے عالی کو قہر بھری نظروں سے گھورا کچھ لوگ متنفر نظر آنے لگے کچھ کا انداز تمسخرانہ تھا۔ یہ صورت حال دیکھی تو عالی سخت گھبرائے اتنے میں خود چچی جان کی زوردار آواز گونجی "اے مرزا سراج الدین۔ یہ فرح مرزا کی اولاد ہے۔ ہے نا امین الدین حالی۔" (۷) پھر وہ آہستہ سے ہم ہم کر کے ہنسیں شاید وہ چلمن کے پاس کھڑی سب تماشا دیکھ رہی تھیں۔
سراج الدین سائل نے مسکراتے ہوئے عینک اتار کر رکھی اور نیم دراز ہوتے ہوئے کہا کہ "بیگم یہ مٹھائی اٹھوالو۔ گھر ہی بٹے گی۔ جمیل میاں ہمارے شاگرد نہیں ہوں گے۔ انہیں زبان سے کوئی علاقہ نہیں ہمیں کچھ اور نہیں آتا"۔ (۸)

شاگردوں نے عالی کی طرف سے منہ پھیرلیا کچھ کے دلوں میں رحم بھی آیا اور کچھ بدمزگی کا انتظار کرنے لگے مگر استاد خوش باش باتیں کرنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور پھر نرمی سے کہنے لگے کہ "اچھا نواب زادہ صاحب پوری غزل تو سنا دیجئے" (۹) لیکن عالی نے روہانسی صورت بنا کر اتراتے ہوئے کہا کہ "نہیں ہم تو پہلے شاگرد ہوں گے" (۱۰) عالی کی عمر اس وقت تیرہ (۱۳) چودہ (۱۴) برس تھی۔ لیکن سائل نے عالی کو شاگردی میں لینے کے بجائے عالی کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا کہ "اچھا پھر شاگرد ہو جانا...... آج تو قصہ ختم پیسہ ہضم۔ تمھاری مٹھائی بٹ گئی اب پھر محفل جمائیں گے تم آیا جایا کرو باقاعدہ اچھا تو سناؤ کیا مطلع تھا" (۱۱) استاد بیخود اور سراج الدین سائل کی آپس میں چشمک تھی یہ بات عالی جانتے تھے لہذا انہوں نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ "اچھا تو ہم استاد بیخود کے پاس جارہے ہیں" (۱۲) مگر پھر عالی استاد بیخود کا مزاج یاد کر کے ڈر گئے اور پنڈت امرت ناتھ ساحر کے ہاں جا کر فارسی پڑھنے کا ارادہ کرتے ہوئے چچا سائل سے عرض کیا کہ "اچھا ہم پنڈت جی کے ہاں جائیں گے آپ ابھی رقعہ لکھیے ہم ان سے فارسی بھی پڑھیں گے" (۱۳) سائل عالی کی یہ فرمائش سُن کر اٹھ کر بیٹھ گئے عینک صاف کر کے آنکھوں پر جمائی، قلم اٹھایا اور رقعہ لکھنا شروع کیا۔ "برادر بجان برابر یہ لڑکا بھائی سرامیر الدین خان مرحوم کا ہے۔ ماں اس کی بزرگ زادی سیدانی خواجہ میر درد رحمتہ اللہ علیہ کی ذرّیت ہے۔ شاگردی اس کی مطلوب ہے۔ امید ہے کہ بڑا ہو کہ شعر اچھے نکالے گا کہ پوتا علائی کا اور نواسہ درد کا ہے۔ چونکہ طبیعت کا ضدی اور شوخ ہے اور سائل کے گھر کی مرغی ہے آپ اسے سنبھالیے اور اپنا لختِ جگر جان کر اس کی پرورش کیجئے گا۔ کل سہ پہر حسب دستور آستانے پر حاضری دینے آؤں گا۔ تو آپ کے سامنے اس کے کان کھینچوں گا کہ آپ کو تکلیف نہ دیوے اور خدمات مناسب طور سے بجالا وے،

آثم

ابوالمعظم سائل" (۱۴)

لیکن عالی پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی صاحب کے شاگرد نہ ہو سکے اس لیے کہ انہوں نے سائل سے خط لے کر آداب کیا اور بھناتے ہوئے جناب ملک نسیم المظفر کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے عالی کی روداد سنی تو یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ "بھئی تم شاگرد کیوں ہو کسی کے۔ غالب کسی کا شاگرد تھا۔ بڑے آدمی کسی کے شاگرد نہیں ہوتے"۔ (۱۵) یوں عالی پنڈت جی کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے۔ عالی کی تک بندی کی ابتداء تو دلی میں گھریلو طور پر ہو گئی تھی۔ دلی میں کھاتے پیتے شرفاء سے لے کر متوسط طبقے کا ماحول ایسا تھا کہ شاعری، پتنگ بازی، شطرنج، پچیسی، تیراکی، اگر وسائل ہوں تو گھڑ سواری اور شکار ایک طرح کے لوازم تھے۔ عالی اسکول میں بھی کچھ نہ کچھ کہنے لگے تھے "لب پہ آتی ہے دعا" اور کئی نصابی نظمیں خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ مثنوی مولانا روم اور گلستان بوستان کو تو بے سمجھے ناظرہ کے بعد سکھا دیا جاتا تھا۔ اور مثنوی میں عالی کے لحن پر مولوی صاحب ہی کیا ان کے تک چڑھے عزیز بھی جھولتے تھے۔

اس زمانے میں دلی میں ہر ہفتے "طرح" کے مشاعرے ہوتے تھے۔ عالی ایک دو دفعہ ملازم کے ساتھ چلے گئے مگر وہاں کسی استاد کا شاگرد ہوئے بغیر کوئی قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے رشتہ کے چچا نواب سائل دہلوی سے شرف تلمذ حاصل کرنا چاہا مگر عالی کی نافرمانی کی بناء پر انہوں نے شاگرد نہ کیا۔ اس وقت دلی میں دو اساتذہ کی جماعتیں قابلِ ذکر تھیں "سائلے" اور "بیخودیے" ان میں بڑے معرکے ہوتے تھے۔ بہر حال عالی نے ایک سائلی رشتہ دار کی حیثیت سے مشاعرے پڑھنے شروع کیے۔ عالی کا تخلص ان کا اپنا انتخاب کردہ نہیں تھا بلکہ عالی کے ایک چچا نواب ضمیر الدین خان عالی تخلص کرتے تھے لیکن وہ اہلِ حدیث عالم تھے اور بڑے متقی پرہیزگار بزرگ تھے۔ بقول عالی "جب میں نے ان سے "جنگ نامہ" اور "انوار سہیلی" پڑھ لیے تو شاید میری بدشوقی کی بناء پر انھوں نے اندازہ لگایا کہ مجھ سے فارسی وغیرہ نہیں چلے گی نہ کوئی اور ڈھنگ کا کام ہوگا چنانچہ انھوں نے کہا کہ بھئی ایک اچھا تخلص تھا لیکن میں تو اپنی خشک مزاجی حق گوئی اور صرف فارسی گوئی کے سبب اصل میدان میں نام پیدا نہیں کر سکا تم اردو سے شوق رکھتے ہو یہ زمانہ بھی اردو کا ہے سو یہ تخلص تم لے لو" (۱۶) یوں یہ تخلص عالی نے اپنا لیا۔ یہ ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کی بات ہے ۱۹۴۳ء میں نواب ضمیر الدین خان کا انتقال ہوا۔ ان کی کتابیں ریاست نے کتب خانہ میں داخل کر دیں اور کسی کو کچھ نہ ملا لیکن عالی کو ان سے ایسی میراث ملی جس نے ان کی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ کہتے ہیں کہ "مجھے خوشی ہے کہ مجھے ان سے ایسی میراث پہنچی جس کا میری زندگی پر بڑا اثر ہوا مجھے نصاب سے کبھی شوق نہ ہوا سوائے تاریخ اور شعر کے سو نتیجہ ظاہر تھا میں فیل تو کبھی نہ ہوا مگر فقط پاس ہوتا رہا اس زمانے میں روز کئی غزلیں ہوتی تھیں۔ کچھ چوری کچھ مستعار لینا غرض کہ جو سمجھ میں آیا کیا۔" (۱۷) عالی نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل ۱۹۴۰ء میں سویاوہ کے ڈاک بنگلے میں کہی۔ یہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ عالی چھٹیوں میں اپنے بھائی مرزا اعتزاز الدین کے پاس جہلم گئے۔ بھائی صاحب دورے پر ساتھ لے گئے۔ سویاوہ کے ڈاک بنگلے میں قیام تھا شام کو جہلم کے معززین مدعو تھے۔

عالی کا بیان ہے کہ "صبح (بھائی کا) حکم آیا اس زمین میں غزل کہیے۔ کم سے کم سات شعر ہوں۔ شام تک کہہ کر مجھے دکھا دیجئے۔ موزوں ہوئی تو احباب کو بھی سنواؤں گا وہاں میں نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل کہی گیارہ شعر ہوئے تھے اس لحاظ سے آپ مجھے جہلمی شاعر کہہ سکتے ہیں (۱۸)

ابتداء میں عالی کا رجحان غزل کی طرف زیادہ تھا اس زمانے میں دلی پر داغ کی حکمرانی تھی اور غالب کا احترام۔ عالی جلد ہی کالج میں داخل ہو گئے اختر الایمان سے متاثر ہوئے لیکن ان پر دلی والوں کا اثر زیادہ رہا وہ غزل ہی کہتے رہے مگر ۱۹۴۳ء میں اپنے "ایک دوست نسیم الظفر کے الیکشن پر اس کا قصیدہ بھی کہا تھا" (۱۹) اس کے بعد ۱۹۴۴ء ستمبر میں عالی کی دوہا نگاری کی ابتداء ہوئی۔ اگست ۱۹۴۴ء میں چند ہفتہ بیماری کے بعد عالی تبدیلی آب وہوا کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حسام الدین فیروز کی دعوت پر قریبی ضلع بلند شہر گئے۔ وہاں انہیں دیہاتی ہاٹ بازار دیکھنے کا موقع ملا۔ چھوٹے چھوٹے

میلوں میں بھی گئے۔ اور وہاں کی لوک موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوئے۔

اور ساتھ ہی انھیں اپنے ان بھائی کی صاحبزادی بہت پسند آ گئی لیکن صاحبزادی حسام الدین فیروز اور ان کی بیگم عالی کو پسند کرنے کے باوجود تفاوت عمر اور ان کے ننھیال کے دلّی پن سے ڈرتے تھے۔ عالی کا بی۔ اے کے ایک پرچے میں کمپارٹمنٹ آیا تھا۔ کالج کے آخری دو سال میں نیم سوشلسٹ خیالات نے ریاست سے ایک طرح کا باغی کر رکھا تھا لہذا ذہنی طور پر نوکری کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

نہ عالی کے پاس ڈگری تھی نہ آمدنی مگر نکاح کے لیے بضد تھے۔ ایک شام بے اختیار پہلا دوہا کہا کہ

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے

مَن کی آگ بجھی نہ کسی سے، اُسے یہ کون بتائے

دوسرا دوہا نکاح کے بعد کہا کہ

نا مرے سر کوئی طرہ کلغی نا کھیسے میں چھدام

ساتھ میں ہے اک ناری سانوری اور اللہ کا نام

اور اس کے بعد پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور عالی دوہے کہنے لگے۔ ۱۹۴۵ء میں جبکہ عالی شادی کر چکے تھے اور کالج بھی چھوڑ چکے تھے۔ ان کے اردو مطالعے میں فیض، میرا جی اور راشد رہتے تھے اور دوستوں میں اختر الایمان، مختار صدیقی اور خورشید الاسلام جیسے لوگ شامل تھے یہ سب عالی سے سینئر تھے۔ عالی کئی مشاعروں میں شرکت کر چکے تھے یہ سائل صاحب کا آخری زمانہ تھا وہ بینائی سے محروم ہو چکے تھے عالی نے اس کا احوال کچھ یوں بیان کیا ہے کہ "میں ان کی بینائی سلب ہو جانے کے بعد دو تین برس ان کا کاتب بھی رہ چکا تھا (وہ شعر کہتے تھے اور میں لکھتا تھا) اور ہفتے میں دو تین بار حاضری کا معمول جاری تھا۔ ایک دن میری بیوی چچا جان کے رومال تہہ کر رہی تھیں، میں ان کے ماہانہ وظیفہ کے متعلق حکومت کو ایک احتجاجی یادداشت لکھ رہا تھا اور بھق بھق سگریٹ بھی پی رہا تھا چچی جان حسب دستور ان کی بد پرہیزی پر خفا ہو رہی تھیں۔ میری بیوی سخت سعادت مندی کے موڈ میں تھیں۔

"دادا جان آپ انہیں شاگرد کر لیجئے نا۔ اب تو ان کی امیدواری کو اتنے دن ہوئے"۔ وہ بولیں۔ وہ ان کی پوتی ہوتی تھیں۔ برادری میں رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اے لڑکی دُر تجھ پر"۔ چچی جان دھاڑیں۔ "ہمارا بچہ بھی اچھا خاصا چل نکلا ہے۔ اب عمر ہو لے تو مقابلہ کا امتحان دلوا یہ شاگردی استادی کے چکر میں نہ ڈال دیکھا سے ہر آدمی تو نواب مرزا خاں نہیں ہوتا"۔ وہ داغ کی بیٹی تھیں۔ "ہوں" چچا جان لیٹے لیٹے مسکرائے۔ ان کا چہرہ دودھ کی طرح ہو گیا تھا اور ہڈیاں رخساروں کو چیر کر ابھر آئی تھیں۔ "اب سفارش پہ اتر آئے ہیں مرزا صاحب۔ نا بیٹی ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔"

میراجی چاہا کہ رودوں۔ میں نے عمر میں پہلی بار سنجیدگی سے سوچا کہ کاش میں ان کا شاگرد ہو جاتا جانے کیوں مگر میں نے اس احساس میں بہت شدت محسوس کی۔

"چچا جان سیریس لی آپ شاگرد کر لیجئے، یعنی اب میں سچ مچ کہتا ہوں۔" میں کڑھ رہا تھا۔ "نابیٹا تمہیں زبان سے لگاؤ ہے اور تمہیں، تمہیں شاید کسی چیز سے بھی لگاؤ نہیں ہے۔" انھوں نے منہ پر مکھیوں سے بچنے کے لئے ململ کا ٹکڑا ڈال لیا اور آہ بھر کر غافل سے ہو گئے۔ وہ اسی مہینے انتقال کر گئے۔" (۲۰)

یوں عالی کڑھتے ہی رہ گئے اور تاعمر سائل کے شاگرد نہ ہو سکے۔ ۱۹۴۵ء ہی میں عالی نے ایم۔اے (سال اوّل) سے تعلیم چھوڑ دی اور گھر بار چھوڑ کر دنیا کی خاک چھانی ۱۹۴۶ء میں عالی دہلی کو خیر باد کہہ کہ اختر الایمان کے پاس پونا کی طرف روانہ ہوئے ان دنوں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں عالی کی ملاقات میراجی سے زیادہ رہی اور عالی نے انہیں اپنے کچھ دوہے سنائے لیکن عالی کو یہ صحیح سے یاد نہیں ہے کہ انھوں نے یہ دوہا میراجی کو اپنی شادی (۱۹۴۴ء) کے بعد دہلی آنے پر سنائے تھے یا ۱۹۴۶ء میں پونا میں سنائے تھے۔ عالی نے اپنے ایک انٹرویو میں اپنی ابتدائی دوہا نگاری سے متعلق باتیں کرتے ہوئے یہ ذکر کیا ہے اور میراجی نے یہ دوہے سن کر عالی کو جو ہدایات دیں وہ عالی کی زبانی کچھ یوں ہیں۔

"دلی آیا...... میراجی صاحب سے ملنا ہوا۔ انہیں دوہے سنائے یا شاید ۱۹۴۶ء میں پونا میں سنائے تھے۔ انھیں پسند آئے کہا اگر میں اب "ادبی دنیا" کا مدیر ہوتا تو تمہیں بڑے زور و شور سے متعارف کراتا۔ بہر حال یاد رکھنا کہ یہ غزل سے زیادہ مشکل ہے مگر شاید تم سے چل جائے۔ بس دو کام کرنا۔ دوہے میں بالکل سچ بولنا، غزل جیسی معنی آفرینی نہ کرنا اور ہندی زبان نہ پڑھنا ورنہ اردو کے لیے مشکل لفظیات میں پھنس جاؤ گے۔ یہ تازگی اور شادابی اس کی بحروں کی پابندی کا شکار ہو جائے گی"۔ (۲۱)

عالی کہ کہنا ہے کہ میں نے ہندی نہیں پڑھی اس لیے دوسری ہدایت پر عمل کا یقین نہیں پورا ہوا یا نہیں ہوا یہ فیصلہ سامع، ناقد اور قاری کو کرنا چاہیے۔ ہاں البتہ غزل کے ساتھ ساتھ حالات زندگی پر بھی دوہا گوئی ہونے لگی۔ وہ ہمیشہ ترنم سے پڑھتے تھے اور انھوں نے پڑھے ہیں آلھا اودل کی تیز اور بلند لے کو اپنے فعلن فعلن کے ساتھ ذرا مدھم کر کے جو دیکھا تو بڑا لطف آیا۔ اس کے بعد عالی نے دلی کے مشاعروں اور کالجوں میں اپنی دوہا گوئی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ اس کے بعد ایک دوبار پرانی دلی کے مرتے ہوئے مشاعروں میں پڑھے تو وہاں کا ردعمل حیرت، غصے اور خاموش احتجاج میں ابھرتا پایا۔ وہ طرح باز لوگ تھے۔ کالجوں میں پڑھے تو لڑکے لڑکیاں بھونچکے اور پھر میرے دیوانے ہو گئے۔" مگر پھر میں دلی میں کم ٹھہرا۔ پونا، بمبئی، حیدرآباد دکن گیا۔" (۲۲) عالی نے جہاں بھی اپنے دوہے سنائے بہت کامیاب رہے پھر وہ دلی واپس آ گئے۔ مشاعروں پر ہندو مسلم فسادات کے اثرات غالب آ رہے تھے وہ معطل ہو گئے پھر جلد ہی پاکستان بن گیا اور عالی پاکستان (کراچی) گئے۔ یہاں طرحی مشاعرے شروع ہو گئے تھے اور مشاعروں میں غزل پڑھنے کا رواج تھا۔ عالی کے

دوہے گو کہ ذاتی ہو کر رہ گئے تھے مگر پھر بھی برابر کہتے رہے پھر ذرا زندگی نے کروٹ بدلی اور عالی نے دوہے پڑھنے شروع کیے تو پورے پاکستان میں پذیرائی ہونے لگی اور عالی کے دوہے بہت مقبول ہو گئے۔

۱۹۴۹ء میں عالی نے ایک طویل منظوم ڈرامہ "انسان" شروع کیا جو مختلف اقساط میں قدیم اور جدید "نیا دور" ارباب قلم" " تخلیقی ادب" کراچی" افکار" اور" مدیر" کراچی اور مگر "ماہ نو" میں شائع ہوتا رہا۔ اس وقت (پاکستان میں) کوئی اتنا طویل نہیں لکھا گیا تھا۔ (۲۳) تادم تحریر زہ مکمل نہیں ہوا ہے اس پر گفتگو آگے آتی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں عالی نے سی۔ ایس۔ ایس کا امتحان پاس کیا اور انکم ٹیکس سروس میں انکم ٹیکس افسر ہو گئے اس دوران عالی کی شاعری کا ارتقائی سفر جاری رہا۔

عالی کا کلام

۱۹۵۱ء سے "ماہ نو" کے مختلف پرچوں (اور دیگر رسالوں (؟)) میں چھپتا رہا۔

۱۹۵۲ء میں عالی کا ایک منظوم افسانہ "وہ مغموم آنکھیں" ساقی میں چھپا۔ یہ افسانہ ایک ہیئتی تجربہ تھا اور اسے لوگوں نے پسند کیا۔ اس میں نحو تمام تر نثری ہے جبکہ تمام کہانی خود بقول شاعر فعولن فعولن میں لکھی گئی ہے۔ ۱۹۵۷ء میں عالی کا پہلا مجموعہ کلام "غزلیں، دوہے، گیت" شائع ہو۔

جس پر محمد حسن عسکری نے دیباچہ میں عالی کی شاعری کی بنیادی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی شاعری کے تابناک مستقبل کی بالکل درست پیشن گوئی کی تھی لیکن عالی" کا "لاحاصل" میں کہنا تھا گو بعد میں یہ موقف نہیں رہا "افسوس میں عسکری صاحب کی توقعات پوری کرنے میں بہت جلد ناکام ہو گیا۔ نجانے کن چکروں میں پھنس گیا۔ شعر سے بے رخی کی جائے تو شاعری سخت ترین سزا دینے سے باز نہیں آتی۔ ان دس پندرہ برسوں میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ میری زندگی میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اس مجموعے سے پہلے بھی مطمئین نہیں تھا۔ اب دیکھتا ہوں تو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی"۔ (۲۴) عالی نے جو کچھ کہا وہ ہماری تہذیب میں انکسار کی روایت کا جزو ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالی اپنی شاعری کو انتہائی غیر اہم چیز سمجھتے تھے۔ اپنی شاعری کے بارے میں عالی کے اس قسم کے رویے کی بناء پر محمد حسن عسکری کو عالی سے یہ شکایت تھی کہ "وہ اپنی شاعری کو اتنی سنجیدہ چیز نہیں سمجھتے جتنی وہ دراصل ہے۔ (۲۵) مگر اس شکایت کے باوجود اردو کے اس سخت گیر نقاد نے "غزلیں، دوہے، گیت۔" کے دیباچے میں عالی کو اپنے دو ڈھائی پسندیدہ شعراء میں شمار کیا تھا۔ اور یہ پسندیدگی محض عسکری کی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا دائرہ عوام و خواص دونوں میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کم و بیش اسی زمانے میں نظیر صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں عالی کو فیض کے بعد شعراء کی نسل پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا شاعر قرار دیا ہے۔ "فیض کے علاوہ جو شاعر اردو شاعروں کی نئی نسل پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہے وہ عالی ہیں۔" (۲۶) عالی جہاں اپنے زمانے کی نئی نسل پر سب سے زیادہ اثر انداز

ہوئے وہیں انہیں دوسرے شعراء سے اس لیے بھی فوقیت حاصل ہے کہ اردو میں دو ہے کی صنف ان ہی کی بدولت متعارف اور مقبول ہوئی۔ جمیل الدین عالؔی کے اس مجموعہ کلام کی ترتیب میں سب سے پہلے غزل ہی ہے۔ اور اس کی وجہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے یہ بیان کی ہے کہ "ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا جو اپنے آپ کو دہلوی کہتا ہے۔ آلِ میر درؔد میں اپنے آپ کو شمار کرتا ہے۔ میرؔ اور غالبؔ سے اپنا ذہنی ناطہ جوڑتا ہے اور جو شعوری اور غیر شعوری طور پر اقبالؔ سے بھی متاثر ہے جسے فیضؔ کی بڑائی کا احساس ہے۔ وہ غزل کہے گا اور ضرور کہے گا۔" (۲۷) دراصل عالؔی کی شاعری ان کی شخصیت کا مکمل اظہار ہے اور اس میں ان کی زندگی کے مختلف روپ ملتے ہیں اس اعتبار سے ان کی غزل خصوصیت کی حامل ہے اس میں ان کی افتادِ طبع و ذہنی رجحانات، افکار و خیالات، عقائد و رسومات اور نظریات و تصورات کا واضح عکس نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل غزلوں میں عالؔی کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہے۔ عالؔی کے مشاہدات و تجربات، ان کی ذہنی واردات اور جذباتی کیفیات کی تصویریں ملتی ہیں۔ مثلاً

تجھے تو کیسے بتاؤں کہ خود بھی یاد نہیں

کہاں کہاں کی ترے غم نے خاک چھنوائی

مسرتیں جو ملیں تیرے لطفِ پیہم سے

مچل رہی ہیں کسی جور ناگہاں کے لیے

وہ تیری یاد جو اب تک سکونِ قلب تپاں تھی

تری قسم ہے کہ اب وہ بھی ناگوار ہے آجا

دلِ آشفتہ پر الزام کئی یاد آئے

جب ترا ذکر چھڑا نام کئی یاد آئے

عالؔی ان غزلوں میں عشقیہ جذبات کو حقیقت پسند انداز میں پیش کرتے ہیں۔ عشقیہ کیفیات اور واردات میں انسان کی عام حرکات و سکنات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اس کی بے بسی، مجبوری، عمل، ولولے، خوشی، غم کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ عالؔی نے نازِ حسن اور نیازِ عشق کو عمومی انداز سے پیش کیا ہے۔ مثلاً ان کی غزلوں کے یہ اشعار جن میں عشق کی واردات، کیفیات اور معاملات کی وضاحت تو کی گئی ہے لیکن ذرا گہرائی میں جانے سے کئی دیگر مناظر بھی سامنے آتے ہیں۔

ذہن تمام بے بسی روح تمام تشنگی

سو یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے انتظام

اب جو یہ اعتراض ہے اتنے برس میں کیا کیا

تیرے بغیر صبح و شام اپنے کہاں تھے صبح و شام

ہزار خشک رہا اپنی زندگی کا چمن
تری بہار کو لیکن کبھی خزاں نہ کہا

یوں تو نہ رہ سکوں گا میں اے نگہ غلط خرام
یا کوئی منزل سکوں یا کوئی راہ بے مقام

وہی تعلق خاطر ہے آج بھی تجھ سے
بایں حوادث ایام و گردش افلاک

کیا کیا رہی نشاط نظارہ اور آج کل
یہ بھی خبر نہیں وہ ملے تھے کہاں مجھے

اندھیری رات میں کیا کیا صدائیں آتی تھیں
سواں کو یاد کیا اور وہ یاد آئے گئے

الجھے ہوئے ہیں گیسوئے جاناں ہیں آج تک
عالی چلے تھے کاکل گیتی سنوارنے

ان اشعار کے پسِ منظر میں عشق کا جذبہ کارفرما ہے لیکن عالی نے اسے پیش کرتے وقت سماجی اور اجتماعی محرکات کو بھی اہمیت دی ہے اسی لیے یہ اشعار ایک وسیع پسِ منظر رکھتے ہیں۔ یہ محض جذباتی روحانیت نہیں ہے اس میں حقیقت پسندی کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے اسی لیے ان اشعار میں غم عشق کے ساتھ غمِ روزگار اور گیسوئے جاناں کے ساتھ کاکل گیتی کو سنوارنے کے خیالات نمایاں ہیں۔

عالی عشق سے زیادہ زندگی کے شاعر ہیں۔ وہ عشق کے پردے میں زندگی کی باتیں کرتے ہیں۔ زندگی جن حالات سے دوچار ہے اور ان حالات کے نتیجے میں عالی ایک نئے لب و لہجے میں بات کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان اشعار میں زندگی کا شعور گہرا اور رچا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

یہ عمر بھر کے رشتے جو ٹوٹ جاتے ہیں
گلہ ہی کیا ہے کہ ظالم ہے وقت کا دھارا

کسی میں عیب نکالیں تو کیا کہ ہم اپنا
ز فرق تا بہ قدم کر چکے ہیں نظارہ

عالی کے اشعار میں غزل کا مخصوص رنگ و آہنگ بھی موجود ہے اور زندگی کی عام باتیں بھی ہیں۔ زندگی کے دشت

میں کسی ہمدم و دمساز کے نہ ملنے اور صرف اپنی ہی آواز کے سننے، ہزاروں ہنستی ہوئی صورتوں میں سے ہر ایک تبسم کی لو کو اشک آمیز دیکھنے، صبح کے طلوع نہ ہونے، اور رات کو صبح کی آس میں لو لگائے رہنے، آشیاں کے جلنے اور زندگی کے مسلسل کرب و پیہم میں گزرنے، زندگی کو رائیگاں نہ کہنے، وقت کے دھارے کو ظالم سمجھنے، کسی کو عیب سے خالی نہ دیکھنے کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا تعلق عام انسانی زندگی اور اس کے معاملات و مسائل سے ہے۔ ایسے ہی خیالات کی وجہ سے عالؔی زندگی سے بہت قریب ہیں۔ ایسے مضامین اس مجموعے کی غزلوں میں ہر جگہ موجود ہیں لیکن غزل کی کائنات صرف یہی نہیں ہے بلکہ غزل گو ایک ایسے ذہن کا مالک ہے جو زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ غزل کی دلنواز لے میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

سوکھ چلے وہ غنچے جن سے کیا کیا پھول ابھرتے تھے
اب بھی نہ ان کی پیاس بجھی تو گھر جنگل ہو جائے گا

نازک مضامین کو غزل کی زبان میں ادا کرنے سے فنی اظہار میں بھی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے عالؔی یہاں واعظ، مصلح یا انقلابی بن کر سامنے نہیں آئے بلکہ وہ اثر پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ اثر دیرپا قائم رہتا ہے۔

دوہا۔

دوہے کی تکنیک پر بہت سے مباحث سامنے آچکے ہیں۔ دوہا ایک ہندی صنف سخن ہے۔ ہندی میں یہ شعر کی اکائی ہے دوہا اسی طرح مکمل ہوتا ہے جس طرح غزل کا شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے غزل میں متعدد شعر ایک ہی ردیف و قافیہ کے یکجا کر دیے جاتے ہیں چاہے ان کے مضامین کتنے ہی مختلف و متضاد کیوں نہ ہوں مگر دوہا صرف اکائی کی صورت میں رہتا ہے اور کسی دوسری صنف یا ہیئت کا حصہ نہیں بجائے خود صنف ہے۔

اس لفظ کا ماخذ ہندی علماء "دوئی پد" (۲۸) کو بتاتے ہیں اس سے یہ بات خود بخود آشکارا ہوتی ہے کہ یہ دو مصرعوں پر مشتمل چھند ہے دوہا وہ صنف ہے جس میں پہلی بار قافیہ بندی کی کوشش کی گئی ہے قدیم دوہے کے پہلے اور تیسرے چرن میں تیرہ تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ (۲۹) دوسرے اور چوتھے مصرعے میں ماتراؤں کی تعداد گیارہ گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ دوہے میں بلحاظ حروف موضوع اور عروض کی بھی کئی پابندیاں ہیں اور اس اعتبار سے ہندی میں دوہے کی متعدد اقسام ہیں لیکن دوہا بنیادی طور پر سادھوؤں، سنتوں اور بھگتوں کی دلچسپی کی چیز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اردو شعراء نے دوہے کی صنف کو ابتداء میں اپنایا وہ سب صوفی اور فقیر تھے۔ اردو دوہے میں ہندی عروض کی پابندیاں نہ برتی جا سکتی تھیں نہ برتی جانی چاہیے اس لیے اردو دوہے نے اپنا ایک علیحدہ روپ دھارا جس میں ماتراؤں، سکتوں اور ہندی

عروض کے قواعد کی پابندی کے بجائے اردو کے رائج عروض کا سہارا لیا گیا ہے۔ گیت کی شیرینی، دوہے کی موضوعاتی روایت اور موسیقی کی لے نے مل ملا کر اردو دوہے کے مزاج کی تشکیل کی ہے اس لئے اردو دوہے کو ہندی روایات کی کسوٹی پر کسنا مناسب نہیں۔ غزلوں کے بعد دوہوں کی خاصی تعداد ان کے اس مجموعہ کلام میں موجود ہے۔ غزلوں کی طرح یہ دوہے بھی حسین اور دل آویز ہیں۔ ان میں رعنائی کا احساس ہے یہ شعریت سے بھرپور ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجہ کی شاعری موجود ہے۔ جذبے اور تخیل کی ہم آہنگی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ پیکر تراشی اور تصویر کشی کے رنگ شوخ اور خطوط تیکھے ہیں۔ تشبیہ، اسعارات بھی بہت کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ وزن و آہنگ میں ایک فطری روانی پائی جاتی ہے ان ہی تمام عوامل نے مل کر عالؔی کے دوہوں کو بہت دلکش اور دل آویز بنا دیا ہے اسی لیے یہ براہ راست حواس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان دوہوں میں عالؔی کی ہدایت اور احساسات کی پوری دنیا آباد ہے۔ زندگی کا احساس بھی جلوہ گر ہے اور حالات کا شعور بھی موجود ہے ان دوہوں کا مقصد محض تفریح نہیں بلکہ یہ تو بقول عالؔی من کی آگ بجھانے کے لیے کہے گئے ہیں۔ ان دوہوں میں فن کار چاہوا احساس ملتا ہے۔ عالؔی زندگی کے ہر پہلو میں حسن کو تلاش کرتے ہیں اور اسے شدت سے محسوس بھی کرتے ہیں۔ یہ ان دوہوں میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

روپ بھرا مرے سپنوں نے یا آیا میرا میت
آج کی چاندنی ایسی جس کی کرن کرن سنگیت

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھنچے ہے تن کی جیسے مدرا کرے اتار

پورب کی ابلا دکن ابلا یا پنجاب کی نار
عالؔی اپنے من پر سب کے گہرے گہرے وار

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا روپ
تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

کہو چندرماں آج کدھر سے آئے جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری نار کو دیکھ آئے

یہاں میت کے آنے کے ساتھ چاندنی کی ایک کرن کے سنگیت بن جانے، متوارے نیناں کے ساتھ ساتھ نس نس کے کھنچنے، پورب، دکن اور پنجاب کی ابلاؤں کو دیکھ کر گہرے گہرے وار سہنے، گھنی گھنی پلکوں اور گرماتے روپ کو چھاؤں اور دھوپ سمجھنے، ناری تو دیکھ آنے کے ساتھ چندرماں کی جوت بڑھائے کے مشاہدات اور محسوسات کا رنگ نمایاں ہے اور اسی رنگ سے ان دوہوں میں بڑا رچاؤ پیدا ہوا ہے۔

غزل کی طرح دوہوں میں بھی موضوع کی قید نہیں ہوئی لیکن جذبے کی شدت اور بیان کا بے ساختہ ہونا ضروری ہے۔ دومصرعوں میں پورے خیال کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کرنا ایک مشکل فن ہے۔

میں نے کہا کبھی سپنوں میں بھی شکل نہ مجھ کو دکھائی
اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن اسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

کہو چندرماں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھانے
میں جانوں کہیں رستے میں میری ناری کو دیکھ آئے

ڈھونڈ لو میری ناری کو ہے اس کی اک پہچان
چنگی لو تو پکھل بہے اور پوجو تو بھگوان

بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار
پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

ان دوہوں میں محض ہندی الفاظ کا رسمی استعمال نہیں ہے اور نہ ہی صرف کبیر، بہاری، میرا، رحمن اور تلسی داس کی بازگشت سنائی دیتی ہے بلکہ ان دوہوں میں عالؔی کی زبان ان کی اپنی زبان ہے۔

عالؔی نے اپنے دوہوں میں جذباتی کیفیات اور واردات کو بھی بڑی خوبی اور صفائی سے پیش کیا ہے انسانی زندگی کے جذباتی عمل اور ردعمل کی بھرپور ترجمانی ان دوہوں میں نظر آتی ہے۔

ٹھنڈی چاندنی جلا بستر بھیگی بھیگی رین
سب کچھ ہے پر وہ نہیں جن کو ترس گئے مرے نین

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پر ایسے جیسے لگے کٹار

جاڑا آیا ٹھنڈی ہوائیں من سب کے برمائیں
کتنے درد کی بات ہے گوری ہم تجھے یاد نہ آئیں

عالؔی زندگی کو صرف ایک جذباتی اور رومانی زاویہ نظر ہی سے نہیں دیکھتے رہتے بلکہ ان کی نگاہیں تو زندگی کے حقائق کو ٹٹولتی ہیں اور اس کی تلخیوں، سنگینیوں تک جاتی رہیں۔ عالؔی گہرے انسانی شعور کے مالک ہیں۔ ان کا مزاج حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ عشقیہ معاملات کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ملا دیتے ہیں۔ ساجن کا مل کر جدا ہونا انہیں ہر فرد کا غم نظر آتا ہے۔

یہ دوہا ہے اپنے ہی من کا روتا کیا ہر من میں لگی ہے آگ (ساجن مل کر جدا نہ ہوں اے سکھی یہ کس کے بھاگ) ان کے نزدیک پریت ہی روگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

میٹھی میٹھی کسک تھی دل میں نا کوئی غم نہ سوگ

دو ہی دن کے بعد مگر یہ پریت تو بن گئی روگ

عالی دوہوں میں براہ راست بات کرتے ہیں اور زندگی کے حقائق کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں کسی قسم کی جھجک نہیں وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، ظاہر کر دیتے ہیں۔ حیدر آباد کے بارے میں کہتے ہیں کہ

ہم کو حیدر آباد نہ بھایا تھا جو روپ انوپ

اندر کتنی کالک تھی اور باہر کتنی دھوپ

یہ رائے ان کی حقیقت پسندی کی دلیل ہے ایسی بیشتر مثالیں ان کے دوہوں میں پائی جاتی ہیں۔ زندگی کے دکھ اور سکھ کی حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

ہے بالک اس جگ میں رکھیو آندھی جیسے ٹھاٹ

نیچے پودے اونچے کیجو اونچے دیجو کاٹ

ہے بالک تو جگ جگ جیوے رکھیو یاد یہ بول

جیون کے اندھیارے میں ہیں دکھ ہی سکھ کا مول

آتما جیسی بانکی تتلی جب بن جائے شریر

اور نہ جانے اب جیون کی کیا کیا ہوتا تیر

ہے بالک سب دھوکا ہے وہ نیائے ہو یا انیائے

پر وہ دھوکا کبھی نہ دیجیو جو تو آپ نہ کھائے

سنو سنو یہ بالک میرا یوں ہی نا چلائے

کہوے ہے اس بندی گھر میں کاہے مجھے لے آئے

ان دوہوں میں انسانی زندگی کی اہم اور بنیادی حقیقتوں کا اظہار ہے اس لیے یہ اثر کرتے ہیں اور ان کا یہ اثر دیر تک قائم رہتا ہے۔ عالی کے دوہوں میں معاشرتی حالات کا شعور بھی نمایاں ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ زندگی میں معاشی حالات کی ناہمواری انسانیت کی انفرادیت کو ختم کر دیتی ہے۔ انسان کا پیٹ اس سے کیا کیا نہیں کرواتا ہے۔ روٹی کی تلاش در در کی خاک چھنواتی ہے۔ انسان اس کے لیے مارا مارا پھرتا ہے۔

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے
عاؔلی جیسے مہا کوی بھی بابو جی کہلائے

روٹی جس کی بھینی خوشبو ہے ہزاروں راگ
نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ

بھوکی آنکھ سے بیٹا دیکھے خالی پیٹ ہو باپ
ساوتری ماں بیٹی لاج سے روز کرائے پاپ

واں وہ نین کنول مرجھائے سوکھ گیا یاں یاڑ
بھوک کی گرمی سب کو بھونے ندی ہو کہ پہاڑ

آلھا اودل گانے والے پیادے سے کترائیں
بل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

کھیت کٹا تو لے گئے ٹھاکر منشی ساہوکار
گھر پہنچے تو بھوکی بہو اک برچھی سی دے مار

بھتی سونا چاندی اگلے گھر میں پہنچے روگ
پاسی آگ انگار چبائیں بنئے اڑائیں بھوگ

زندگی کی اسی صورت حال میں عاؔلی یہ راگ چھیڑتے ہیں کہ

عاؔلی نے اک لیا مجیرا اور چھیڑا یہ راگ
جس کا کھوج لگا پچھم میں پر جو سب کی آگ

ہے بھین یہ کھیت ہمارے ہمیں میں سے سرکار
ہے بھین ہم ایک ہی ندی وہی جل اور وہی دھار

ہے بھین اس دھرتی ماں کی کوکھ میں سب کا ناج
ہے بھین اس دھرتی ماں پر ایک کرے کیوں راج

ہے بھین یہ تیری بانہیں جیسے لوہا لاٹ
ہے بھین یہ تیری بانہیں سب کو کرائیں ٹھاٹ

ہے بھین ترا اجلا چہرہ ان کے رنگ بڑھائے
ہے بھین تری اپنی عورت دوجے کے گھر جائے

ان کے بعد وہ ایک نئی زندگی اور ایک نئے نظام کا خواب دیکھتے ہیں۔

ہے بھین وہ دیکھ سے نے اپنی تان لگائی

ہے بھین وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی

اک دوجے کا ہاتھ پکڑلو اور آواز لگاؤ

اے اندھیارو! سورج آیا سورج آیا، جاؤ

عالی سورج کو ابھرتا ہوا اور اندھیرے کو چھٹتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہ ان کا گہرا سماجی وطبقاتی شعور ہے اور یہ ان کے وقت کا بہترین بناض ہونے کا ثبوت ہے۔ عالی کے دوہوں میں ان کا نقطہ نظر اور نظریہ حیات ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ جو ان کی شخصیت اور مزاج کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ایک جگہ اپنی بابوگیری کا ذکر کرتے ہوئے بڑی اہم حسی پیچیدگیوں اور معاشی حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں۔

بابوگیری کرتے ہو گئے عالی کو دو سال

مرجھایا وہ پھول سا چہرہ بھورے پڑ گئے بال

دھیرے دھیرے کمر کی سختی کرسی نے لی چاٹ

چپکے چپکے من کی شکتی افسر نے دی کاٹ

دھرتی کی کٹھن راہوں کے بنجارے کو یہ بول بھی سنائی دیتے ہیں۔

اک گہرا سنسان سمندر جس کے لاکھ بہاؤ

تڑپ رہی ہے جس کی اک اک موج پہ جیون ناؤ

کیا جانے یہ چلی کہاں سے اور کہاں تک جائے

کون کنارا چھوڑ آئی ہے کون کنارا پائے

عالی کے ان دوہوں میں مضامین کا تنوع پایا جاتا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی معاملات مسائل کو شاعرانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ عالی کے یہ دوہے ایک تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی جدت پسند طبیعت کا کرشمہ ہیں۔ یہ تجربہ اردو شاعری میں ایک نئی صنف کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے اور اس فنی دریافت کا سہرا بلاشبہ عالی کے سر جاتا ہے۔ عالی کے اس مجموعہ کلام میں کچھ گیت بھی شامل ہیں۔ ان کا مرتبہ بھی غزلوں اور دوہوں کے برابر ہے ان میں بھی جدت کا عنصر موجود ہے۔ یہ ایک رنگ و آہنگ کے حامل ہیں۔ یوں تو ان کے موضوعات غزلوں اور دوہوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان میں آفاقیت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے اور یہ گیتوں کے لیے ضروری بھی ہے۔ ان گیتوں میں جمالیاتی حسن اور دلکشی پائی جاتی ہے۔

کوئی آئے گا کوئی آئے گا

آدرشوں کا خوں پیتے ہیں

ہم اسی سہارے جیتے ہیں

کوئی اپنی پھلواری کو بھی

مہکائے گا

کوئی آئے گا

یہ قافلے ہیں انسانوں کے

یا کھیت ہیں سوکھے دھانوں کے

کبھی آن پر بھی کوئی مدبر کھا

برسائے گا

کوئی آئے گا

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

سخت اور تیز کلہاڑوں جیسے

دیکھے لوگ پہاڑوں جیسے

کتنی جلد بکھر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

آدم سے عالی تک آئے

سب کے سب اک جیسے پائے

پیدا ہو کر مر جاتے ہیں

آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں

یہ گیت فکری اعتبار سے خیال انگیز اور جمالیاتی لحاظ سے حد درجہ دلاویز ہیں۔ آخر میں ایک کہانی ہے "دو مغموم آنکھیں" جو ہے تو نثر میں لیکن شروع سے آخر تک فعولن فعولن میں لکھی گئی ہے۔ یہ اک تجربہ ہے جس میں عالی کامیاب رہے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ ایک ابھرتے ہوئے شاعر کے کلام کا اچھا ترجمان ثابت ہوا۔ گوکہ اُس وقت ابھی عالی کا

نقطۂ عروج نہیں آیا تھا مگر پھر بھی عالی کی آواز کی انفرادیت تسلیم کی جا چکی تھی۔ ان کی آواز سب سے الگ سنائی دے رہی تھی اس لیے اس مجموعے کے مقدمہ نگار نے عالی کو ان دو ڈھائی شعراء میں شمار کیا تھا جن کا کلام کا وہ دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

تیسرا شعری مجموعہ (؟)

جیوے جیوے پاکستان ۱۹۷۴ء

غزلیں، دوہے، گیت

غزلیں، دوہے، گیت ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا اور پھر سترہ (۱۷) سال بعد ۱۹۷۴ء میں غزلوں، دوہوں، گیتوں اور نظموں پر مشتمل مجموعہ "لاحاصل" کے نام سے منظر عام پر آیا اس کا دوسرا ایڈیشن ان غزلوں، دوہوں، گیتوں اور نظموں کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا جو عالی نے ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۴ء تک لکھے۔ یعنی "غزلیں، دوہے، گیت" کے بعد ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۴ء تک عالی کی ستائیس سالہ تخلیقی کاوشوں کا حاصل اب ایک ایسے مجموعے کی صورت میں ہمارے سامنے آیا جسے عالی نے "لاحاصل" کا نام دیا ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ عالی نے ہمیں خود سے بدظن کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسے عالی کا حاصل کلام جانتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ جو کوئی بدظن ہوگا نقصان اٹھائے گا اور جو اس کے جھانسے میں نہیں آئے گا فائدے میں رہے گا۔ اس مجموعے کے نام کے سلسلے میں عالی کے جس رویئے کی طرف ڈاکٹر صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اس سے یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ عالی اپنی شاعری کو انتہائی غیر اہم چیز سمجھتے ہیں۔ اس کی شکایت محمد حسن عسکری نے بھی "غزلیں، دوہے، گیت" کا دیباچہ لکھتے ہوئے کی تھی کہ عالی اپنی شاعری کو اتنی سنجیدہ چیز نہیں سمجھتے جتنی کہ وہ دراصل ہے مگر اس شکایت کے باوجود انہوں نے عالی کو اپنے پسندیدہ شعراء میں شامل کیا تھا۔

"غزلیں، دوہے، گیت" کی غزلوں اور دوہوں میں جو رومانی جھلک موجود تھی۔ "لاحاصل" میں ان رومانی دوہوں میں ذرا تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی تجربے کی دین ہے۔ عالی نے خارجی روپ کے بجائے داخلی روپ کی طرف رُخ کر لیا ہے۔ اب "مجلسی حرکات" اور "دنیا دی کھیل تماشوں" کے بجائے ماہ و سال کو سوچ کی میزان پر تولنے لگے ہیں اور کچی عمر کی عاشقانہ لن ترانیوں کی جگہ احساسات پر غور و فکر کے مرحلے پر آ پہنچے ہیں۔ اب وہ محض جذبات کے مصور نہیں بلکہ ان کی نوعیت سمجھنے کی کوشش میں سرگرم سنجیدہ شاعر ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ ان کی ذات سے باہر بھی ایک دنیا سرگرم عمل ہے۔

کب سے ہم انصاف کے پیاسے چلتے ہیں اور کہتے ہیں
کوئی نہ کوئی صدی آئے گی اپنی آگ بجھانے بھی

ہر صدی کے موڑ سے راستے وہی کھلے

لوگ دیکھتے رہے چھپی حقیقتوں کے خواب

سننے والو غور نہ کرنا ورنہ پتہ چل جائے گا

ہم نے جتنے باغ سجائے وہ اب تک ویرانے ہیں

عالی کو اپنی "بے حاصلی" غور کرنے کا سلیقہ آ گیا ہے اور اسے معلوم ہے کہ وہ اتنا سرگرم عمل کیوں ہے۔ اپنی تنہائی کو چھپانے کے لیے ان کی ذات کا رخ انہیں دھوکا دیتا ہے اور انہوں نے خود کو کیا کیا فریب دیئے ہیں اور اس کشمکش میں کتنے مخلص ساتھی اس سے بچھڑ گئے ہیں۔

اس چالیس برس میں تم نے کتنے دوست بنائے

اب جو عمر بچی ہے اس میں کتنے دوست بناؤ گے

بچپن کے سب سنگی ساتھی آخر کیوں کر چھوٹ گئے

کوئی یار نیا پوچھے تو اس کو کیا بتلاؤ گے

جو تم نے شہرت پائی جو بھی تم بدنام ہوئے

کیا یہی ورثہ اپنے پیارے بچوں کو دے جاؤ گے

اس بار جو آیا ہوں تو اے کوچہ جاناں

تیرے در و دیوار صدا کیوں نہیں دیتے

"غزلیں، دوہے، گیت" کا عالی، مرزا غالب کا دوسرا روپ تھا۔ غالب کی بحریں اور ذخیرہ الفاظ پہلے مجموعہ کلام کی بنیاد ہے۔ دوہوں میں اپنی روح کے اعتبار سے عالی عاشق مزاج ہیں لیکن "لا حاصل" تک آتے آتے یہ رنگ ماند پڑنے لگتا ہے۔ اب ماضی کی یادیں سلگتی ہیں۔ اب عالی کو اپنی بدنامی کا احساس ہے۔ ٹھکرائے جانے کا خوف ہے۔ سارا جوش انجمن آرائی کا ہے۔ دراصل باطنی خلا کو پر کرنے کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ عالی اندر سے ٹوٹا ہوا اور احساس تنہائی کا شکار ہے۔

میری ہنگامہ پسندی پر ہی الزام رکھو

شاید اک یہ بھی علاج غم تنہائی ہے

جلسوں اور ہنگاموں میں جب تنہائی ڈستی ہے

باغوں اور ویرانوں میں جا کر دل بہلاتے ہیں

ہائے یہ اندر کی تنہائی جس کے لیے ہم چھوڑ آئے

تیرے شہر اور تیرے قریے اور اپنے ویرانے بھی

عالی کی ذات کا خارجی روپ نواب زادے کا ہے جس کی انا اسے ہر دم بے کل رکھتی ہے جس کے دن سیاسی جوڑ توڑ اور محفل آرائی کی کوشش میں گزرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے عالی کے غزلیں، دوہے، گیت" سے لا حاصل تک کے شعری سفر کو سست رو قرار دیا ہے اس لیے کہ عالی کے اندر شاعری کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں جن سے عالی نے بہت کم کام لیا ہے۔ اسی لیے ان کا "سرمایہ قلیل اور اس کا دائرہ اثر محدود ہے" (۳۰) دراصل غزل کے رسم و رواج نے عالی کو اساتذہ کے پختہ رویوں کی بار بار یاد دلائی ہے۔ ان کو اپنی آواز اور لہجے کو اس گرفت سے نکالنا مشکل کام ہے۔ دوہوں میں عالی نے اساتذہ کے کلام کی بازگشت سے چھٹکارا پایا ہے۔ غالب کی فلسفیانہ افتادِ طبع اور عالی کی رومانی وضع میں خاصا فرق ہے اس سے الگ ہو کر جب وہ دوہوں کی زبان میں بات کرتے ہیں تو زیادہ موثر شعری تجربے کا اظہار کرتے ہیں شاید اسی لیے بھی انہیں دوہوں کے شاعر کے طور پر زیادہ پذیرائی ملی۔ اس رنگ میں عالی نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ عالی کے دوہوں کا آہنگ، قوت و سرشاری عالی کا فن رہی۔ عالی کے عشقیہ تجربات نرم و نازک کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں کوئی بڑا دعوی نہیں، عالی پوری زندگی کا تجزیہ کرنے کا دعوی نہیں کرتے حالانکہ بعض جگہ کیا ہے اکثر وہ صرف ہلکی ہلکی رومانی کسک کا اظہار کرتے ہیں اور یہ دھیمی لے دوہوں اور غزلوں دونوں میں نظر آتی ہے۔

غزل کے چند اشعار جن میں رومانی تصور زیادہ نمایاں ہے۔

ہم نے صحرا میں رہ کے جو پکارا ہے تجھے

کتنے غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئی ہے

ہوئی امید کہ اب قیدِ فن سے اٹھتی ہے

اک آگ سی جو مرے تن بدن سے اٹھتی ہے

کہاں سے گزرے کسے پائمال کر جائے

بس اک تند ہوا ہے دمن سے اٹھتی ہے

عجیب رنگ کا طوفانِ باد ہے اس بار

تمام گرد حصارِ چمن سے اٹھتی ہے

جدا ہوئے بھی تو دونوں کی راکھ چمکے گی

سلگ چکی ہے تری روح میری جاں کی طرح

پہنچ کے منزل جاناں پہ ہم بکھر سے گئے
کسی تھکے ہوئے سالارِ کارواں کی طرح

عالی نے مسلسل دوہوں کو ایک مستقل صنف کی حیثیت دے دی ہے ان کے ان مسلسل دوہوں میں کہیں نظم اور کہیں مسلسل غزل کی سی صورت نظر آتی ہے اسے ہم اردو شاعری میں ایک اضافہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایسے چند دوہے مندرجہ ذیل ہیں۔

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ لاکھا گال پہ لالی آنکھیں بہت اداس

تیس روپے میں بیس ہیں اس کے دس لیوے دلال
اتنا مہنگا شہر اور اس میں اتنا سستا مال

اے رانی اب دل پر رکھ کر کھینچ نہ لینا ہاتھ
اے راجہ میں آج تری کل اور کسی کے ساتھ

اے رانی میں سرساگر ہوں اور کوی انمول
اے سرساگر کوی بس اپنے بھید نہ مجھ پر کھول

سرساگر کی ریت سنی تھی اک اک سر سے پیار
تیرے سر کی تال میں نکلی پیسے کی جھنکار

نا ہمیں جانے نا ہمیں سمجھے نا سمجھے کوئی بات
پوری گزری تو کیا گزرے گی اتنی لمبی رات

اے راجہ جب میں ویل بھر میں ہوئی تجھے جنجال
مجھ سے پوچھ کہ میں نے کیسے کاٹے اتنے سال

دوہوں کے تانے بانے سے بنی ہوئی اس کہانی کے علاوہ پنڈی میں ۱۹۵۷ء شعراء کی ناقدری، بنگلہ تارکی کہانی، پاکستان کتھا اور الجیریا بانی ایسے مسلسل دوہے ہیں جو اپنے اپنے عنوانوں کے تحت لکھے گئے ہیں اور قارئین کو وجد اور نغمگی سے بھرپور نظموں کی کیفیت سے محظوظ کرتے ہیں۔ کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جو موضوع کے اعتبار سے نظم اور اسلوب کے لحاظ سے مسلسل غزل کا مزا دیتے ہیں۔ مثلاً

کچھ دن گزرے عاؔلی صاحب عاؔلی جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریے قریے شعر سناتے جاتے تھے
قدرِ سخن ہم کیا جانیں ہاں رنگ سخن کچھ ایسا تھا
اچھے اچھے کہنے والے اپنے پاس بٹھاتے تھے
سامنے بیٹھی سندر ناریں آپ طلب بن جاتی تھیں
پردوں سے فرمائش کے سو سو پرچے آتے تھے

فیشن تھا یا خوش آوازی یا کچھ سحر جوانی تھا
کبھی کبھی تو ان پر گھر کے گھر عاشق ہو جاتے تھے
عشق تو ان سے کیا ہوتا ہاں پیار میں جیسی کچھ گزرے
جس انداز سے جن لفظوں میں آجائے کہہ جاتے تھے

عاؔلی کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ وہ واردات اور صرف واردات لکھنے کے قائل نہیں البتہ واردات میں تخیل کی رنگ آمیزی سے شعریت کا کچھ ایسا جادو جگاتے ہیں کہ قارئین اس کے احساس کی دنیا میں گم ہو کر ایک کیفیت اور وجد سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

عاؔلی کا جذبہ حب الوطنی انہیں سخت بے چین رکھتا ہے اور وہ بے چینی کا اظہار بڑے موثر انداز میں اپنی شاعری کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کریں لیکن ان کو دکھ ہے کہ تمام کوششوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا جس نے قومی سطح پر بھی انہیں لا حاصلی کے دکھ میں مبتلا کر دیا ہے۔ ملک و قوم کے تقاضوں سے بے تعلق ذاتی مفادات کے پیچھے بھاگنے والے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی تصویر کشی کرتے ہوئے "پاکستان کہتھا" میں کہتے ہیں کہ

عاؔلی اپنے دیس کی لکھیں اور ٹوڈی کہلائیں
سورما لوگ بدیسی پیسے کھائیں اور ترائیل
پیسہ کھانے کی ترکیبیں نقد وظیفہ سیر
اب جو کوئی جس کا کھائے مانگے اسی کی خیر
کوئی کھل کر جاپان دکھائے اور کوئی چھپ کر چین
کہیں بدیسی ڈفلی باجے کہیں بدیسی بین

جذبہ حب الوطنی کے آئینہ دار مزید چند درد انگیز اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

عالی تو نے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی
یہ تو بتا تری کو یتا رانی دیس کے کیا کام آئی

دھوئیں بھرے ہیں دلوں میں دماغ جلتے ہیں
چمن کے جسم پہ گل بن کے داغ جلتے ہیں

کوئی سبب کوئی اس کا علاج بھی ہوگا
کہ ہم بہار بساتے ہیں باغ جلتے ہیں

نہ بجھ سکا دل سوزاں جو آندھیوں میں تو آج
اس اک چراغ سے کیا کیا چراغ جلتے ہیں

عالی اپنے خون سے سینچیں جس کی اک اک کیاری
روندنے والے روند رہے ہیں وہ تازہ پھلواری

اب عالی پھر سینچ رہے ہیں ایک نیا گلزار
اک گلزار کو دھیان سے رکھنا جان سمجھنا یار

اس گلزار کو جان سمجھنا اس پر آنچ نہ آئے
پھر کوئی تجھ سا پھر کوئی مجھ سا اس کو روند نہ پائے

عالی کا اس مجموعے کا نام "لا حاصل" رکھنے کے دو سبب ہیں ایک شعوری اور دوسرا لاشعوری۔ شعوری سبب تو یہ ہوسکتا ہے کہ عالی فن کی جن بلندیوں تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ اپنے خیال میں ان بلندیوں کو ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اگر فنکار میں یہ احساس باقی نہ رہے تو اس کا تخلیقی عمل ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ عالی کو یہ شدید احساس ہے کہ وہ جو لکھنا چاہتے ہیں اب تک نہیں لکھ سکے۔ دوسرا سبب غیر شعوری ہے جس کا اندازہ اس مجموعہ میں شامل کلام سے بہ آسانی ہوتا ہے اس مجموعہ میں شامل اُن کے کلام میں اس بات کا نمایاں احساس ہے کہ نوع انسانی ہزاروں سال سے جس تہذیبی، اخلاقی اور سائنسی ترقی کا سفر طے کر رہی ہے وہ نوع انسانی کو لا حاصلی کے سوا کچھ نہیں دے سکا ہے کیونکہ روز مرہ مشاہدے میں ہے کہ ہر طرح کی ترقی کے باوجود انسان آج بھی ان دکھوں سے دوچار ہے جن کا دکھوں کا سامنا اسے ازل سے تھا البتہ ان دکھوں کی صورت زمانے کے مطابق ضرور تبدیل ہوگئی ہے لا حاصلی کا اظہار کرتے ہوئے عالی کہتے ہیں کہ۔

آج بھی مرے خیال بے حصول و بے مآل

آج بھی مرے سوال نا قبول و بے جواب

مے بھی جب کبھی ملی ساتھ تشنگی ملی

ایک زندگی ملی وہ یونہی رہی عذاب

سر حقیقت ہاتھ نہ آیا بھول گئے افسانے بھی

پہلے ہی کیا کچھ تھے عاقل اب ٹھہرے فرزانے بھی

کب سے ہم انصاف کے پیاسے جلتے ہیں اور کہتے ہیں

کوئی نہ کوئی صدی آئے گی اپنی آگ بجھانے بھی

صدیاں کہتی ہیں کہ بس دیر ہے اب قرنوں کی

اس قدر رنج سہا ہے تو ذرا اور سہی

صدیاں تو گئیں معرکہ عقل و جنوں میں

جو بات بتانی ہے بتا کیوں نہیں دیتے

نا قابل درماں ہوں ازل سے تو ابد تک

اک گوشہ دامن میں چھپا کیوں نہیں دیتے

اور اس نظم نما نغمے میں بھی کچھ اسی طرح کا احساس نمایاں ہے۔

کتنے دن سے چاند ستارے انسانوں کو دیکھ رہے ہیں

انسانوں کے خوابوں کو اور ارمانوں کو دیکھ رہے ہیں

اندھیاروں پر، روشنیوں کا ہلکے ہلکے چھا جانا

مظلوموں کا، رفتہ رفتہ، ظلم پر غالب آجانا

خوابوں کو اور ارمانوں کو

چاند ستارے انسانوں کو

دیکھ رہے ہیں دیکھ رہے ہیں

ایک سفر ہے شام و سحر ہے

ایک سفر ہے جس کی منزل آپ سفر ہے

ایک سفر ہے جس کا مطلب وا ہگزر ہے

انسان ترقی کا سفر مسلسل طے کر رہا ہے لیکن اب تک کسی مقام (منزل) تک نہیں پہنچ سکا اور مستقل قریب میں ابھی اس کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ انسان کی زندگی ایک سفر ہے اور اس کی منزل بذات خود ایک سفر ہے نوع انسانی کے حوالے عالیؔ کے ہاں لا حاصلی کا احساس کسی ملک یا قوم تک محدود نہیں ہے۔

لا حاصل کے دس سال بعد عالیؔ کا چوتھا شعری مجموعہ "اے مرے دشتِ سخن" ۱۹۹۵ء میں منظر ادب پر جلوہ افروز ہوا۔ اس میں عالیؔ کی شاعری کا معیار بتدریج بلند ہوا ہے اور عالیؔ کی شاعری کے نت نئے جوہر کھلتے ہیں۔ یہ مجموعہ اردو میں جدید شاعری کے حوالے کے حوالے سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں ایک بار پھر عالیؔ نے خود کو دوہے کا عظیم ترین شاعر ثابت کر دکھایا ہے دوہوں کے علاوہ اس شعری مجموعے میں غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی طویل نظم "انسان" کا بھی خاصا حصہ شامل ہے جس کی روشنی میں وہ انسان دوست ہی نہیں انسان پرست بھی نظر آتے ہیں۔

ایک طویل عرصے تک روایتی غزل، عشق و عاشقی، مے پرستی اور تصوف کے دائرے میں قید رہی یہ عنوانات بے شک بہت اہم ہیں لیکن بہر حال یہ زندگی کے پہلو و پہلو وسعتوں کے لیے ناکافی ہیں۔ غالبؔ نے ان روایات سے بغاوت کی اور غالبؔ کے بعد غزل نے بڑی وسعت پائی۔

عالیؔ بھی غزل کو زندگی کی جہتوں سے روشناس کراتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں کائنات کی تہ در تہ گرہوں کو اپنے ہاتھوں سے کھولنے میں مسلسل مصروف نظر آتے ہیں۔

عالیؔ کی غزلوں میں لطف و اثر اور بے نیازی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے مثال کے طور پر یہ اشعار

ساری رات ستاروں آگے کیا رونا
صبح ہی کر لے گریہ شبنم کافی ہے

ابھی ترے انکار پہ کیوں روؤں مجھ میں
اپنے آپ پہ ہنسنے کا دم کافی ہے

لطف نگہ کی خواہش تھی سو کب کرتے
آج تلک وہی چشم برہم کافی ہے

اس غزل میں کراچی کا اشارہ نہ کیا جاتا تو فضا سے معلوم ہوتا ہے کہ کس درد اور کرب سے عالیؔ نے یہ شعر کہے ہیں۔

دوڑ دکھ مے کشوں کے شرار نفاق سے
اک آگ سی خبر ہے کہ مے خانہ جل گیا

محدود رکھنا اپنے سیاق وسباق میں
ہر خواب کی قسم کہ ہر افسانہ جل گیا

مابین والیان چمن کیا تپش ہے یہ
ایک ایک میرے پھول کا زردانہ جل گیا

روکو یہ آگ ورنہ کراچی کے ساکنو
جنت سا ایک شہر جمخانہ جل گیا

آب حیات جیسے وہ معمار واپس آئیں
دیکھیں کہ کتنی جلد یہ کاشانہ جل گیا

عالی کی غزل کے اشعار میں روانی اس درجہ ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ بہائے لیے جاتی ہے بعض اوقات حسن و لطافت کی پرچھائیاں، اس قدر حاوی ہو جاتی ہیں کہ معنویت پس منظر میں رہ جاتی ہے مثلاً

گزر گیا ہے جو وقت اس میں جا کے دیکھتے ہیں
طرح قبول غزل آزما کے دیکھتے ہیں

دکان کم سخنی کی بھی منفعت مت پوچھ
ہم اپنے آپ کو برسوں گنوا کے دیکھتے ہیں

ہر آدمی پہ ہوئی وحی کائنات آوزاں
سب اپنے طور سے جلوے خدا کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے کہ تحریر خود کو لکھوائے
مجھے ہٹا، مرا دیوان اٹھا کے دیکھتے ہیں

دل تباہ و فسردہ کا تمھیں قبول نہیں
کہو تو عطف و اضافت ہٹا کے دیکھتے ہیں

ہم اہل بزم کو کیوں اپنے اعتماد میں لیں
کہ وہ تو ہمیں نظریں جھکا کے دیکھتے ہیں

جن اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا
انہیں یہ سسی پنوں سنا کے دیکھتے ہیں

عالی کی مقبول صنف "دوہے" کا ذکر کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عالی کے شعر کی زبان ہے۔ بقول ڈاکٹر

گوپی چند نارنگ "یہ طے کرنا مشکل یہ کہ عالی موسیقی سے دوہے کی طرف گئے یا دوہے سے موسیقی کی طرف آئے، ان دونوں میں گہرا رشتہ ہو نہ ہو، عالی کی سائیکی میں سنگیت کے سُر کھلے ہوئے ہیں۔" (۳۱)

"اے مرے دشتِ سخن" میں جگہ جگہ اس کی مثالیں ملتی ہیں اور ان کی معنویت اس مجموعے میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے "گھنگھرو" سے پتہ چلتا ہے کہ مسلک خواہ یہ ہو کہ "ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو" لیکن یہ سلسلے دہلی سے پونا اور حیدر آباد تک پھیلے ہوئے ہیں۔

تب سے میری روح میں وہ گھنگھرو

کبھی بجتے ہیں کبھی روتے ہیں

یعنی کچھ ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جو ماروائے سخن ہوتی ہیں۔

خود جھومیں گے پائل گھنگھرو ٹھمری اور کھماج

سر مرے جا کر گت تیری داسی میں گاؤں تو ناچ

سر سرگم سے عالی کا جو رشتہ ہے اسی کے پیش نظر مندرجہ ذیل دوہوں کی لفظیات اور اصطلاحوں اور فضا سازی پر غور کرنا خاصا دلچسپ ہے۔

مجھ میں کچھ سر کھوئے ہوئے ہیں وہی لگائیں آگ

نا یہ پہاڑی نا بھٹیالی یہ ہے دوہا راگ

سر اور شبد اور دھیان کی اگنی شعلے جن کے لاکھ

خسرو پر جو جلیں پتنگے عالی ان کی راکھ

تانپورہ بھی گھر میں رکھا سارنگی بھی لائے

اے بھئی گائک سر کے بنا سر کھیل نہ کھیلا جائے

طبلے رے طبلے تیری گمک سے پڑے ہے دل پہ چوٹ

پگلے پگلے یوں بھی نہ ہو تو ہم دونوں میں کھوٹ

میرے ماترے گننے والے تو سچا ہر بار

جب خرد کے ہاتھ سے گزری دنیا ہوئی ستار

یہ تو سنگیت سے رشتے کی بات تھی، ورنہ دوہے میں عالی کی جو حیثیت ہے، وہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے کوئی انکار

نہیں کر سکتا۔ عالؔی کے دوہوں کی معنویت اکہری نہیں ہے اور یہ دوہے اچھے خاصے سیاسی بھی ہیں اور مٹی سے جڑے ہوئے بھی ہیں۔

ایسا تجھے بنا کر اتنے خوش تھے اور حیران
تیرے من میں نرمی رکھنا بھول گئے بھگوان

گوری تیری بھینٹ کو سُبدا اور دھیان کہاں سے لائیں
سندرتا کی سبھی مثالیں خود تجھ سے شرمائیں

جتنا راج بھی راجا جیسا اصل سمجھ نہ پائے
جو آنکھوں کی سوئیاں نکالے وہی رانی بن جائے

جب تک سے نہیں دیتا ان نیتاؤں کو چھانٹ
تاش کے ہیں وہی باون پتے جیسے بھی دو بانٹ

دوڑنے والو دوڑ و پر یہ دھیان نہ جانے نہ پائے
آخر میں بس وہی جیتے گا جس کو سے جتائے

میں نہیں کوئی کٹر پنتھی سنو مرا ادمیائے
مسجد کو مندر کہنے سے خدا نہ بدلا جائے

"اے مرے وشتِ سخن" ایک نہایت اہم شعری مجموعہ ہے اس میں عالؔی جی نے نظموں کی طرف خاص توجہ دی ہے۔

اے مرے دشتِ سخن کی نظموں پر تبصرہ

"اے مرے دشتِ سخن" کی پہلی نظم جسے عالؔی نے "ایک سادہ سی تقریب" کا نام دیا ہے۔ ایک مکالماتی بیانیہ نظم ہے اسے عالؔی کی وضع کردہ اصطلاح میں نہاں خانہ دل کا اظہاریہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نظم الفاظ کی سطح پر فی الوقع ایک سادہ سی نظم ہے مگر اس کے باطن میں جھانک کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم سادہ نہیں بہت پُرکار ہے اور معنی کے اعتبار سے پرت در پرت ہے یہ سادہ سی تقریب صرف عالؔی کی تقریب نہیں ہے اور نہ اس کا ہیولا محض تخیلاتی ہے بلکہ اس کا ایک ایک مصرعہ فکر کے رشتے سے جڑا ہوا ہے اور یہ رشتہ فکر دنیا کے سارے اہل قلم سارے اہل نظر سارے اہل کمال اور سارے تخلیقی فن کاروں کی جبلی خواہش اور شعوری آرزومندی سے ہم رشتہ ہے اس نظم میں "جلسہ وداع" کا تذکرہ ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص زبان کسی خاص فرد یا کسی خاص طبقے کے نمائندوں سے نہیں بلکہ رنگ و نسل اور زبان و علاقہ کی سطح سے بلند تر سطح پر دنیا کے ان

سارے خلاق ذہنوں سے ہے جنھوں نے بار ہا یہ سوال اٹھایا ہے کہ زندگی اور آرٹ کی ماہیت کیا ہے ان دونوں میں کیا رشتہ ہے اور ان میں سے کون دیرپا ہے یہ سوال نیا نہیں بہت پرانا ہے اور تاریخ انسانی کے ہر دور میں اٹھایا گیا ہے اور شاید یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی تلاش میں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے عالی نے بھی ایک صاحب فکر شاعر کی حیثیت سے یہی سوال اٹھایا ہے اور سوال کو ماضی حال اور مستقبل سے منسلک کر کے دیکھا ہے، سوچا ہے اور اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور کوشش کے بہانے انھوں نے ایک بالکل اچھوتے موضوع پر نہایت خوبصورت اور فکر انگیز نظم تخلیق کی ہے۔ ایک طرف درد کی زیریں لہر، پھر بے نیازی اور خود شکنی، ساتھ ہی روانی اور سلاست کچھ اس طرح سے ہے۔

چلا جو میں تو مرا جلسہ وداع ہوا
کئی ہزار زبانوں کا اجتماع ہوا
پھر اپنے اپنے پھریرے ہوا میں لہرائے
اور ان کے سائے میں لاکھوں مصنفین آئے
پھر ایک وفد زا ہنوہ قارئین آیا
اور ایک مجمع تنظیم ناقدین آیا

اور اس کے بعد یہ انکسار جو دعویٰ کمال کا پہلو بھی رکھتا ہے اور عالی جیسی کا بھی

میں ہاتھ جوڑ کر ان سب کے سامنے آیا
حضور کیا ہے جو مجھ پر کرم یہ فرمایا
مجھے کبھی نہ کوئی دعوی کمال ہوا
نہ کچھ کسی سے تقابل کا ہی خیال ہوا
میں آپ سب کا کہاں تک لگا سکوں گا سراغ
مری متاع یہی ہیں بجھے بجھے سے چراغ

اس نظم کا اختتام بھی نہایت عمدگی سے شاعرانہ پیرائے میں ہوا ہے کہ ماننا جانا نہ ماننا جانا شہرت پانا نہ پانا یہ سب اضافی باتیں ہیں، اصل چیز تو جذبہ شوق اور اندر کی تڑپ ہے اور اس میں سے کتنا زندہ رہ پاتا ہے، اس کی کسی کو خبر نہیں، فن تو احساس کا ایسا زخم ہے جس کا مقدر ہرا رہنا ہے۔

میں تو کیا ہوا کہ ہر اک سمت سے صدا آئی
اور اپنے ساتھ عجب رنگ اک فضا لائی

چل آ کہ تو بھی اسی باب نا تمام سے ہے

یہاں تو سب کو غرض اپنے اپنے کام سے ہے

دنیا کے دوسرے صاحبان فکر و نظر کی طرح عاؔلی بھی کوئی حتمی جواب تلاش نہیں کر پائے اور نظم کے اختتام یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے ہیں کہ

"یہ کون جانے ازل جانے یا ابد جانے"

یا بظاہر اسی مقام پر واپس آ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے لیکن ان کی یہ لا جواب واپسی مستقلاً سوچ سے باز نہیں آتی۔

"اے مرے دشتِ سخن" کی ایک اور اہم نظم "تہجی" ہے جو اشارہ ہے حروف "تہجی" یعنی الف، بے، تے کا اور کنا یہ ہے آغاز کار کا۔ یہ نظم "ایک سادہ سی تقریب" سے کئی گنا بڑی ہے۔ "ایک سادہ سی تقریب" میں صرف چھتیس مصرعے ہیں جبکہ تہجی میں دو سو سے زائد ہیں اک نمایاں فرق یہ ہے کہ "ایک سادہ سی تقریب" قافیہ و ردیف کی پابند مثنوی کی کلاسکی ہیت میں ہے جبکہ "تہجی" ایک جدید طرز کی آزاد نظم ہے۔ مصرعے حسب ضرورت چھوٹے بڑے ہیں لیکن نظم کی بحر سے بے بہرہ نہیں ہیں۔ یعنی ایک ہی بحر کے ارکان میں سے ہیں یہ تو اس نظم کی ظاہری صورت ہے لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے اگر اس نظم کو "ایک سادہ سی تقریب" کی توسیع کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ "تہجی" میں بھی ایک سادہ سی تقریب کی طرح کے سوالات زیر بحث آئے ہیں اور اس میں بھی شاعر کی بنیادی کھوج یہی رہی ہے کہ انسان حقیقتاً کیا ہے اور کیوں خلق کیا گیا ہے؟ خلق کیا گیا تھا تو پھر اسے مقام احسن پر لے جا کر اسفل کی کھائی میں کیوں پھینکا گیا؟ انسان، کائنات اور خدا کے وجود اور ان کے باہمی رشتوں پر زمانے میں اہل فکر و نظر کے ہر حلقے میں غور و فکر کیا گیا ہے۔ عاؔلی نے اس نظم میں خداوند سے خطاب کر کے اپنے بیان کی معذرت چاہی ہے کہ اس کی مشق سخن تنگ نخن نکلی ہے اس نے دانش کے مینا سے بھی سیراب ہونا چاہا اور جس صنف کو جتنا بھی اپنایا وہ دلبر پیماں شکن نکلی وہ گنج گہر ہائے بزرگاں کا احترام کرتا ہے کہ ان کے دبستان مراتب، صد مناقب، سجدہ تعظیم کے ارکان واجب، اپنا اپنا ایک عالم ہیں شاید وہ بھی "ان سے فیض اٹھا کر ان سے اونچا جانا چاہتا ہے" لیکن کہاں ان کے خزانے اور کہاں میرے یہ بے رس، بے تراوش، کشتگان جہل اور محروم ایمائیت افسانے جمائی و فن سے بیگانے مودب ان نقوش پا اس سے اک جبیں جبیل کو بھی غنیمت جان کر تنہا گزرتا ہوں یہ خود شکنی ایک شعری تحت بیانی بھی ہے جس کے پردے میں آدم اپنے حوصلوں، امنگوں کی بات کرتا ہے۔

خداوندا

مجھے تو کم سے کم اتنی ہی ہمدیاں اور دے

دیکھوں، پڑھوں، سوچوں، لکھوں کچھ کام کر جاؤں

اگر انعام ہوتے ہیں تو کوئی کارنامہ لائق انعام کر جاؤں

نہیں میں نہیں کہتا کہ اب یا عہدہ آئندہ میں کوئی نام کر جاؤں
مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے جرم گاہ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں یہ

خود کو بے الزام کر جانے کی خواہش زندگی کی کلیدی خواہش ہے اور اسی نے عالی سے سائنسی نظموں کی جہت کھلوائی ہے اس کے بعد عالی کہکشاؤں، ماوراؤں پر سوال کرتے ہیں کہ یہ "کیسے بنتے اور خلا میں گھومتے رہتے ہیں" ہماری نقویموں میں ان کی ساعتاں، صدیوں کے پیمانے آتے ہی نہیں، ان کے سامنے سے روشنی گزر جائے تو اس کو بھی اندر کھینچ لیتے ہیں یہ کھیل صدیوں سے جاری ہے اور صدیاں تو الف بے تھیں، اصل تہجی تو ابھی باقی ہے اس کے بعد جلوہ معنی کے حوالے سے Singularity کا قصہ چھیڑا ہے تو توانائی کا مسئلہ گویا قصوں کا قصہ ہے۔

سینگو لے ریٹی، یکتائی سینگو لے ریٹی
وہی اک نقطہ بے بی اندازہ کمیت کا جس کا اسم ثانی
جسم ہائی
کر دیا ثابت توانائی
وہ کیا شے تھی
وہ کیا تھی کیوں متحرک ہوئی کیوں پھیلتی ہی جا رہی ہے
کہا کبھی واپس بھی آئے گی
جب آئے گی تو اس کی وجہ کیا اور شکل کیا ہوگی

بلیک ہول اور سینگو لے ریٹی ایک معانی میں استعمال ہونے والی دو اصطلاحات ہیں بلیک ہول تو معلوم نہیں دریافت ہوگا یا نہیں مگر سینگو لے ریٹی کا اصول دریافت ہو چکا ہے یہ گنجانیت (Densisty) کی ایک ایسی حالت ہے جس میں کوئی بھی شے واپس لوٹائی نہیں جاتی مگر عالی کی نظم میں بلیک ہول کا جو حوالہ ہے وہ اس بلیک ہول کا ہے جو راہ جاتی کرنوں کو بھی پکڑ لیتا ہے۔

وہ کہتے ہیں یہ مردہ ثابت و سیارا ایسے کشش آثار ہیں کہ جو اپنے سامنے سے گزرنے والی روشنی کو بھی کھینچ لیتے ہیں اس نظریے کے مطابق گنجانیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔

سائنس کا عام خیال یہ ہے کہ ساری کائنات کا آغاز ایسی سینگولیریٹی سے ہوا تھا اور جو بڑا دھما کہ ہوا تھا Big Bang اس وقت صرف سینگولیریٹی ہی موجود تھی اور کائنات کا انجام بھی شاید یہی ہوگا کہ سب ستارے اپنی توانائی ختم

کرنے کے بعد سکڑ جائیں گیا اور بلیک ہول کی شکل میں سینگولیریٹی ہی کی صورت اختیار کرلیں گے۔

اگر تم واقعی جل ہی رہے ہو تو پھر ان شعلوں کو بھی دیکھو
جو سلوں بعد سلوں میں جگر گاہ تجسس کو جلاتے ہیں
نہ جانے کیسے کیسے قاعدے اور نگینے صدیوں فروزاں
حکمرانان جہاں
کس بے بسی سے اور خوشی سے
تو معارف انکشاف و تجربہ کے ایک ہی جھٹکے سے گر کر
لمحہ بھر میں ٹوٹ جاتے ہیں

اس نظم میں اس خیال کے بجائے کہ دھماکہ سے پیدا ہونے والی یہ کائنات ہلکی نحیف آواز سے ختم ہو گی، اسے دھماکہ سے ختم ہونے والا بتایا گیا۔ ہے یہ دھماکہ انتشار ہو یا قیامت اس سے پہلے صدیوں کے کارنامے اور کارناموں کی آرزو جستجو ہے کہ اب تک کی صدیاں تو زندگی کی اس روانی میں الف بے ہیں اور بس۔ اس نظم میں نئے دور کی پیدا کردہ تشکیک اور قدیم روایت کے احساس کے ساتھ انساں کی کارگری بھی ملتی ہے۔ مثلاً

یہ صدیاں تو الف بے تھیں
رہی وہ عشق کی تقویم
شاید کوئی کیفیت جو ہو نا قابل تقسیم
کبھی آ جائے گی ادراک میں بھی یا سدا ہی ماسوا ہو گی

صدیوں کے مزید وقت کی آرزو کے ساتھ، وقت کی گزری ہوئی منزلوں کے احساس میں یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ انسان کے تجسس کا سفر غیر مختتم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

مگر گزری ہوئی سب منزلیں خود ہی بتاتی ہیں
اگر مڑ جاؤ اور پھر آؤ تو اک اک راہ کے ہر ذرے پر لکھا دکھاتی ہیں
کہ جتنے مرحلے طے کرتے جاؤ، سامنے اک مرحلہ ہو گا۔

"تجی" جاننے کی جس تڑپ کو پیش کرتی ہے، اس تڑپ کے لیے صدیاں بھی ناکافی ہیں۔ اس نظم میں ثابت و سیار اور پھر "انتشار" کی پوری داستان سمودی ہے۔ اس موضوع پر اس وضع کی دوسری نظم اردو میں نہیں ملتی۔ عالی نے ہر صفحہ معنی کو الٹ کر دیکھا ہے کہ مفہوم سے محروم رہنا تو مقدر انسانی ہے۔ اب تک صدیوں کا الٹ پھیر تو پہلی یا دوسری کروٹ تھی، کائنات کے رازوں کو سمجھنے کے لیے مزید وقت، چاہیے تا کہ ایسی زبان یا ایسا محاورہ بن سکے جو ہر کون و مکاں کے اسرار کی تعبیر

پر قادر ہو، اب تک صدیاں تو محض الف بے تھیں ،انسان کی تلاش بے کراں کا سفر جاری ہے ۔اس نظم سے قاری کو جو مجموعی تاثر ملتا ہے اسے تابناک پیام شعور سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ عالی نے اگر چہ انسان و کائنات نیز ان کی تخلیقی غایت کے سلسلے میں طرح طرح کے سوالات اٹھائے ہیں اور ان سوالات کے جوابات کی تلاش میں ذہن انسانی نے ان گنت صدیوں کی مسافت بھی طے کرائی ہے لیکن ہر چند کہ ان سوالات کے خاطر خواہ جوابات نہیں مل سکے لیکن عالی ایک لمحے کے لیے بھی بے دلی و مایوسی کا شکار نہیں ہوئے ۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ ہزاروں صدیاں جو بیت گئیں وہ آغاز سفر کے بالکل ابتدائی مرحلے یعنی الف بے کی حیثیت رکھتی ہیں دو سو مصرعوں کی لمبی نظم " تجی " کے آخری مصرعے کچھ یوں ہیں ۔

خداوندا

خیال اک زائر خوش گفتگو بے تلی اک حریف آرزو نکالی
میں کچھ سمجھا مگر پھر بھی نہیں سمجھا
مجھے تو میرے ہی آئینوں میں عکس نمو رکھلا
مجھے تو چند صدیاں دے ہی دے جن میں مجھے جتنے بھی حرف و لفظ آ جائیں
انہی سے اک زباں ،تعبیر ہر کون و مکاں ،اپنی بنانی ہے
مجھے سب ہوشمندان زر افشاں جس قدر بھی دے گئے اور جو بھی دیں منظور ہے لیکن
مرے دل میں سوالوں کی جو دنیا ہے وہ ماضی حال مستقبل سے وابستہ سہی پھر بھی
مری اپنی لگن میں اور جلن ہی میں مقصد ہے دوانی ہے
مگر اس کا دوانہ پن بھی تو تیری تلاش بے کراں ہی کی کہانی ہے
یہ صدیاں تو الف بے تھیں ۔

عالی کی کچھ نظمیں بظاہر سوانحی لگتی ہیں لیکن وہ سوانحی نہیں ہیں ۔ جیسے " آشوب "

دل دیوانہ من
کہہ نہ افسانہ من
سننے والوں کو بھلا کیسے یقین آئے گا.......
ہر طرف کذب و نمائش کا وہ غلبہ ہے کہ سچ مضحکہ اڑ اوائے گا
ان کے آگے نہیں چلتی ہے کوئی سعی فقیرانہ من
دل دیوانہ من
کہہ نہ افسانہ من

جینے جی میرے کھلے گا نہ ذرا گلشن ویرانہ من..........

دل دیوانہ من

کہہ نہ افسانہ من

آج تک خشک ہے زردانہ من

یوں ہی روئے گا عزاخانہ من

دل دیوانہ من

کہہ نہ افسانہ من

یوں تو "حد ادب" میں بھی یہی کیفیت ہے اور "نذر بابائے اردو" میں بھی لیکن "نذر مشفق خواجہ" اور "گواہی" اس پائے کی نظمیں ہیں جہاں یہ درد سرشاری کی حد کو چھونے لگتا ہے اور شعری سطافت، اپنا جواز خود بن جاتی ہے۔

"نذر مشفق خواجہ" میں سلیم وانشاء کا احوال ہر سبیل تذکرہ ہے، اصل معاملہ اپنے درد دل کا ہے۔ دوست باقی رہے نہ دوستیاں، زمانہ سہیل رواں ہے، گزر رہا ہے، دوسرے نہیں رہے تو ایک دن عالی کو بھی جانا ہے چنانچہ وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ جہاں ان کی شاعری کو یاد کیا جائے وہیں ان کے دوسرے کاموں کو بھی نگاہ میں رکھا جائے۔

تم پہ حق نہیں اتنا

مانگتا ہوں میں جتنا

میرے بعد جینا ہے

زہر زیست پینا ہے

مجھ کو یاد کر لینا

مختصر ہی کہہ دینا

انجمن کے دفتر میں

کالجوں کے محشر میں

ساتھ ساتھ راہوں میں

صبر میں کراہوں میں

جس قدر بھی دیکھی ہے

وہ جو مجھ پر گزری ہے

غور طلب ہے کہ "نذر مشفق خواجہ ہو" یا "گواہی" ان نظموں میں تصور اختتام سفر یعنی موت کا ہے ان نظموں میں

منظر کاری ہے اور جذبے کا فشار بھی۔ عالی کو یہ احساس ہے کہ انہوں نے اپنی جمع پونجی یعنی شعری کمائی کا کیا اثاثہ یا سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے؟" گواہی" میں اسی خلش نے ایک اور مسئلہ کو چھیڑا ہے اور بڑے بڑوں سے مثالیں دی ہیں کہ ان میں سے بعض ایک صنف کے پابند نہیں تھے۔ عالی چاہتے ہیں کہ انہوں نے جو نثر لکھی ہے اس کا حق بھی ان کو دیا جائے ، یعنی ذہن انسانی کی کچھ دریافتیں ایسی ہیں کہ انہیں عوام کی سطح تک عوام کی زبان میں لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔" گواہی" کے چند شعریت کے داد طلب اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

سنا تھا ذہن میں کچھ خام مال ہوتا ہے
اسی میں صد ورق صد خیال ہوتا ہے

ودیعت ازلی ، گرد و پیش کے احوال
اگر سلیقے سے آمیز ہوں تو وحی مثال

کبھی وہ آب سے اولہ بنا کے دیتا ہے
کبھی وہ کوئلے کو ہیرا بنا کے دیتا ہے

میں اپنی حد میں غزل دوہے گیت کہتا تھا
خود اپنے سحر گلو میں بھی مست رہتا تھا

سوائے اس کے کوئی نثر کا خیال نہ تھا
غم عوام جڑوں سے شریک قال نہ تھا

خدا گواہ یہ اقرار استفادہ ہے
نہیں کہ اپنا ہی کچھ کیف وکم زیادہ ہے

شگاف سینہ فقط نظم ہی سے بھر نہ سکا
صغیر تھا کوئی فتح کبیر کر نہ سکا

میں ایک ذرہ صحرائے بے کران سخن
سوائے حسن طبیعت ملا نہ علم نہ فن

یہ سارے مقامات وہ ہیں جہاں آپ بیتی شاعری بن گئی ہے ہر شعر میں خود شکنی اور دردمندی کی داد دینی پڑتی ہے۔

ہزار تفرقے ، ناخواندگی ، خرد بندی
زمیں پہ قبضہ بنام حق خداوندی

سوا ان سے کشمکش صد جہات جاری ہے

محفظ علم کہ ایک وہ بھی ذمہ داری ہے

تو میں جو مجلہ گہہ شعر میں ہی رہ نہ سکا

سبب وہی ہے کہ بس اتنے بوجھ سہہ نہ سکا

ملی جنہیں نہ کوئی بات قابل تعزیر

وہ قتل شعر سے ہی اس کی کر گئے تعبیر

وہ زور جتنا عیوب وصفات پر رکھیں

ذرا سی کلیت کار پر نظر رکھیں

عالی نے نئے نئے طبعیاتی و سائنسی مسائل کو شاعری میں داخل کیا ہے اس مجموعے کی ایک خصوصیات عالی کی شاعری کی یہ نئی جہت بھی ہے۔ مجموعے میں ایسی نظموں کی اچھی خاصی تعداد ہے، لیکن شعری تشکیل کے اعتبار سے "امکان" بے مثال ہے۔ یہ نظم "خلا" کے موضوع پر ہے اور عشق پر بھی۔

خلا خالی نہیں ہے

اس میں ایسے ایسے عنصر، بے ظہور اس طرح رہتے ہیں

کہ جیسے بعض شاعر بے لکھے بس ذہن ہی میں دل کے انگارے ملا کر شعر کہتے ہیں

وہ کہتے ہیں، وہ عنصر بے محرک، بے قوانین طبعیات، ایک شوق خود او جودی میں ابھر کر رقص کرتے ہیں

عناصر کا یہ رقص بغیر آغاز اور بغیر انجام کے ہے بلکہ زماں یا مکان کا یہ پیمانہ ہی نہیں ہوگا

تو ہجر و وصال کی معنویت بھی بدل جائے گی۔

اور اس کے بعد یا جب چاہیں ہم اک ساتھ ہی چھپ جائیں

دوبارہ کوئی قالب میں نہ واپس آئیں

یہ ممکن ہے وہی وصل مسلسل ہو

ہماری نامکمل زندگی یعنی یہ بعدِ اختلاطِ جسم، آغاز ونشاطِ تشنگی، شاید وہاں جا کر مکمل ہو۔

"چھپکلی کا دماغ" "گولر کے بھنگے" اور "بے یقینی" ایسی نظمیں ہیں جو اپنی فنی حیثیت یعنی اظہار و ابلاغ کے باب میں نہ تو خالص استعارائی ہیں نہ کہ بیانیہ اُن کا اسلوب فکر وفن مرکز نگاہ بن جاتا ہے۔

ہے میرا آج کا موضوع چھپکلی کا دماغ

کہ مجھ کو آج میسر نہیں ہے اپنے ہی شہر وطن میں غارت و دہشت کی آندھیوں سے فراغ یہ جارحیت و سفلی مرکبات کا

ایک زندہ و عجیب قفس

یہ ظلم و جبر کی مسموم گرم گرم ہوا

یہ ملکیت کی ہوس

"ہمارے مغز میں شامل ہے چھپکلی کا دماغ

شرار بولہبی

بہت قدیم دماغ

وہ کہتے ہیں کہ وہ جو رینگنے والے تھے ان کا ورثہ ہے

مگر کچھ ایسے کہ اب بھی ہمارے ذہن کا ایک ناگزیر حصہ ہے

میں قافیوں کا پجاری نہیں

جو خوف و عقیدت سے کھینچ کھانچ کے کچھ یوں کہہ کر قصہ ہے

وہی کہوں گا جو کہتے ہیں یعنی ورثہ ہے۔

عالؔی جی نے میراؔجی پر جو نظم لکھی ہے اور اسے جس طرح "میراؔجی صاحب" کا عنوان دیا ہے، وہ ان کی انصاف پسندی کا تقاضا ہے۔ کیونکہ یہ میراؔجی کو ان کی کارکردگی کے حوالے محسوس نہ کیے جانے کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔

عالؔی نے بہت پہلے کہا تھا، کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرادم ساز، ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز، عالؔی کی شاعری کی غالب کیفیت خود کلامی کی ہے۔ انہوں نے دشتِ سخن کو آواز دی ہے ان کی تحت بیانی اسی حوالے سے ہے عالؔی، فیضؔ، راشدؔ، میراؔجی سب کا احترام کرتے ہیں لیکن وہ مانتے صرف میراؔجی کو ہیں۔ ایک نظم" جو بولے مارا جائے" میں اقرار کرتے ہیں کہ سب تو میراؔجی کو بھول گئے، لیکن مجھ جیسا معتوب زمانہ میراؔجی کو یاد کرتا ہے پھر ایک اور نظم میں!

اب فیضؔ بھی ہیں اور راشدؔ بھی

وہ بہت بڑے پر میراؔجی!

ہاں میراؔجی وہ چمکتے ہیں

کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی کس شان کے ساتھ دمکتے ہیں!

(میراؔجی صاحب)

عالؔی جی کا دوسروں کی بڑائی کا اعتراف کرنے سے خود ان کی بڑائی کا احساس جھلکتا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں "نذر بابائے اردو"، "مولوی عبدالحق"، "نذر شفق خواجہ"، میراجی صاحب اور "حبیب جالب" شخصی

اعتراف کمال ہوتے ہوئے بھی ادبی اور علمی صورت حال کی ترجمانی کرتی ہیں۔

حبیب جالبؔ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے عالیؔ جی نے خوب کہا ہے کہ

وہ تھا رفیق عوام اور انہی کی زبانوں میں کہتا تھا

وہ ان ہونٹوں پہ رقصاں ولوں میں رہتا تھا

حبیب جالبؔ پر عالیؔ جی کی نظم ان کی فطرت کے ایک رخ کو پیش کرتی ہے لیکن ان کی فطرت کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جس میں وہ میراؔجی کا نہایت احترام سے تذکرہ کرتے ہیں۔ جو نظم بابائے اردو کی نذر کی گئی ہے اس میں اردو کالجوں کا ذکر نمایاں ہے۔

حواشی و حوالے

(۱) روزنامہ جنگ (VII) ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء انٹرویو" سرور جاوید"

(۲) "جمیل۔ میرا نیک نام بدنام یا" محمد عمر ماہنامہ چہارسو، راولپنڈی، نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء ص ۸۱

(۳) خاکہ "سراج الدین خان سائل" جمیل الدین عالی، ماہنامہ چہارسو، راولپنڈی، نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۳

(۴)	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
(۵)	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضا
(۶)	ایضاً	ایضاً	ایضا	ص ۴
(۷)	=	=	=	=
(۸)	=	=	=	ص ۱۲
(۹)	=	=	=	ص ۱۳
(۱۰)	=	=	=	ص ۱۴
(۱۱)	=	=	=	ص ۱۴
(۱۲)	=	=	=	=
(۱۳)	=	=	=	=
(۱۴)	=	=	=	=
(۱۵)	=	=	=	=
(۱۶)	"میں اور میرا فن"	جمیل الدین عالی	چہارسو، روالپنڈی	ص ۲۴
(۱۷)	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
(۱۸)	براہ راست	گلزار جاوید، چہارسو	ایضاً	ص ۳۰
(۱۹)	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
(۲۰)	خاکہ "سراج الدین سائل"	جمیل الدین عالی	ماہنامہ چہارسو	ص ۱۴، ۱۵
(۲۱)	انٹرویو "براہ راست"	گلزار جاوید	ماہنامہ چہارسو	ص

(۲۲) ایضاً ایضا ایضا ایضاً

(۲۳) "میں اور میرا فن" جمیل الدین عالی چہارسو ص ۲۶

(۲۴) کتاب شاعری؟ حوالہ نہیں لکھا (؟)

(۲۵) دیباچہ

(۲۶) ارمغانِ عالی

(۲۷) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "ایک نیا شعری مجموعہ غزلیں، دوہے، گیت، ارمغان عالی ص ۸۸
(ماہنامہ "مہر نیم روز" کراچی ۱۹۵۷ء)

(۲۸) "اردو شاعری میں دوہے کی روایت" سمیع اللہ اشرفی ص ۲۲

(۲۹) ایضاً ایضا ایضاً

(۳۰) "سجل جذبوں اور کومل آواز کا شاعر"، ڈاکٹر وحید قریشی، ماہنامہ چہارسو، ص ۷۲

(۳۱) "جمیل الدین عالی اور آٹھویں سُر کی جستجو" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ارمغان عالی ص ۱۶

عالی کی دوہا نگاری

دوہا یا روہڑہ وہ صنفِ سخن ہے۔ جو دو مصرعوں پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ہر مصرع کے دو حصے (بھاگ) ہوتے ہیں۔ جن کے بیچ میں وقفہ یا ٹھہراؤ (بسرام) لازمی ہے۔ اس طرح پورے شعر کے چار ٹکڑے اور دو درمیانی ٹھہراؤ قرار پاتے ہیں۔ اس کو اردو میں بیت کا مترادف کہہ سکتے ہیں۔ اور بلحاظ حصص رباعی کا ہم پلہ قرار دے سکتے ہیں، گویا یہ چار ٹکڑوں پر مبنی ایک شعر ہوتا ہے جس میں مکمل مفہوم یا مطلب ادا کیا جا سکتا ہے (۱) دوہا دراصل ہندی صنفِ شاعری کی ایک صورت ہے لیکن اردو زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصناف کو قبول کر لیتی ہے اور جب اردو میں اس کا اظہار ہوتا ہے تو وہ اردو ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح دوہا ہندی سے جب اردو میں آیا تو اسے وہی اعلیٰ مقام حاصل ہوا جو ہندی میں تھا۔

دوہے کے فن پر بحث کرنے سے پہلے ہندی پنگل کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے پنگل کا موضوع بحث چھند ہے۔ ہندی پنگل سے مراد ہندی چھند شاستر یا ہندی علم عروض ہے۔ ہندی علم عروض سنسکرت کے چھند شاستر پر مبنی ہے سنسکرت چھند شاستر کے ابتدائی نقوش ویدوں میں ملتے ہیں۔ رگ وید کے زمانہء تالیف کے دورِ آخر میں چھند شاستر کو الگ شعبہء علم کی حیثیت سے تسلیم کر کے ویدوں کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا۔ وید حسبِ ذیل چھ حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ شکستا (الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کا علم)

۲۔ چھندس (علم عروض)

۳۔ ویاکرن (علمِ قواعد)

۴۔ بزوکت (عبادت کے ارکان اور مذہبی رسوم کے آداب کا علم)

۵۔ جیوتش (علم بخوم)

۶۔ کلپ (ویدوں کے مشکل الفاظ کے اشتقاقی تشریح کا علم)

لیکن اس دور میں حروف شماری کے ذریعہ سے ہی چھند متعین ہوتے تھے۔ چرن (مصرعے) ورنوں (حروف) کی ترتیب اور (آہنگ) کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔

(ورک پاتی شاکھیہ: پاتال ۱۷۔ چھند ۱۳ بحوالہ ڈاکٹر پتولال شکل: آدھنک ہندی کاویہ میں چھند یوجنا۔ ص ۹)

سنسکرت عروض کا باقاعدہ آغاز آچاریہ پنگل کی تصنیف۔ "پنگل چھند سوتر" سے ہوتا ہے جس کا زمانہ تالیف اے۔ بی کیتھ نے اپنی تصنیف "سنسکرت ادب کی تاریخ" میں تقریباً دو سو قبل مسیح قرار دیا ہے۔

(بحوالہ ڈاکٹر جگدیش گپت۔ ہندی ساہتیہ کوش" جلد اوّل ص۔ ۴۵۱)

"اگنی پران" میں دستیاب ہونے والا "اگینے چھندسار" آچاریہ پنگل کے "چھندسوتر" پرمبنی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "اگنی پران" کے مصنف ویاس نے لکھا ہے "پنگلو کت بتھا کرم" یعنی جو کچھ پنگل آچاریہ نے کہا ہے اسی کے مطابق "اگینے چھندسار" کو ترتیب دیا گیا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں سنسکرت عروض کی ایک اور اہم تصنیف "شروت بودھ" ملتی ہے۔ جس کو بعض کالیداس سے اور بعض واوچی سے منسوب کرتے ہیں۔ (ہندی ساہتیہ کوش جلد اول ص ۲۹۱) اس کے بعد تقریباً پانچ سو سال تک سنسکرت عروض کی کوئی اہم تصنیف سامنے نہیں آتی۔ دسویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک ایک بار پھر پنگل اچاریہ کی روایت آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی اور سنسکرت عروض کی کئی اہم تصانیف منظر عام پر آئیں۔

۱:-	شانتی پا: چھند ورتنا کر۔		(دسویں صدی عیسوی)
۲:-	شیمپندر: سوتر ورت تلک۔		(گیارہویں صدی عیسوی)
۳:-	ہیم چندر:	چندوانوشاشنم	(بارہویں صدی عیسوی)
۴:-	گنگاداس:	چھندومنجری	(بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کا وسط)
۵:-	کیدارناتھ بھٹ:	ورت رتناکر	(چودھویں صدی عیسوی)
۶:-	دامودر مشر:	وانی بھوشن۔	(چودھویں صدی عیسویں کا نصف آخر)

ان جملہ تصانیف میں ہیم چندر کی "چھندوانوشاشنم" سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے کیونکہ ہیم چندر نے اس میں سنسکرت عروض کو پہلی بار وضاحت کے ساتھ سائنٹیفک طریقے سے پیش کیا ہے اور یہی وہ تصنیف ہے جس کو سامنے رکھ کر چودھویں صدی عیسوی میں پراکرت اور اپ بھرنش میں مستعمل چھندوں پرمبنی پہلی تصنیف "پراکرت پنگلم" کی تدوین عمل میں آئی جو پراکرت، اپ بھرنش اور سنسکرت کے کئی عالموں کی اجتماعی کاوش کا نتیجہ ہے۔

متاخرین نے "پراکت پنگلم" کے خطوط پر حذف واضافہ کے ساتھ ہندی عروض کی کتابیں مرتب کیں جن میں پراکرت اَپ بھرنش، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے نئے نئے چھندوں کو شامل کرکے ہندی عروض میں توسیع کے سلسلے کو جاری رکھا۔ ہندی عروض کی چند اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱:-	تلسی داس:	چھنداولی	(سولھویں صدی عیسویں)
۲:-	ماکھن:	چھندولاس یا شری ناگ پنگل	(سترہویں صدی)
۳:-	چنتامنی: چھندوچار		(سترہویں صدی)
۴:-	سکھ دیو مشر: ورت وچار		(۱۶۷۱ء)
۵:-	متی رام:	چھندسار پنگل	(۱۷۰۱ء)

۶:- بھکھاری داس: چھند ورنو (۱۷۶۶ء)

۷:- نارائن داس: چھند سار (۱۷۷۲ء)

۸:- منی رام: چھند چھپنی (۱۷۷۲ء)

۹:- دشرتھ: ورتھ وچار (۱۷۹۹ء)

۱۰:- نند کشور: پنگل پرکاش (۱۸۰۱ء)

۱۱:- رام سہائے: ورت ترنگنی (۱۸۱۶ء)

۱۲:- گدادھر بھٹ: چھند وصنجری (۱۸۸۳ء)

۱۳:- جگن ناتھ پرشاد بھانو: چھند پربھاکر (۱۸۹۴ء)

۱۴:- پروفیسر پرمانند شاستری: پنگل پیوش (۱۹۵۲ء)

۱۵:- پیارے لال شرما: ہندی چھند رچنا (۱۹۵۲ء)

۱۶:- ڈاکٹر پتولال شکل: آدھنک ہندی کاویہ میں چھند یوجنا (۱۹۵۷ء)

ہندی اور سنسکرت عروض کی اور کتابوں کے نام بھی کہیں کہیں حوالے کے طور پر ملتے ہیں لیکن وہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ڈاکٹر پتولال شکل نے اپنی تصنیف " آدھنک ہندی کاویہ میں چھند یوجنا" میں ہندی عروض کو عصری تقاضوں کے مطابق نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

دوہے کے فن پر بحث کرنے سے قبل ہندی پنگل کی مبادیات کو ذہن میں رکھنا نہایت ضروری ہے پنگل کا موضوع بحث چھند ہے۔ سنسکرت چھند شاستر کے مطابق چھندوں کی تقسیم دو طرح سے کی گئی ہے پہلی تقسیم کے مطابق چھند دو طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ ویدک چھند۔ جن کا تعلق صرف ویدوں کے مطالعے سے ہی ہے۔

۲۔ لوکک (عوامی) چھند۔ وہ چھند ہیں جن کو پران اور دیگر شعری تخلیقات میں استعمال کیا گیا ہے۔

ہندی عروض میں چھند سے مراد عوامی چھند ہی ہوتا ہے۔

دوسری تقسیم کے لحاظ سے سنسکرت میں تین طرح کے چھند مانے گئے ہیں۔ ۱۔ ماترائی چھند ۲۔ اکشر چھند ۳۔ آریا لیکن بھاشا کے عروض میں آریا کو ماترائی چھند کے ذیل میں ہی مانا گیا ہے۔

چھند: ماتراؤں یا ورنوں کی ترتیب، گتِ (آہنگ) اور یت یا وشرام (وقفہ) کے اصول اور آخر میں مصرعوں کی برابری کو جس شعری تخلیق میں ملحوظ رکھا گیا ہو اس کو چھند کہتے ہیں۔

(بھانو۔ چھند پربھاکر ص ۱)

جا پدر چنا میں مکیں، بھانو بھنت سوئی چھند (بھآنو) مت ، بَرَن ، گت ، بت نیم ، اَنت ہی سمتا بند

چھند دو طرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ ماترائی یا جاتِ

۲۔ ورنک یا وِرِت

ہر ایک چھند کے چار چار چرن (مصرعے) ہوتے ہیں۔ پہلے اور تیسرے چرن کو وِشم چرن (طاق مصرعے) اور دوسرے اور چوتھے چرن کو سَم چرن (جفت مصرعے) کہتے ہیں جس چھند کے چاروں مصرعوں کی گت یا آہنگ یکساں ہو اس کو سَم چھند (مساوی چھند)، جس کے طاق مصرعے اور جفت مصرعے الگ الگ یکساں ہوں اس کو نیم مساوی (اردھ سم) چھند اور جس چھند کے چاروں مصرعوں میں کوئی یکسانیت نہ ہو اس کو غیر مساوی چھند کہا جاتا ہے۔ چاروں مصرعوں سے کم یا زیادہ مصرعوں والے چھند بھی غیر مساوی (وِشَم) چھند کہلاتے ہیں۔ جس چھند کے ہر ایک مصرع میں بتیس ماترائیں تک ہوں ان کو عام چھند اور بتیس سے زیادہ ماتراؤں والے دنڈک کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ورنک ورتول میں چھبیس اکشروں یا ورنوں تک عام چھند ا۔ ورنی مصرع چھبیس سے زیادہ اکشروں والے دنڈک کہے جاتے ہیں۔

چھند

ورنک			ماترائی		
غیر مساوی	نیم مساوی	مساوی	غیر مساوی	نیم مساوی	مساوی
(وِشم)	(اردھ سم)	(سم)	(وِسم)	(اردھ سم)	(سم)

عام (سادھارن) دنڈک عام (سادھارن) دنڈک

ماترک چھند :-

جس چھند میں ماتراؤں کی تعداد ان کی ترتیب اور وقفہ کے لحاظ سے چھند کا وزن و آہنگ متعین کیا جاتا ہے اسے ماترک چھند کہتے ہیں۔

ورنک ورت :-

جس چھند میں ورنو یا ورنک گنوں کی تعداد ترتیب اور وقفہ کے لحاظ سے چھند کا وزن و آہنگ متعین کیا جاتا ہے اس کو ورنک کہتے ہیں۔

ماترا :-

عروض کی اصطلاح میں ایک خفیف حرفِ علت کے تلفظ کو ادا کرنے میں جتنا وقت لگتا ہے، وقت کی اس اکائی کو ماترا کہتے ہیں۔ جیسے 'اَ' میں ایک ماترا اور 'آ' میں دو (۲) ماترائیں ہیں۔ ماترا کو مَت، متا، کل اور کلا بھی کہتے ہیں۔
(وی۔ ایس۔ آپٹے۔ سنسکرت۔ انگلش ڈکشنری ص ۴۳۴)

ورن یا اکشر :-

حرف کی تحریری شکل کو ورَن کہتے ہیں یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔
۱۔ لگھو، ۲۔ گرو (ہندی ساہتیہ کوش۔ جلد اوّل ص ۲۰۰)
اردو میں ورن کو برن بھی کہتے ہیں۔

لگھو یا ہرسو ورن :-

ایک ماترا والے ورن کو لگھو یا ہرسو ورن کہتے ہیں جیسے اَ اُ اِ کَ کِ کُ وغیرہ۔ اس کی علامت (۱) ہے۔

گرو یا دیرگھ ورن :

لگھو ورن سے دوگنی ماترا والے ورق کو گرو یا دیرگھ ورن کہتے ہیں جیسے آ۔ اے۔ او۔ کا۔ کی۔ کے۔ کو وغیرہ اس کی علامت (s) ہے۔

پلیت ورن :

یہ تین ماتراؤں کا ورن ہوتا ہے جس میں ایک گرو + ساکن لگھو ہوتے ہیں۔ ساکن لگھو کو شمار نہ کر کے اس کو گرو کے برابر ہی شمار کیا جاتا ہے۔ جیسے بھویت میں ت کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ (چھند بھارکر ص ۳)

اردھ ماترا:

نصف ماترا عروض میں شمار نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماقبل کو گرو بنا دیتی ہے جیسے کرم میں ر نصف ماترا ہے اس لیے ک سے مل کر (^) کو گرو ماترا بنا دیا۔ اگر اس نصف ماترا کا زور اپنے ماقبل پر نہیں ہوتا تو اپنے آگے والے حرف کے ساتھ ضم ہو جاتی ہے جیسے تمھاری میں (م) اردھ ماترا ہے یہ 'ھا' کے ساتھ ضم ہو گئی۔ (تُ مھاری)۔ غرض کہ نصف ماترا کی عروض میں الگ سے کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

دگدھ اکشر:

سعد حروف کو شُبھ اکشر اور نحس حروف کو دگدھ یا اشبھ اکشر کہا جاتا ہے۔

سعد حروف:

ج۔ چ۔ چھ۔ د۔ دھ۔ ڈ۔ س۔ ش۔ ک۔ گ۔ کھ۔ گھ۔ کش۔ ن اور یہ کل پندرہ حروف سعد سمجھے جاتے ہیں۔

نحس حروف:

ب۔ بھ۔ پ۔ ت۔ تھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ جھ۔ ڈھ۔ ر۔ ل۔ م۔ و۔ ہ۔ ش (ٹ) اور ہ کو شعری تخلیق یا کسی تصنیف کے آغاز میں لانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ہاں اگر یہی حروف کسی دوسرے ساکن یا ا، و، ے کے ساتھ مل کر گرو کا روپ اختیار کر لیں تو پھر ان کے استعمال میں کو مضائقہ نہیں۔

پنگل دس اکشر:

ورنک گنوں کے ابتدائی حروف بھ، ت، ج، ر، س، م، ن، ے اور گرو، رامگھو کے دو حروف ملا کر کل دس حروف پنگل کے دس اکشر کہلاتے ہیں جو ہر ایک شعری تخلیق میں پائے جاتے ہیں۔

ماترائی گن:

دو سے لے کر چھ ماتراؤں تک مجموعے کو ماترائی گن کہتے ہیں۔ ایک ماترا کا گن نہیں ہوتا اس کو پنگل کی اصطلاح میں شنکھ، میرو گندھ یا کاہل کہتے ہیں۔ ماترائی گنوں کے نام اور ان کی اقسام حسب ذیل ہیں۔

نام	ماترائی گن	تعداد ماترا	اقسام	وکن
ٹگن	(شٹ کل)	۲	۱۳	چھ حرفی
ٹھگن	(پنچ کل)	۵	۸	پانچ حرفی
ڈگن	(چھ کل)	۴	۵	چار حرفی
ڈھگن	(ترکل)	۳	۳	تین حرفی

ڈنگن	(دوکل)	۲	۲	دوحرفی

"دوہا" ہندی شاعری کی صنف ہے لیکن دوہے کی صنف پر ہندی شاعری کا کوئی اجارہ نہیں۔ خود ہندی شاعری میں بھی یہ صنف اپ بھرنش سے آئی ہے اور ہندی کے علاوہ یہ صنف برصغیر پاک وہند کی دوسری زبانوں مثلاً راجستھانی، دکنی، سندھی، گجراتی، مراٹھی اور پنجابی وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

اردو شاعری میں دوہے کی روایت:-

اردو زبان کے ابتدائی نشو ونما کے دور سے ہی اردو شاعری میں دوہے کی روایت کا سراغ ملتا ہے۔ ہندوستان کے صوفیائے کرام نے اپنا پیغام راگ راگنیوں اور دوہوں کے ذریعے سے عوام تک پہنچایا۔ اردو شاعری کے ابتدائی زمانے میں پنگل کے چھندوں بالخصوص چوپٹی، چوپائی اور دوہے کا کثرت سے استعمال کیا گیا لیکن جب ہندوستان میں بولی جانے والی عوامی زبان کو فارسی زبان نے پوری طرح متاثر کیا تو فارسی کے زیر اثر قدیم اردو یا ہندوی زبان کی شاعری میں فارسی بحروں کے اوزان استعمال ہونے لگے لیکن اردو شاعری میں فارسی بحروں کے وہی اوزان مقبول ہو سکے جو اردو زبان کے لسانی مزاج سے ہم آہنگ اور پنگل کے چھندوں سے مطابقت رکھتے تھے۔ دوہے کی ہیت اور اس کے مختلف روپ اردو شاعری کے ہر دور میں برقرار رہے ہیں۔ اردو شاعری میں دوہا ایک ایسی صنف ہے جس نے ہر دور میں ہندوستان کی عوامی زبان کی نمائندگی کی ہے۔ اردو دوہوں کی زبان میں تدریجی ارتقاء ہندوستان کی عوامی زبان کے ارتقاء کی تاریخ کا مواد فراہم کرتا ہے۔ صوفیاء کرام کا واسطہ عوام سے تھا لہذا انھوں نے اپنی تعلیم اور خیالات کو عوام تک پہنچانے کے لیے ایک ایسی زبان کا سہارا لیا جس کو عوام اچھی طرح سے سمجھ سکیں۔ ان صوفیا میں بابا فریدؒ، شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ، شیخ حمید الدین ناگوریؒ اور امیر خسرو نے دوہے کہے۔ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے بہت سے دوہے منسوب ہیں۔ اب تک ان کے کلام کے دو قدیم ماخذ دریافت ہو سکے ہیں۔ پہلا شیخ باجن گجراتی (۱۳۱۹ء۔ ۱۵۰۶ء) کی تصنیف خزاین رحمت اللہ (قلمی) انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان اور دوسرا، گروگرنتھ صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو"، جلد اول کے صفحہ نمبر ۳۷ پر 'خزاین رحمت اللہ" سے بابا فرید کا یہ دوہا نقل کیا ہے۔ (۲)

سائیں سیوت گل گئی ماس نہ رہیا دیہہ
تب لگ سائیں سیو سالاں جب لگ ہوں ہوں کیہہ

سکھوں کی مقدس کتاب 'آدگرنتھ صاحب' میں بابا فرید کے ایک سو تیں دوہے محفوظ ہیں۔

ایک دوہا کچھ یوں ہے کہ

دور ہے گھر اور گلی میں چکرا اور پیا سے پیار
چلوں فرید تو کمبل بھیگے، رہوں تو ٹوٹے پیار

شیخ حمید الدین سوالی ناگوری نے اپنے بیٹے شیخ عزیز الدین کو جو خطوط فارسی میں لکھے ہیں ان میں جگہ جگہ ہندی دوہے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً

جو بستر ے تو ہے سکت، سنکوچے تو سوئے
ایک پڑکھ کے نام دس، برلا جانے کوئے

(سرورالصدور۔ قلمی ص ۴۹)

جوگن کیوں نہ جانئی تمیں گن کج جھہ کائیں
بہل نہ جوگی ہاتھ پر تیتسہ آرائیں

(سرورالصدور۔ قلمی۔ ص ۷۳)

شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کا ایک دوہا حافظ محمود شیرانی نے نقل کیا ہے جو حضرت نظام الدین اولیا کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔

ساہرے نہ ماینوی پیو کے نہیں تھانو
کنہہ نہ بوجھی بات اوئی دھنی سہاگن نانو

(مقالات حافظ محمود شیرانی جلد اوّل ص ۲۹۳)

اسی طرح شیخ بوعلی قلندرؒ کا ایک مشہور دوہا یہ ہے کہ

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی کیجیو، بور کبھی نہ ہوئے

(مقدمہ۔ فرہنگ آصفیہ ص ۵)

امیر خسرو سے بہت سے دوہے منسوب ہیں۔ امیر خسرو کا ایک دوہا ملا وجہی نے "سب رس" میں نقل کیا ہے۔

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

(سب رس ص ۲۰۶۔ مرتبہ شمیم انہونوی ۱۹۶۲ء)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر خسرو کا یہ دوہا درج ہے

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانج بھئی چودیس

(بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل ص ۲۹)

افضل کی بکٹ کہانی میں یہ دوہا اس طرح ملتا ہے۔

گوری سوئی سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسروؔ گھر اپنے اور سانجھ بھئی چودیش

(درواز دہ ماہہ افضل۔ مخطوطہ پٹنہ یونیورسٹی۔ دوہا۔ ۱۳۳)

حافظ محمود شیرانی کو یہ دوہا اس طرح دستیاب ہوا

گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ پڑی چودیس

(از بیاض مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر۔ ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ
کالج لاہور بحوالہ پنجاب میں اردو، ص ۱۵۶)

ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری کا خیال ہے کہ عام طور پر یہ دوہا اس طرح مشہور ہے

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چھوں دیس

آگے چل کر لکھا ہے کہ مجھے الہ آباد کے محمد شاہ کے یہاں ایک مخطوطہ ملا جس میں 'رین بھئی چھوں دیس، کی جگہ ' سانجھ پڑی چودیس' لکھا ہوا ہے۔

(ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی رچنائیں ص ۱۱۹۔ دلی ۱۹۷۷ء)

خسروؔ نے فارسی کے علاوہ ہندوی زبان میں جو شاعری کی ہے ان میں دوہے بھی شامل ہیں۔ مثلاً یہ دوہا

خسروؔ رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو، دو ؤ بھئے اک رنگ

(رام چندر شکل۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ ص ۵۸)

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ اور امیر خسرو کے دوہوں سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو کی ابتداء کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام نے دوہوں سے استفادہ کیا اور اردو نثر کی پہلی کتاب یعنی "ملا وجہی" کی "سب رس" میں بہت سے دوہے درج کیے گئے ہیں۔

امیر خسرو کے بعد بھی متعدد شعراء نے دو ہے کہے ہیں ان میں شمس العشاق میراں جی، شاہ حسین، میاں خوب محمد چشتی، عبدالرحیم خان خاناں، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، بلھے شاہ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، شاہ عالم ثانی، سید انشاء اللہ خاں انشاؔء، نظیر اکبر آبادی، شاہ نیاز بریلوی، بہادر شاہ ظفرؔ، حسینی میاں ظریف، طالب بنارسی اور عظمت اللہ خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اردو ادب میں دو ہے نے صنفِ سخن کی حیثیت سے اپنے لیے مستقل جگہ آزادیٔ ہند کے بعد بنائی اور بقول ڈاکٹر مظفر حنفی ہندوستان کی بہ نسبت پاکستان میں دو ہے نے زیادہ برگ و بار نکالے ہیں جس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ

"برصغیر کی تقسیم کے بعد چونکہ ہندوستان کے اردو جاننے والے ہندی سے بھی جڑے رہے، اس لیے موجودہ جدت پسند دور میں اردو کے ہندوستانی شعراء کے لیے دو ہا زیادہ پر کشش ثابت نہیں ہوا حالانکہ اکا دکا لکھنے والے یہاں بھی دو ہا کہتے رہے۔ اس کے برعکس پاکستانی شعراء کی اکثریت ہندی سے نابلد تھی اس لیے وہاں دو ہا اپنی تمام تر قدامت کے باوجود نئی صنفِ سخن سمجھا گیا اور متعدد تخلیق کاروں نے اسے لائقِ اعتناء سمجھا" (۳) لہٰذا اچھے اور اہم شعراء کی بڑی تعداد دو ہے لکھنے کی طرف متوجہ ہوئی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی شعراء اردو میں دو ہے کے لیے اس ہیت کو مناسب و درست سمجھتے رہے جو قدیم ہندی میں رائج تھی لیکن پاکستان میں شعراء نے دو ہے کی ہیت میں کچھ ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے۔

قدیم ہندی دو ہے کا ہر مصرع چوبیس ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ غزل کے مطلع کی طرح دو ہے میں دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرع دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ مصرعے کا پہلا حصہ جس میں تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں "سم" اور دوسرا حصہ جس میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں "وسم" کہلاتا ہے۔

نیز ان دونوں حصوں کے درمیان لازماً وقفہ دینا ہوتا ہے۔ پاکستان میں جو دو ہا کہا جا رہا ہے ہندی پنگل کے اعتبار سے اسے سرسی چھند کہا جا سکتا ہے۔ سرسی چھند میں مطلع کی طرح دو مصرعے ہوتے ہیں اور ہر مصرع دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے پہلے حصے میں سولہ ماترائیں ہوتی ہیں اور دوسرا حصہ گیارہ ماتراؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان وقفہ لازمی ہے جسے اصطلاح میں وشرام کہتے ہیں۔ دو ہے میں سرسی چھند کے استعمال کی جدت یا بدعت کا آغاز "جمیل الدین عالیؔ" سے ہوا۔ اور دو ہا نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے ان کی تقلید میں اس ہیت کو اپنے دو ہوں میں کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

عالیؔ کی دو ہا نگاری کا آغاز:-

جمیل الدین عالیؔ کے دو ہوں کی زبان کے بارے میں محمد حسن عسکری نے غزلیں، دو ہے، گیت کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

"انہوں نے ایک عقل مندی یہ کی ہے کہ تلسی داس یا کبیر کی زبان میں نہیں لکھا۔ اس پرانی زبان کے پھیر

میں پڑ کر بعض دفعہ آدمی تلسی داس یا کبیر کے خیالات اور جذبات اپنے اوپر اس طرح حاوی کر لیتا ہے کہ شاعرانہ خلوص میں کمی آجاتی ہے اور دوہا نویسی ایک ادبی مشق بن کے رہ جاتی ہے۔ عالؔی نے اپنے دوہوں کے لیے مروجہ اردو میں ہندی کے دس پانچ مقبول الفاظ ملا کر ایک خاص زبان وضع کی ہے جس کی وجہ سے ان کے دوہوں کی تازگی دوبالا ہوگئی ہے پھر عالؔی نے تتبع کرنے کی بجائے اپنا ذاتی تجربہ پیش کیا ہے یعنی عالؔی کے دوہوں میں اسالیب بھی ان کے ہیں اور نفس مضمون بھی........"(۴)

عالؔی نے اپنے دوہوں کے لیے جو زبان ایجاد یا اختیار کی ہے وہ ہندی اور اردو کا ایسا امتزاج ہے جسے سمجھنے کے لیے نہ تو ہندی والوں کو اردو سیکھنے کی ضرورت ہے نہ اردو والوں کو ہندی سیکھنے کی ان کے دوہوں میں ہندی الفاظ کی مقدار زیادہ ہے لیکن ان الفاظ سے اردو والے نا آشنا نہیں۔ البتہ بعض دوہوں میں عالؔی ایسے الفاظ بھی استعمال کر گئے ہیں جو اردو والوں کے لیے اجنبی اور نامانوس ہیں۔ اس کے باوجود عالؔی کے دوہوں کی مقبولیت میں ان کی دوسری خوبیوں کے علاوہ ان کی عام فہم زبان کو بڑا دخل ہے۔ عالؔی کے دوہوں میں جو رس اور رچاؤ ہے اس کی وجہ دوہوں کی زبان کی لوچ اور لچک ہے۔

دوہے کی زبان دوہے کا حال وخیال اپنے تخلیقی اظہار کے لیے کچھ فطری تقاضوں کو ناگزیر قرار دیتا ہے جتنی گنجائشیں غزل کے شاعر کے لیے تغزل کے فارم میں موجود اتنی دوہے میں بظاہر نہیں ہیں۔ اس کے لب ولہجہ اس کی زبان اور اس کے فارم میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوسکتی پھر بھی دوہا نگار کو اپنی بات کو صرف دو مصرعوں یا ایک شعر میں تمام کر دینا ہوتا ہے اور اس کے لیے شاعر کے لیے غزل کے انداز میں ردیف اور قافیہ کا سہارا لینا آسان نہیں ہوتا لیکن ان دوہوں سے اس صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

تہہ میں بھی ہے حال وہی جو تہہ کے اوپر حال
مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال

جیون بوجھ بہت بھاری اور بوجھ کے سو سو ٹھاٹ
سامنے ہے اک لمبا مرگھٹ جس کو کہہ دیں باٹ

لیے پھریں دکھ اپنے اپنے راجا میر فقیر
کڑیاں لاکھ ہیں رنگ برنگی ایک مگر زنجیر

اردو والے ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

عالؔی نے دوہے کے بڑے بڑے فن کاروں کو سامنے رکھا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

سور، کبیر بہاری، میرا، رحمٰن، تلسی داس

سب کی سیوا کی پر عالی گئی نہ من کی پیاس

اور سچ ہے کہ ایک سچے فن کار کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اور فن کی نئی بلندیوں تک پہنچنے کی خواہش اور خوشی فنکار کی اپنی صلاحیت اور اس کی طبیعت کی اپج کا تقاضہ ہے۔

کیا بھرم کیا شر بھر پیو دھر کیا کھچپ کیا بیال

اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

سُر سنگیت اور موسیقی سے لگاؤ بھی عالی کی شخصیت کا ایک حصّہ ہے بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ موسیقی ان کے مزاج میں رچی بسی ہے اسی لیے ان کی شخصیت کے اس پہلو کا پتہ بھی ان کے دوہوں سے عیاں ہوتا ہے ان کے مزاج کی داخلی موسیقی جب لفظوں کا روپ دھارتی ہے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے سُر سنگیت کی دیوی اپنی پوری سج دھج کے ساتھ سولہ سنگھار کیے عالی کے دوہوں میں اتر آئی ہے۔

چھنن چھنن خود باجے مجیرا آپ مرلیا گائے

ہائے یہ کیا سنگیت ہے جو بن گا تک ابھرا آئے

ان کے یہاں آوازوں کے رقص اور شبدوں کی جھنکار کی دلکش مثالیں ملتی ہیں۔

چھم چھم جھم چھم کرنیں برسیں پون پکھاوج تھاپ

تم ہی کہو اب ایسے سمے میں کیا پن ہے کیا پاپ

چھنن چھنن خود باجے مجیرا آپ مرلیا گائے

ہائے یہ کیا سنگیت ہے جو بن گا تک ابھرا آئے

عالی کے دوہوں میں مشاہدات ومحسوسات کی دنیا آباد ہے۔ ان میں حسن اور حسنِ نظر کا شباب نظر آتا ہے۔ زندگی اور زندگی کا احساس بھی ان میں جلوہ گر ہے۔ حالات اور حادثات کا شعور بھی ان میں کمال پر ہے غرض کہ یہ دوہے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر ہیں اور ان میں قدم قدم پر ایک نئی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی

"ان میں صرف ذوق نظر کی تسکین کا سامان ہی نہیں ہے۔ ذوق حیات کی تکمیل کا سامان بھی موجود ہے۔ ان دوہوں کا مقصد تفریحی نہیں ہے۔ یہ بقول عالی من کی آگ بجھانے کے لیے کہے گئے ہیں۔ لیکن من کی آگ کبھی بجھتی نہیں۔ یہی ان دوہوں کا مقصد ہے۔ یہ من کی آگ کو بجھاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس احساس کو بھی بیدار کرتے ہیں کہ انسان کے من کی آگ کا بجھنا آسان نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ دوہے دل سے نکلی ہوئی آواز ہیں۔ یہ آواز دلوں میں اترتی ہے، ذہنوں میں گونجتی ہے اور روح پر منڈلاتی ہے۔" (۵)

عالی کے دو ہے لطیف احساس جمال اور ذوق حسن کی پیداوار ہیں۔ ان میں حسن کا بہت ہی رچا ہوا احساس ملتا ہے ۔ عالی کی نگاہیں اس حسن کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتی ہے، اور وہ انسان، زمانے اور زندگی سب میں حسن کے پہلو تلاش کر لیتی ہیں۔ عام طور پر عالی گوشت پوست کے انسان ٹیں حسن دیکھتے ہیں۔ انہیں رنگ روپ میں حسن نظر آتا ہے وہ اسے شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

"عالی کے ان دوہوں میں حسن کا بیان صرف مشاہدے ہی تک محدود نہیں ہے، اس کا تعلق محسوسات سے ہے اس لیے اس میں وہ رشتہ اور تعلق نمایاں نظر آتا ہے جو حسن اور حسن نظر، جمال اور ذوق جمال میں ہوتا ہے۔ "(۱) یہ دوہے اسی رشتے اور تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

کدھر ہیں وہ متوارے نیناں کدھر ہیں وہ رتنار
نس نس کھنچے ہے تن کی جیسے مدرا کرے اتار

گھنی گھنی یہ پلکیں تیری یہ گرماتا روپ
تو ہی بتا او نار میں تجھ کو چھاؤں کہوں یا دھوپ

کہو چندرماں آج کدھر سے آئے ہو جوت بڑھائے
میں جانوں کہیں رستے میں مری نار کو دیکھو آئے

روپ بھرا مرے سپنوں نے یا آیا میرا میت
آج کی چاندنی ایسی جس کی کرن کرن سنگیت

ناتری ایسی بالی عمریا نا ایسی نادان
پر جب ہم کوئی بات کہیں تو بنے یونہی انجان

یہاں مشاہدات سے زیادہ محسوسات کا رنگ نمایاں ہے اور اس رنگ نے ان دوہوں میں بڑا حسن پیدا کر دیا ہے۔

عالی کے دوہوں میں ہمیں ہر طرح کی عورتیں اپنے حسن کے ساتھ نظر آتی ہیں ان میں اپنی، پرائی سب ہی قسم کی عورتیں شامل ہیں۔ عالی نے دوہے کو ایک نیا شخصی رنگ بھی دیا ہے اسی شخصی رنگ میں ایک پہلوان کا اپنی بیوی سے اظہار عشق بھی ہے۔ عالی نے اپنی منکوحہ عورت کو جس عزت و احترام کے ساتھ اپنے دوہوں میں پیش کیا ہے اس کی مثال اردو کی عشقیہ شاعری میں مشکل سے ہی ملے گی۔

گھر والی جو سکھوں کی ساتھی دکھوں میں تیری داس
جھوٹا پر کھے سچا جانے رکھے تری ہی آس

وہ ترے بچے پالنے والی وہ ترے گھر کی لاج
کیا اسے بھول کے مست ہوا ہے تف تجھ پر کو یراج

کتنی بار کیے ہیں ہم نے سات سمندر پار
گھر والی سی کوئی نہیں تھی ناریں ملی ہزار

ڈھونڈ لو میری ناری کو ہے اس کی اک پہچان
چنکی لو تو پگھل بہے اور پوجو تو بھگوان

اگنی پوجیں، سورج پوجیں، پوجیں جل اور ناگ
عالیؔ اپنی نار کو پوجیں یہ عالیؔ کے بھاگ

عالیؔ تیرا بھید ہے کیا ہر دوہے پر بل کھائے
میں جانوں ترے پاپی من کو گھر والی یاد آئے

نا مرے سر کوئی طرہ کلغی نا کھیسے میں چھدام
ساتھ میں ہے اک ناری ساتوری اور اللہ کا نام

عالیؔ نے پرائی عورت، اور طوائف کی حقیقی تصاویر بھی نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کی ہیں۔

ایک بدیسی نار کی موہنی صورت ہم کو بھائی
اور وہ پہلی نار تھی بھیا جو نکلی ہر جائی

مدرا پی کر بہکے گوری بہک بہک لہرائے
اور اپنا یہ حال کہ جیسے نس نس دل بن جائے

ہم بھی تازہ پھول سے چھیلا وہ بھی روپ بہار
لیکن پریم سے بڑھ کہ پیارے پیسے کی ہے مار

صبح جو اٹھ کر چلی وہ پاتر آیا دل میں دھیان
وہی عورت لے پانچ روپے اور وہی عورت لے جان

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ لاکھا، گال پہ لالی، آنکھیں بہت اداس

تیس روپے میں بیس ہیں اس کے دس لیو لے دلال
اتنا مہنگا شہر اور اس میں ایسا سستا مال

عالی جہاں بھی پہنچے وہاں انہوں نے اس دیس کی ناریوں کے حسن و جمال، ان کے کردار اور عادات و اطوار کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور جو نقش ان کے ذہن پر مرتسم ہوئے ان کا تخلیقی اظہار بھی ان کے دوہوں میں ملتا ہے۔

پورب کی ابلا دکن کی ابلا یا پنجاب کی نار
عالی اپنے من پر سب کے گہرے گہرے وار

وہ اندھیاروں میں کل عالی بن گئی اپنی بات
ایک طرف تھی دکنی ابلا ایک طرف تھی رات

اکبر شاہ نے راگ سنا اور ہم نے دیکھی یار
صرف نظر سے آگ لگانے والی دیپک نار

برقع پوش پٹھانی جس کی لاج میں سو سو روپ
کھل کے نہ دیکھی پھر بھی دیکھی ہم نے چھاؤں میں دھوپ

اک لاہور کی تیکھی بانکی پڑھی لکھی مغرور
شاعر کو آوارہ کہوے افسر کو مزدور

یہ گدرایا بدن ترا یہ جوبن رس یہ چال
اری مراٹھن ہم پردیسی سن تو ہمارا حال

بیر بہوٹی رنگت والی اک ناری انگریز
بات میں کتنی سیدھی سنبھل گھات میں کتنی تیز

جرمن کی کیا ٹھوس جوانی کیا رنگت کیا ہاڑ
اس کے بوجھ سے دل پھٹ جائے چیز ہی کیا ہے پہاڑ

ایک فرانسیسی ابلا تھی الگ تھلگ چپ چاپ
ایسے پیارے لوگ دکھی ہوں ہائے رے یہ کیا پاپ

سانوری بنگلہ ناری جس کی آنکھیں پریم کٹورے
پریم کٹورے جن کے اندر کن کن دکھوں کے ڈورے

عالی کے دوہوں میں اردو شاعری کی روایت کے مطابق عشق و محبت کا اظہار مرد کی طرف سے ہی کیا گیا ہے۔ عالی

نے اپنے دوہوں میں جس مرد کو پیش کیا ہے وہ مستقل شریف مستقل پر سکون اور دل پسند شوہر کی صفات کے امتزاج کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

آپ بنا بنجارہ میں اور آپ بنائی باٹ
سچ کہیو رے دیکھنے والے ایسے کس کے گھاٹ

یہ ہر سندر نار کو تکنا یہ جھک جھک پرنام
عالی تو تو گیانی دھیانی یہاں تر کیا کام

عالی جی اک دوست ہے اپنے جن کا ہے یہ کام
جیون بھر زودش رہیں اور جیون بھر بدنام

اپنا تو جیون ہے عالی سادھو کا بیوہار
ہم میں ایسے ڈھنگ کہاں جو کرتے دیش سدھار

بنا تو جھوٹا میل رکھے ہے نارہ رہ مسکائے
عالی تو ہی بتا کوئی تجھ کو کاہے میت بنائے

جسے یہ چھولیں بنے وہ سونا آپ یہ خالی ہاتھ
عالی جی کا نام پڑا ہے مرزا پارس ناتھ

عالی جی کے منہ پر مہریں عزت دھرم سماج
خیر اک دن سب بات کھلے گی لاکھ چھپاؤ آج

پہنے مولسری کے کنٹھے سونگھے سرخ گلاب
پاکستان میں جو ہوں عالی دلی میں تھے نواب

ادھر ہمیں بھی اپنی صورت اور شہرت پہ ناز
غالب ہوئے بنا بھی رکھیں غالب سے انداز

عالی کے ہاں حسن کا حسیاتی یا محسوساتی اظہار بہت نمایاں ہے لیکن اس قدر نہیں کہ زندگی کی جذباتی کیفیات اور ذہنی واردات پر حاوی ہو جائے۔ عالی نے اپنے دوہوں میں ان کیفیات اور واردات کو پیش کرتے ہوئے انسانی زندگی کے جذباتی عمل اور ردعمل کی حقیقت کی بھی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

محبوب سے دوری اور ہجر و فراق کی کیفیت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار
بوند پڑے ہے بدن پہ ایسے جیسے لگے کٹار

ٹھنڈی چاندنی اجلا بستر بھیگی بھیگی رین
سب کچھ ہے پر وہ نہیں جن کو ترس گئے مرے نین

جاڑا آیا ٹھنڈی ہوائیں من سب کے برمائیں
کتنے درد کی بات ہے گوری ہم تجھے یاد نہ آئیں

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

اپنے ہی من کا رونا کیا ہر من میں لگی ہے آگ
ساجن مل کر جدا نہ ہوں اے سکھی یہ کس کے بھاگ

میٹھی میٹھی کسک تھی دل میں نا کوئی غم نا سوگ
دو ہی دن کے بعد مگر یہ پریت تو بن گئی روگ

عالی نے عالم فراق کی ان مختلف حالتوں کو ایک ماہر نفسیات کی طرح پیش کیا ہے ان کی آپ بیتی نے جگ بیتی کا روپ دھار لیا ہے۔ کچھ اور مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار
پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

ٹہل ٹہل کر اب تو دیکھی جائے نہ ان کی باٹ
چل رے عالی دوار کے باہر ڈالیں اپنی کھاٹ

نیند کو روکنا مشکل تھا پر جاگ کے کاٹی رات
سوتے میں آ جائے وہ تو نیچی ہوتی بات

روپ بھرا مرے سپنوں نے یا آیا میرا میت
آج کی چاندنی ایسی جس کی کرن کرن سنگیت

کون ہے جس سے ملے بنا بھی اسی کا ہر دم دھیان
کون ہے جس کے بدن کی دوری کھینچ رہی ہے جان

ٹھنڈے پون جھکورے آئیں تیری یاد دلائیں
ہم کچھ بھی کہیں من تجھے مانگے من کو کیا سمجھائیں

عاؔلی کے دوہوں میں زندگی کی بہت سی حقیقتیں بھی بے نقاب نظر آتی ہیں۔ معاشرتی حالات کا شعور بھی عاؔلی کے یہاں نمایاں ہے، بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی "ان کے دوہوں میں سے بیشتر میں یہ شعور کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، بعض جگہ تو وہ واضح طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ زندگی میں معاشی حالات کی ناہمواری انسان کی انفرادیت کو ختم کردیتی ہے۔" (۶)

انسان اپنے پیٹ کی خاطر سب کچھ کر گزرتا ہے اور روٹی کی تلاش میں در در کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ عاؔلی نے ان خیالات کو اپنے دوہوں میں یوں پیش کیا ہے کہ

واں وہ نین کنول مرجھائے سوکھ گیا ہاں ہاڑ
بھوک کی گرمی سب کو بھونے ندی ہو کہ پہاڑ

روٹی جس کی بھینی خوشبو ہے ہزاروں راگ
نہیں ملے تو تن جل جائے ملے تو جیون آگ

ان ناسازگار حالات نے معاشی اعتبار سے زندگی میں جو کش مکش اور آویزش پیدا کی ہے، عاؔلی نے اس کو بھی محسوس کیا ہے وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔ زندگی کی تلخیاں ان کے دوہوں میں بے نقاب نظر آتی ہیں۔

بھوکی آنکھ سے بیٹا دیکھے خالی پیٹ ہو باپ
ساوتری ماں بیٹی لاج سے روز کرائے پاپ

قدامت پرستی، جاگیردارانہ نظام، مزدوروں اور کسانوں پر ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے عاؔلی غم و غصہ کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ

مورکھ اب بھی آنکھیں کھول اور دیکھ سمے کے کھیل
ٹوٹ رہی ہے سوکھ رہی ہے ظلم کی اک اک بیل

او دیوار پرانی ہٹ جا تیز ہے جنتا دھار
اب تیری بنسی نہیں بجے گی چلے گی اب تلوار

آلھا اودل گانے والے پیارے سے کترائیں
ہل کا بوجھ اٹھانے والے ڈنڈے سے دب جائیں

کھیت کٹا تو لے گئے ٹھاکر منشی ساہوکار

گھر پہنچے تو بھوکی بہوا ک برچھی سی دے مار

کھیتی سونا چاندی اگلے گھر میں پہنچے روگ

پاسی آگ انگار چبائیں بنیے اڑائیں بھوگ

اور زندگی کی اس حالت پر عالی نے یہ راگ چھیڑا ہے کہ

عالی نے اک لیا مجیرا اور چھیڑا یہ راگ

جس کا کھوج لگا پچھم میں پر جو سب کی آگ

ہے بھین یہ کھیت ہمارے ہمیں میں سے سرکار

ہے بھین ہم ایک ہی ندی وہی جل اور وہی دھار

ہے بھین اس دھرتی ماں کی کوکھ میں سب کا تاج

ہے بھین اس دھرتی ماں پر ایک کرے کیوں راج

ہے بھین یہ تیری بانہیں جیسے لوہا لاٹ

ہے بھین یہ تیری بانہیں سب کو کرائیں ٹھاٹ

ہے بھین ترا جھلسا چہرہ ان کے رنگ بڑھائے

ہے بھین تیری اپنی عورت دوجے کے گھر جائے

لیکن عالی ایک نئی زندگی اور نئے نظام کا خواب دیکھتے ہیں۔ سورج انہیں ابھرتا ہوا نظر آتا ہے اور اندھیرا چھٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے یہ خیالات ان کے گہرے سماجی اور طبقاتی شعور کو واضح کرتے ہیں۔

ہے بھین وہ دیکھ سمے نے اپنی تان لگائی

ہے بھین وہ ہوا سویرا نئی کرن لہرائی

ڈاکٹر خلیق انجم نے عالی کی عوام دوستی پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے

"ان دوہوں میں ایک خلیق ذہن، طبع رسا، باشعور ذہن کے غیر معمولی تخلیقی تجربوں کا اظہار ہے، بڑی بات یہ ہے کہ ان دوہوں میں شاعر کا لب ولہجہ عام مفکر یا دانشور کا نہیں بلکہ ایک عام انسان کا ہے۔ ایک ایسا عام انسان جسے ورثے میں برصغیر کے صوفی سنتوں کی عظمت ملی ہے۔ ان دوہوں کا خالق ایک سیدھا سادا، عام انسان ہے، عوام سے بلند ہوتے ہوئے بھی عوام کے ساتھ ہے۔" (۷)

عالی ایک ایسے انسان دوست شاعر ہیں جن کا مذہب انسانی ہمدردی، باہمی محبت اور اخوت پر مبنی ہے جس کا اظہار

وہ اپنے دوہوں میں اس طرح کرتے ہیں۔

صدیوں کے انبار میں بھگون دیجو کبھی دکھائے

ایک ہی دن جب کوئی کسی کو دکھ نا دینے پائے

اک دوجے کا ہاتھ پکڑ لو اور آواز لگاؤ

اے اندھیارو! سورج آیا سورج آیا جاؤ

عالؔی کی شخصیت کی دلکشی، بے تکلفی، بے ساختگی اور معصومانہ صاف گوئی ان کے دوہوں میں بھی نمایاں ہے۔ وہ جو بات جس طرح محسوس کرتے ہیں اسی طرح کہہ دیتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں جذباتی شدت کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی بھی پائی جاتی ہے مگر گہری سے گہری بات کرتے ہوئے بھی وہ بے ساختگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بصیرت اور بے ساختگی کا امتزاج عالؔی کے معاصرین کے ہاں کم ہی ملتا ہے۔

میں نے کہا سپنوں میں بھی شکل نہ مجھ کو دکھائی

اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی

نہ تو جھوٹا میل رکھے ہے، نہ رہ رہ مسکائے

عالؔی تو ہی بتا کوئی تجھ کو کاہے میت بنائے

اس کلجگ نے دل والوں سے جو جو بوجھ اٹھوائے

ایک بھی جس پربت پر رکھ دیں، وہ پربت پھٹ جائے

رت کے ساتھی، سمے کے سنگی، بے دھرمے، بے ذات

جو جس دم ہو ان کا افسر، اونچی اس کی ذات

نہ یہ جیون بھید کی روگی، نہ انہیں ہر دم سوچ

نہ انہیں دن کی سختی کھائے، نہ انہیں رات کا لوچ

عالؔی کے ان آخری تین دوہوں میں طنز نگاری کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ جو عام طور پر ان کے دوہوں کا نمایاں عنصر نہیں ہے۔ لیکن ان دوہوں سے عالؔی کے زبردست طنز نگار ہونے کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ان میں طنز کی تلخی کے ساتھ ان کے لہجے کی دردمندی بھی گھل مل گئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالؔی کے دوہے ان کی شخصیت کی تمام شوخی، شگفتگی، بانکپن اور چھیلے پن یعنی

عالیؔ اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تیوہار

ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

کے باوجود اداسی اور دردمندی سے خالی نہیں۔ یہ تضاد کوئی حیرت کی بات نہیں یہ تو شاعری اور شخصیت کے پیچیدہ رشتوں کی کارفرمائی ہے۔ عالیؔ کے دوہے ان کی شخصیت اور مزاج پر خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اکثر بات اپنی ذات سے شروع کرتے ہیں لیکن آخر میں کوئی ایسا نتیجہ نکالتے ہیں جس سے انسانی زندگی کی کوئی اہم حقیقت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ انہوں نے اپنی بابو گیری کا ذکر کرتے ہوئے بہت اہم حقائق کو واضح کیا ہے۔

بابو گیری کرتے ہو گئے عالیؔ کو دو سال

مرجھایا وہ پھول سا چہرہ بھورے پڑ گئے بال

دھیرے دھیرے کمر کی سختی کرسی نے لی چاٹ

چپکے چپکے من کی شکتی افسر نے دی کاٹ

دھرتی سے آکاش پہنچتے دھنک نے کیا بل کھائے

کوئی دیکھے کوئی سوچے من سب کا لہرائے

نہ کوئی اس سے بھاگ سکے اور نا کوئی اس کو پائے

آپ ہی گھاؤ لگاوے سے اور آپ ہی بھرنے آئے

چند اور دوہوں میں زندگی، روح اور اس کے دکھ سکھ کی حقیقت پر اسی طرح روشنی ڈالی ہے۔

سنو سنو یہ بالک میرا یوں ہی نا چلائے

کہوے ہے اس بندی گھر میں کا ہے مجھے لے آئے

آتما جیسی بانکی تتلی جب بن جائے شریر

اور نہ جانے اب جیون کی کیا کیا ہو تاثیر

ہے بالک اس چکر کو پرماتما خود بھی روئے

جیون کی تو ذات ہی کالی کون سیاہی دھوئے

ہے بالک تو جگ جگ جیوے رکھیو یاد یہ بول

جیون کے اندھیارے میں ہیں دکھ ہی سکھ کا مول

یہاں کچھ واعظانہ انداز ضرور نمایاں ہے لیکن اس کے باجود چونکہ ان دوہوں میں انسانی زندگی کے اہم حقائق کا اظہار ہے اس لیے ان کا اثر دیرپا ہے۔ عالیؔ کے دوہے ان کی ذہنی زندگی اور احساس جمال کی پرچھائیاں ہوتے ہوئے سفر

و خضر کی واردات بھی ہیں۔ جو ان کے سوانح و سیرت کے مطالعے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ مشرق و مغرب کے بہت سے ملکوں میں ان کا شاعرانہ سفر ایک ادبی سفارت بھی ہے۔ یہ دوہے جب کسی کے سامنے آتے ہیں صرف شعری تخلیقات کی حیثیت سے نہیں بلکہ اردو کی مقبولیت اور عالی کی شاعرانہ شہرت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

لندن بھی مرے جیون جیسا کچھ دھولا کچھ کالا

تھوڑی وہسکی باقی پانی بھد نکلا پیالا

ڈوبتے سپنے ٹوٹتی کرنیں مدھم ہوتے ساز

پیرس اور لاہور میں سینے پت جھڑ کی آواز

بمبئی پونا، حیدرآباد نہ آئے ہم کو راس

پیٹ کو بھر کر کیا کیجئے جب من ہی رہے اداس

عالی کے دوہوں کا یہ تفصیلی جائزہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عالی کے دوہوں میں مضامین کا تنوع ہے ان میں ذاتی مشاہدات، جذباتی تجربات، ذہنی واردات اور فکری تصورات شامل ہیں۔ عالی نے ان دوہوں میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان گنت معاملات و مسائل کو رچے ہوئے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم

"عالی کے دوہے محض رومانی نہیں ہیں بلکہ ان میں موضوعات کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کے مضامین میں غیر معمولی تنوع ہے۔" (۸)

ان مختلف مضامین کو عالی نے جس خوبصورتی سے اپنے دوہوں میں پیش کیا ہے وہ دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتے ہیں اور عالی کے یہ دوہے ایک تجربے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

"ان میں ایک نئی امیجری، ایک نئی زبان اور ایک نیا لب ولہجہ ملتا ہے جو عالی کی جدت پسند طبیعت کا ایک کرشمہ ہے اس تجربے نے جدید اردو شاعری کو ایک صنف سے آشنا کیا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہی نہیں ایک فنی دریافت بھی ہیں اور اس فنی دریافت کا سہرا عالی کے سر ہے۔" (۹)

عالی دوہا نویسی کے امام ہیں اور اس فن کے سرپرست ہیں دوہے ان کی پہچان ہیں۔

ڈاکٹر عرش صدیقی نے عالی کے دوہوں کی مقبولیت کا ذریعہ مشاعروں کو بتایا ہے اور ان کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی خوش الحانی کو قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

"جمیل الدین عالی کو خدا نے ایک نہایت باوقار، دلکش اور خوبصورت شخصیت عطا کی تھی۔ جن دنوں یعنی اس صدی کی چھٹی ساتویں دہائی میں وہ مشاعروں میں دوہے سناتے تھے تو پورے پنڈال یا ہال میں ان سے زیادہ خوبصورت، وجیہہ، اور دلکش شخصیت اور کوئی نہیں ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک سحر تھا اور دیکھنے والا یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی شخصیت کو

ہوٹ کیا جائے۔ مزید برآں عالی کو قدرت نے، جو لحن داؤدی عطا کیا تھا اس کی جادو اثر گونج مشاعرے کے بعد بھی مسلسل سامع کا تعاقب کرتی تھی۔ عالی کی کتاب تو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی لیکن مشاعروں کے ذریعے وہ پورے برصغیر میں اس سے بہت پہلے بطور ایک دوہا نگار مقبول ہو چکے تھے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی خوش الحانی تھی درست ہے کہ شاعری میں یہ موسیقیت اضافی خوبی ہوتی ہے لیکن شاعری میں معیار کے ساتھ یہ خوبی موجود ہو جیسا کہ جمیل الدین عالی کے ہاں ہوا تو کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔" (۱۰)

شبیر علی کاظمی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں عالی کے دوہے پڑھنے کے انداز کو اس طرح سراہا ہے۔

"عالی کے دوہوں میں کویتا کا رچاؤ اور فکر کا بھاؤ انسانی ذہن کو بھاتا ہے عالی جی جب اپنے دوہے پڑھتے ہیں تو سماں نہایت فرحت بخش ہوتا ہے۔ سامعین کو سکونِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ (۱۱)

خود عالی نے اپنے دوہوں میں بھی مشاعروں اور اپنی خوش آوازی کا ذکر کیا ہے کہ

کچھ دن گزرے عالی صاحب عالی جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریے قریے شعر سنانے جاتے تھے

دوہے کہنے اور پڑھنے کا ایسا طرز نکالا تھا
سننے والے سر دھنتے تھے اور پہروں پڑھواتے تھے

سامنے بیٹھی سندر ناریں آپ طلب بن جاتی تھیں
پردوں میں سے فرمائش کے سو سو پرچے آتے تھے

فیشن تھا یا خوش آوازی یا کچھ سحر جوانی تھا
کبھی کبھی تو ان پر گھر کے گھر عاشق ہو جاتے تھے

عالی کے دوہوں کی موسیقیت اور خوش آوازی نے بھی انہیں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عالی نے دوہے کو ایک خاص مقام عطا کیا اور بلا شبہ ہم انہیں جدید دوہے کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔ بقول سید قدرت نقوی " آئندہ جو بھی اردو کی ادبی تاریخ لکھے گا وہ جدید دوہے کا بانی عالی ہی کو قرار دے گا اب بعض ناقدین نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان میں سب سے پہلے عالی نے دوہے لکھے اور دوسروں نے اس انداز، اسلوب، مفہوم اور زبان کو اپنایا۔....... دوہے کو بحیثیت صنفِ سخن ایک خاص مقام بھی عالی ہی کی بدولت ملا"۔ (۱۲)

عالی نے اپنی انفرادیت کی وجہ بھی خود ہی بیان کی ہے کہ

اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے اس عالی چال کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے کہ

"انھوں نے دوہا نگاری میں کچھ ایسا راگ چھیڑا ہے، یا اردو سائیکی کے کسی ایسے تار کو چھو دیا ہے کہ دوہا ان سے اور وہ دوہے سے منسوب ہو کر رہ گئے ہیں دوہا تو ان سے پہلے بھی تھا (کیا بھومر کیا شربھ پیودھر کیا کچھپ کیا بیال) لیکن عالی چال، سے انھوں نے دوہے کی جو بازیافت کی ہے اور اسے بطور صنفِ شعر کے اردو میں جو استحکام بخشا ہے، وہ خاص ان کی دین ہو کر رہ گیا ہے۔" (۱۳)

عالی کی دوہا نگاری کی بدولت ہی ان کی آواز اور ان کا شعری انداز پوری دنیا میں الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ عالی کے دوہے تقلیدی نہیں ہیں بلکہ ایک الگ فضا کی پیداوار ہیں اور یہ فضا عالی کی اپنی فضا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے عالی کے دوہوں کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

"ان میں افسردہ سی شہزادگی کی بوباس بھی ہے اور قلندر، جوگیوں، فقیروں کی ترنگ بھی مگر کرشن بھگتوں کی مانند پریم دھرم اس کا اصل روپ ہے کچھ اس طرح لگتا ہے، تتلی ہے جو ہر پھول پر بیٹھنا چاہتی ہے، مگر پھول پتی سے ہونٹ لگاتے ہی یہ اڑی، وہ گئی اور پھر دوسرا پھول سامنے آیا، وہی ماجرا وہی سرگزشت بس رس کی پیاس ہے جو بجھتی نہیں! عالی کے دوہوں میں سنسار کے اخلاقی تجربے تو ہیں لیکن الم کی چبھن کم سے کم ہے۔ اس کے علاوہ جوگیوں اور سنیاسیوں کی سی بھگتی بھی نہیں۔ معرفت کے نغمے ندارد اور ساری تگ و دو میں اگر کچھ ہے تو یہ کہ

عمر گنوا کر پیت میں ہم کو اتنی ہوئی پہچان

چڑھی ندی اور اتر گئی پر ہو گئے ویران" (۱۴)

عمر گنوا کر عالی نے دوہا نگاری کا حق ادا کر دیا۔ جدید عہد میں دوہے لکھنے کی روایت ان ہی کی موہونِ منت ہے یہ عالی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے جدید اردو شاعری میں دوہوں کی قدیم روایت کو حیات نو بخش کر اس میں تازگی پیدا کی۔

مشفق خواجہ نے "حرفے چند" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ

"اگر چہ ان کی تقلید میں بہت سوں نے اس ذریعہ اظہار کو اپنایا ہے لیکن دوہا صرف عالی ہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ (۱۵)

عالی کے بعد بہت سے نئے اور پرانے شعراء نے اردو دوہے کہے بعض نے ہر لحاظ سے عالی کی تقلید کی اور بعض نے عالی پر اعتراضات کیے۔ انہوں نے عالی کے دوہوں کی بحر کو بنیاد بنا کر کہا کہ عالی دوہا نگار تھا ہی نہیں۔ وغیرہ وغیرہ

اس کا جواب عالی نے اس طرح دیا ہے کہ

کیا بھرمر، کیا شربھ، پیودھر، کیا کچھپ کیا بیال

اپنا چھند الگ ہے جس کا نام ہے عالی چال

اردو والے ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں

ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

عالی کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ جس فارم میں لکھتے ہیں اس کا اصل نام کیا ہے۔ انہوں نے ہندی شاعروں کے خیالات اور احساسات کی روایت اپنانے کے بجائے اپنا ذاتی تجربہ پیش کیا ہے۔

عالی کو دوہا نگار نہ ماننے والوں نے بھی عالی کے دوہوں کی قوت، زوار، اثر آفرینی اور دلکشی کو بہت سراہا ہے۔

ڈاکٹر عرش صدیقی نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ

"عالی کے بعد جو بھی دوہے کہے گئے اور دوہے کے بارے میں جو کچھ بھی ہمارے ہاں لکھا گیا وہ کبھی ظہور میں نہ آتا اگر عالی کا کام دوہوں کے حوالے سے نمایاں نہ ہوا ہوتا۔ یعنی جو کچھ لکھا گیا اور اب تک لکھا جا رہا ہے وہ یا تو عالی کے تتبع میں یا پھر اس کے خلاف ردعمل کی صورت میں۔ اگر عالی نے دوہا نگاری نہ کی ہوتی تو سلیم جعفر اور محمد حسن عسکری سے لے کر الیاس عشقی اور عادل فقیر تک کوئی شخص بھی ہمارے ہاں نہ تو اتراور حوصلے سے دوہے تخلیق کرتا نہ اس صنف کے بارے میں کچھ لکھنے کا حوصلہ آسانی سے کر سکتا۔ (۱۶)

اور اصل حقیقت یہی ہے کہ عالی کی بحر کو نہ صرف بہت سے شعراء نے اپنایا بلکہ زیادہ تر نقادوں نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔

قدیم بحر میں دوہا کہنے والوں کی تعداد بہت کم ہے اور ان میں بھی سوائے الیاس عشقی کے کسی شاعر نے پورے انہماک اور توجہ سے تخلیقی کام نہیں کیا۔ ان کے علاوہ قدیم بحر میں لکھنے والوں میں ڈاکٹر وحید قریشی، سید قدرت نقوی، بھگوان داس اعجاز، کاوش پرتاب گڑھی، شمین کاف نظام، عبدالعزیز خالد، قتیل شفائی، عمر صفی، وقار واثقی اور سوہن راہی شامل ہیں۔

جبکہ عالی کی بحر میں دوہے لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں پرتو روہیلہ، تاج سعید، عابد صدیق، عادل فقیر، جمیل عظیم آبادی، رحمٰن خاور، رشید صبرانی، حامد برگی، توقیر چغتائی، شیخ ایاز (ترجمہ آفاق صدیقی)، نصیر احمد ناصر، شاعر صدیقی، جمال پانی پتی، سلطان اختر، جلیل ہشمی، شمی فاروقی، شفقت بٹالوی، شفقت تنویر مرزا، افضل پرویز، شر نعمانی، محمد علی بخاری، انوار انجم اور نگار صہبائی، کشور ناہید، مشتاق چغتائی اور عادل فقیر وغیرہ شامل ہیں۔

ممکن ہے کہ عالی کے بغیر بھی یہ محترم لوگ دوہا کہتے لیکن عالی کے بغیر ہمارے ہاں اردو دوہے کے استحکام کی روایت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔

اس ساری بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالی دور جدید کی اردو شاعری میں دوہا نگاری کے پیش رو ہیں اور ان کی تقلید میں ہی اس دور کی شاعری میں دوہا نگاری کی صنف کو نہ صرف فروغ حاصل ہوا بلکہ اس کے نئے امکانات بھی روشن ہوئے۔

حواشی وحوالے

(۱) جمیل الدّین عالؔی شخصیت وفن مرتبہ ایم حبیب خان۔ دہلی۔۱۹۸۸ ص۴۹۱

(۲) اردو شاعری میں دوہے کی روایت۔ ڈاکٹر سمیع اللہ شرفی۔ اردو کے ہندو علی گڑھ ص۷۵

(۳) "اردو میں دوہے" ڈاکٹر مظفر حنفی۔ ارمغانِ عالی۔ ص۲۷۲،ص۲۷۳

(۵) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ارمغان عالؔی ص۸۰

(۶) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ارمغانِ عالؔی ص۸۳

(۷) جمیل الدّین عالؔی، فن اور شخصیت۔ مرتبہ ایم حبیب خان۔ دہلی۔ ۱۹۸۸ء ص۱۵۵

(۸) ڈاکٹر خلیق انجم۔ جمیل الدّین عالؔی۔فن اور شخصیت۔ایم حبیب خان۔دہلی۔ ۱۹۸۸ء ص۱۵۵

(۹) ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ارمغانِ عالی ص۸۶

(۱۰) ڈاکٹر عرش صدیقی۔ پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقاء اور کملی میں بارہ سے فروری ۱۹۹۲ء،نوبہار پریس ملتان۔ ص۱۸ ص۱۹

(۱۱) جمیل الدّین عالؔی۔ فن اور شخصیت۔ ایم حبیب خان۔ ص۶۰،ص۶۱

(۱۲) جمیل الدّین عالؔی۔ فن وشاعری۔ ایم حبیب خان۔ ص۲۲۲

(۱۳) پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ جمیل الدّین عالؔی فن وشخصیت،مرتبہ حبیب خان ص۳۶۹

(۱۴) ڈاکٹر سید عبداللہ۔ دل والے کی بھاشا۔ تخلیقی ادب (۳) کراچی ص۷۵۳

(۱۵) مقدمہ "حرفے چند"۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی ۱۹۸۸ء ص۱۴

(۱۶) پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقا اور کملی میں بارات۔ ڈاکٹر عرش صدیقی۔ ص۲۱،ص۲۲

"جیوے جیوے پاکستان":-

قومی نغموں اور ملی ترانوں کا مجموعہ "جیوے جیوے پاکستان" ۱۹۷۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔

قومی یکجہتی اور قومی فکر کی تجدید اور ترقی کے لیے عالی نے جو قومی نغمے لکھے اس میں بہت سال صرف کیے۔ عالی نے پاکستان کے علاقائی کلچر کی لوک دھنوں پر اردو میں جو قومی نغمے تحریر کیے وہ بہت مقبول ہوئے خصوصاً "جیوے جیوے پاکستان" "ہم مصطفوی ہیں" "پشتو دھن ٹپا پر مبنی یہ نغمہ "خدا نے اک وطن دے کر ہمیں بخشا دل دیوانہ" وغیرہ۔ جمیل الدین عالی کی تخلیقی صلاحیت کا ایک نمایاں پہلو ان کا ملی شاعر ہونا ہے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں جب بھارت نے اچانک پاکستان پر حملہ کر دیا تو پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سامنے آ گئی اور بھارت کو منہ کی کھانی پڑی۔ اپنے ملک کے دفاع کے لیے پاکستان کا بچہ بچہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہمارے شعراء اور گلوکار بھی اس محاذ پر کسی سے پیچھے نہ رہے۔

عالی کا درجہ اس لحاظ سے بہت بلند ہے۔ ان کے اشعار عوام کی زبان پر جاری رہے۔ اور ملکہ ترنم نور جہاں نے جب یہ نغمے گائے تو ہمارے مجاہدوں میں ایک نیا جوش ولولہ پیدا ہوا۔

مثلاً

اے وطن کے سجیلے جوانو
میرے نغمے تمھارے لیے ہیں
جو حفاظت کرے، سرحدوں کی
وہ فلک بوس دیوار ہو تم
قوم کے اے جری پاسبانو
میرے نغمے تمھارے لیے ہیں

یہ نغمے عالی کی زندگی کا حاصل ہیں۔ اگر وہ کچھ نہ بھی کہتے تب بھی ان کا نام ہمیشہ روشن رہتا۔ عالی کا لگاؤ بنیادی طور پر پاکستان اور عوام سے ہے اس لیے وہ کہتے ہیں۔

یہ وطن میرا وطن
ایمان والوں کا وطن

عالی کا یہ دعائیہ نغمہ تو ان کی پہچان بن گیا ہے۔

جیوے جیوے پاکستان
جھیل گئے دکھ جھیلنے والے اب ہے کام ہمارا
ایک رکھیں گے ایک رہے گا ایک ہے نام ہمارا

پاکستان ! ! !

عاؔلی قومی یکجہتی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ تمام پاکستانی مل جل کر رہیں ہر زبان پر وطن عزیز کا ترانہ ہونا چاہئے اور ہر آدمی وطن کی محبت میں سرشار ہو اور ہر ایک کی زبان پر ہر وقت ہر کام کے لیے وطن کا نام ہو۔سب لوگ مل جل کر پاکستان کو سنوارنے کی کوشش کریں۔

اب یہ انداز انجمن ہوگا

ہر زبان پر وطن وطن ہوگا

فکر ہوگی کہ خار و خس نہ رہیں

شوقِ آرائش چمن ہوگا

اور آخر میں کہتے ہیں کہ

اے مری روح میرے پاکستان

تو ہی میری بقائے فن ہوگا

کچھ لوگوں نے پختونستان کا نعرہ لگایا تو جمیل الدین عاؔلی تڑپ اٹھے اور بہت ہی نرم لہجے میں لوگوں کو سمجھایا کہ

پاکستان کو سمجھو لوگو

پاکستان خدا کا ہے

اس پر آنکھ جو اٹھی ہے

خود برسوں تک روئی ہے

یاں ہر فرد سپاہی ہے

اور جانباز بلا کا ہے

پاکستان خدا کا ہے

سقوط مشرقی پاکستان کے وقت بھارت نے نوے ہزار مسلمانوں کو جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ان قیدیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے عاؔلی کہتے ہیں کہ

خدا کے حکم سے یہ دن گزر ہی جائیں گے

اسیر ہیں جو مجاہد وہ جلد آئیں گے

ہر ایک ظلم کی دنیا میں حد مقرر ہے

ستانے والے کہاں تک ہمیں ستائیں گے

الٰہی تیرے سوا کون دینے والا ہے

تیرے حضور ہی دست طلب بڑھائیں گے

۱۹۷۳ء میں پاکستان میں سیلاب آ گیا جسے قدرتی آفت ہی کہا جا سکتا ہے عاؔلی کا مضطرب دل اس وقت یوں بے چین ہو گیا۔

بہت گھمبیر تھا طوفان

مگر سب جھیل گیا انسان

اٹھو اہلِ وطن حُبِ وطن کی آزمائش ہے

دلوں کی آزمائش جان وتن کی آزمائش ہے

جسے جو کچھ میسر ہے وطن کی راہ میں لائے

یہ تن کی اور من کی اور دھن کی آزمائش ہے

عاؔلی نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ہم نے پاکستان آسانی سے حاصل نہیں کیا بلکہ اس کے حصول کے دوران بھی ہزاروں کٹھن مرحلے آئے مگر ہم نے وہ جھیل لیے

اسی سرزمین کے لیے

ہزار امتحاں دیئے

بہت کٹھن تھے مرحلے

مگر وہ ہم نے طے کیے

اسلامی سربراہی کانوٹس فروری ۱۹۷۴ء میں منعقد ہوئی عاؔلی نے کہا کہ ہم سب مسلمان محمد ﷺ کی امت کے حوالے سے مصطفوی ہیں۔ ہمارا دین اسلام ہے۔ جو مکمل ضابطہء حیات ہے۔ ہم تو ابتداء ہی سے مسلسل جدوجہد کرنے کے عادی ہیں اور تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اور کافر ہمارے دشمن رہے ہیں۔ لیکن ہمارا قرآنی نعرہ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر ہے۔ جب سب مل کر یہ نعرہ لگاتے ہیں تو دشمن بھڑک جاتا ہے۔

ہم تا بہ ابد سعی وتغیر کے ولی، ہیں

ہم مصطفوی مصطفوی مصطفوی ہیں

دین ہمارا دین مکمل

استعمار ہے باطل ارزل

خیر ہے اور کو جدوجہد مسلسل

عنداللہ

عنداللہ

اللہ اکبر

اللہ اکبر

عالی کا ذہن ہر وقت بیدار رہتا ہے اور معاشرے کے سارے ہی موضوعات ان کی گرفت میں ہمہ وقت رہتے ہیں۔ پاک چین دوستی پر قلم اٹھایا تو یوں گویا ہوئے۔

سرخ و سبز رنگ کی محبتیں کرن کرن

پاک و چین دوستی کی نکہتیں چمن چمن

پاک چین کے عوام مرحبا

انقلاب کے پیام مرحبا

پا چین یو پی وان سوئے

پاک چین دوستی زندہ باد

عالی نے کبھی اپنا رشتہ ماضی سے توڑا وہ تمام دن انہیں یاد ہیں جو پاکستان کے حصول کے لیے انہوں نے جدوجہد میں گزارے اور وہ تمام غم جو انہوں نے اس دوران جھیلے، وہ سہاگ اور عصمتیں جو لٹ گئیں، وہ گھر جو اجڑ گئے اور بچھڑے ہوئے عزیز، عالی ایک ایک کو یاد کرتے ہیں۔ وطن بنا کر اور چمن سجا کر چلے جانے والے لوگ عالی کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

وہ تمام دن وہ تمام غم جو گزر گئے

ہمیں یاد ہیں

وہ رہ وفا کے تمام زخم جو بھر گئے

ہمیں یاد ہیں

(۱۴ اگست۔ غنائیہ۔ پرانی نسل)

عالی کی پاکستانیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انتہائی والہانہ انداز میں کہتے ہیں کہ

یہ پاک سرزمین ہے

یہ پاک سرزمین ہے

میں جتنی بار گاؤں یہ بول تازہ تر ہیں

میں جتنی بار سوچوں یہ میرے راہبر ہیں

ہاں مجھ کو یہ یقیں ہے

یہ پاک سرزمیں ہے

عالی کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ (پاک سرزمیں) میں جتنی بار بھی سوچتا ہوں گاتا ہوں۔

انہیں تازہ محسوس کرتا ہوں۔ ان کو ادا کرتے ہوئے میں ایک خاص قسم کی مٹھاس محسوس کرتا ہوں۔ اور ہر بار یہ محسوس کرتا ہوں کہ پہلی مرتبہ گا رہا ہوں حالانکہ آزادی پاکستان سے لے کر اب تک یہ الفاظ لاکھوں بار ادا کیے جا چکے ہیں۔

اس پاک سرزمیں کی آزاد ہیں فضائیں

بے باک ہیں صدائیں

آزادی کا مطلب وہی بہتر سمجھ سکتا ہے، جو کہ قید میں رہا ہو اب چونکہ مسلمانوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کر لی ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے ملک آزاد ہے۔ ہم آزاد ہیں اور یہاں کی فضائیں آزاد ہیں اب اس ملک کی ترقی کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے اسی لیے محنت کشوں سے ان کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں وہ ان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

محنت کشوں سے کہہ دو آگے قدم بڑھائیں

بر آئیں گی دعائیں

ہاں مجھ کو یہ یقیں ہے

یہ پاک سرزمیں ہے

اس پاک سرزمیں نے ہمیں سب کچھ دیا ہے عزت بھی، شہرت بھی، اپنی پہچان بھی اور اپنی سرزمیں ہونے کی جو خوشی ملی ہے وہ انمول ہے لیکن ہم نے اس ملک کے لیے کیا کیا ہے؟ اور ہم نے اسے کیا دیا ہے؟ یہ لمحہ فکریہ ہے۔ ہم نے اس ملک کو بہت کم دیا ہے اور بہت کم اس کی ترقی و بھلائی کے لیے کام کیا ہے۔

اس پاک سرزمیں نے سب کچھ مجھے دیا ہے

اور کم سے کم لیا ہے

اللہ کے نام پر یہ پہلا وطن بنا ہے

اک معجزہ ہوا ہے

ہاں مجھ کو یہ یقیں ہے

یہ پاک سرزمیں ہے

عالی کے الفاظ مترنم ہیں کہ ایک گھنگھرو کی آواز جو تن بدن میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ اور جب گھنگھرو کی لڑیاں ایک ساتھ ملتی ہیں ان کی آواز دل و دماغ کے دروازے کھول دیتی ہیں۔ اور ایک دھن پیدا کر دیتی ہے مگر

جب الگ الگ دھن ٹکرائے

تو سر بے سر ہو جاتے ہیں

کھو جاتے ہیں

وہ کہتے ہیں جب مختلف آوازیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو سر بکھر جاتے ہیں اور کھو جاتے ہیں۔

جب سب آوازیں مل جائیں
سب سُن سُن کر لہراتے ہیں
اور گاتے ہیں

لیکن جب یہ آوازیں ایک ہی سر میں مل جائیں تو یہ مدہوش کر دیتی ہیں لوگ لہراتے ہیں گیت گاتے ہیں۔

ایک گیت میں کتنے بھید بھرے
اور عجب عجب افسانے ہیں

گھنگھرو کی آواز میں پیار کی کہانی ہے۔ یہ گھنگھرو پیار و محبت کے گیت الاپتے ہیں۔ یہ پیار علم و محبت قومی یکجہتی کے لیے ضروری ہے۔

اس گھنگھرو پیار کہانی میں
جو مطلب ہے سب جانے ہیں
پہچانے ہیں۔

یہ دیکھو

اور سن لو یہ گھنگھرو پیار کہانی ہے — چھن چھنن چھنن، چھن چھنن چھنن
یہ سنگت دیس دوانی ہے — چھن چھنن چھنن، چھن چھنن چھنن

پاکستانی بچے کی طرف سے عالی کہتے ہیں کہ ہم پاکستانی بچے (جنہیں اقبال نے شاہین بچے کہا تھا) سچے ہیں کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے ہم ہر کام کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ہم بہت ہوشیار، بیدار، عقلمند اور ہر وقت چاق و چوبند رہتے ہیں اور ہر وقت دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

ہم سچے پاکستانی ہیں ہم ہر دم ہیں تیار
ہوشیار ہیں بیدار ہیں تیار ہیں تیار

ہم آج کے وہ بچے ہیں جن سے ملک کا مستقبل وابستہ ہے اور ہم امید کی کرنیں ہیں۔ ہم انسان دوستی کا پیغام ہیں۔ ہمیں ہر روز ایک اچھا کام کرنا ہے۔ ہم دنیا کے معمار ہیں اور لمحوں کی رفتار کے ساتھ چلیں گے اور دنیا کو بتا دیں گے کہ ہماری نظریں چاروں طرف دوڑتی ہیں کسی بھی خطرے کے وقت ہم سیسہ پلائی دیوار بن سکتے ہیں۔ اور پاکستان پر اپنی جان قربان کر دیں گے۔

ہم روشنیاں ہم امیدیں مستقبل کے پیغام
سب انسانوں سے دوستیاں ہر روز اک اچھا کام

ہم دنیا کے معمار ہیں اور لمحوں کی رفتار

ہشیار ہیں بیدار ہیں تیار

پاکستان میں سینکڑوں پھولوں کے تختے ہیں لیکن صحن چمن ایک ہی ہے جہاں ہم سب مل جل کر رہتے ہیں اس چمن میں مختلف قسم کی خوشبوئیں بسی ہوتی ہیں لیکن ہمیں ایک ہی احساس ہے کہ یہ پاک سرز میں کی خوشبو ہے۔ہم ایک خدا اور ایک نبی ﷺ کو ماننے والے ہیں ہم مسلمان ایک قوم ہیں ۔ یہ ایک ایسی اکائی ہے جسے کوئی نہیں توڑ سکتا ہم شان و شوکت کا ایک قلعہ ہیں ۔

سو تختہ گل اک صحنِ چمن سو خوشبو اک احساس

بس ایک خدا اور ایک نبی کا نام ہمارے پاس

اک ملت ہیں اک وحدت ہیں اک عظمت کی دیوار

ہشیار ہیں بیدار ہیں تیار ہیں تیار

کیسی ہی پر خطر صورت حال ہو۔ یا دشمن حملہ آور ہو ہمیں خدا پر بھروسہ ہے ہمارا ایمان پکا ہے اگر پاکستان کو ضرورت پڑی تو ہم اپنا سب کچھ قربان کردیں گے۔ ہم باکردار، باہوش اور ہر دم تیار سچے پاکستانی ہیں۔

سب خطروں میں سب حملوں میں مضبوط اپنا ایمان

ہم اپنا سب کچھ دے دیں گے جب مانگے پاکستان

کردار میں ایمان ہے ایمان میں کردار

ہشیار ہیں بیدار ہیں تیار ہیں تیار

عالی نے جی۔ ایچ۔ کیو میوزک کمیٹی کے لیے بے معاوضہ کئی نغمات لکھے۔ جو بحریہ اور فوج کی چند کمیٹیوں میں منظور ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں عالی کا بیان خاصا دلچسپ ہے کہ " کوئی بھی جی۔ ایچ۔ کیو (میوزک اسکول) سے پوچھ سکتا ہے کہ میں نے خاصی محنت شاقہ کی مگر اپنے کام کا کسی بھی شکل میں کوئی معاوضہ نہیں لیا جبکہ معاوضہ پیش ہوتا رہا ہے میں کوئی امیر آدمی نہیں رہا۔ لیکن اس کام کو پیشہ ورانہ نوعیت سے ارفع جان کر کیا ہے۔ نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔" (۱)

عالی کا یہ خلوص اور محنت شاقہ ان کے نغموں سے جھلکتا ہے۔

مثلاً "پاکستانی بحریہ کا مارچ پاسٹ"

بحریہ۔ بحریہ۔ بحریہ۔ پاکستانی بحریہ

کتنی تنہائیاں

کتنی تنہائیاں

کس قدر بے کراں مرحلے

اس وطن کے لیے اس وطن کے لیے اس وطن کے لیے

طے کیے۔

بجریہ۔ بجریہ۔ بجریہ

عالی کے قومی نغمات کا کسی اور شاعر کے نغمات سے موازنہ و مقابلہ اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی دوسرے شاعر نے نہ تو وہ دکھ جھیلا کہ جو پاکستان کی تشکیل کے سلسلے میں عالی نے جھیلا، اور نہ ہی دوسرا کوئی شاعر پاکستان کی محبت اور اس وطن کی خدمت میں اتنا شرابور نظر آتا ہے جیسا کہ عالی ہیں۔ ملی نغمہ نگاری دراصل صرف لفظوں کا اجتماع نہیں بلکہ یہ تو زندہ، متحرک، پرسوز، حرارت سے لبریز، اور زندگی کی تابناک صداقتوں سے دمکتے ہوئے الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے اور اس کیفیت سے وہی گزر سکتا ہے کہ جس کے لبوں پر کبھی شانِ جلالت میں عند اللہ۔ عند اللہ جاری ہو اور کبھی دھیمے لہجے میں جیوے پاکستان کی صدائیں ہوں۔

انسان

جمیل الدین عالی نے نظم کی عام ہیئت سے نکل کر اور عمومی موضوعات سے بلند ہو کر اردو میں ایک طویل نظم کی بناء ڈالی۔ گو کہ اردو شاعری کی طویل تاریخ میں مثنویوں کی صورت و ہیئت میں طول طویل منظومات کا خاصہ حصہ ملتا ہے لیکن چونکہ ان کے موضوعات کی بنیاد عام، پامال اور فرسودہ عشق و عاشقی کے قصوں پر ہوتی تھی اور اس کے تسلسل نے مثنویوں سے ہر قسم کی جاذبیت اور دلکشی ختم کر دی تھی، لہذا اب نئے دور میں طویل نظم اس عہد کے فنکار سے کچھ اور طلب کر رہی تھی۔ اسی کچھ اور طلب اور اس کے تقاضوں کی تفہیم کو ہم انسان کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ یہ ایسی تجرباتی نظم ہے کہ جس میں انسانی جذبوں، معاشرتی رویّوں، فکری معاملات، حقائق کے ادراک کی مختلف جہتیں، کائنات کی تخلیق، ماورائے کائنات کا تصور، انسان کا چاند تک سفر، جینیاتی عمل اور اس کے نتائج وغیرہ متعدد امور کو اس طرح موضوع فکر بنایا گیا ہے کہ جس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی ہے۔

اس طویل نظم کا آغاز ۱۹۴۸ء کے گرد وپیش ہوا، انسان کی پہلی قسط باب اوّل کے طور پر "نیا دور" کراچی میں شائع ہوئی جو کہ تقریباً ۳۳۰ مصرعوں پر مشتمل تھی۔ بعد ازاں پہلے چار ابواب اے مرے دشتِ سخن میں شائع ہوئے۔ دوسرا باب ۳۴۰ مصرعوں پر مشتمل ہے اور یہ علیحدہ سے افکار کراچی کی مئی ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شامل کیا گیا۔ تیسرا باب ۱۶۳ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ چوتھا باب ۳۴۰ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پانچواں باب ۶۸۲ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ چھٹا باب ۳۷۱ مصرعوں پر مشتمل ہے اور معاصر لاہور کے جون تا جنوری ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے ساتواں باب ۲۹۵ مصرعوں پر مشتمل ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ آٹھواں باب ۳۴۲ مصرعوں پر مشتمل ہے اور تخلیقی ادب کراچی کے شمارہ ۴ میں شائع ہو چکا ہے۔ نواں باب ۳۹۵ مصرعوں پر مشتمل ہے اور افکار کراچی کے اگست ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔
دسواں باب ۳۳۵ مصرعوں پر مشتمل ہے اور مکالمہ، کراچی کے ۲۰۰۳ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

"انسان"

عالؔی کی طویل نظم "انسان" کے عنوان سے "اے مرے دشتِ سخن" میں شامل ہے یہ اپنے قامت، موضوع اور حسن بیاں کے اعتبار سے اردو شاعری میں ایک بے مثال اضافہ ہے۔ یہ نظم اپنی قد آوری اور عظمت فن کے لحاظ سے چونکا دینے والی نظم ہے اور چار ابواب کی صورت میں ایک سوتیں صفحات پر مشتمل ہے جو ابھی مکمل نہیں ہے بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "طویل نظم "انسان" بھی شعر عالؔی کی نئی جہت کا حصہ ہے۔۔۔ "اے مرے دشتِ سخن" میں "انسان" کے چار حصے شامل ہیں جو تقریباً سوا سو صفحوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں تین مسلسل ابواب ہیں اور چوتھا حصہ جس کا عنوان "حسد" ہے اس کی ترتیب ہنوز طے نہیں ہے۔ عالؔی اس نظم کو ایک مدت سے لکھ رہے ہیں اور اس کے اجزا وقتاً فوقتاً رسائل و جرائد میں شائع ہو کر توقعات پیدا کرتے رہے ہیں"۔ (۲)

دراصل اس طویل نظم میں عالؔی نے منظر ناموں، کرداروں کی حرکات و سکنات، حلیے اور ڈرامائی متعلقات کو قاری کی تفہیم اور تصور پر چھوڑ دیا ہے۔ اس نظمیہ میں جمالی اور سیما دو بنیادی کردار ہیں، جمالی جسمانی طور پر اور سیما روحانی یا تصوراتی طور پر، کیونکہ اس کی یادیں بار بار لوٹ کر آتی ہیں۔ کئی مقامات پر سیما کی آواز مکالمے کو آگے بڑھاتی ہے۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے نسوانی اور مرد کردار بھی ہیں جو مباحث اٹھاتے اور سوال و جواب کرتے ہیں۔ اسرار اور چند نوجوان احتجاجی صدائیں ہیں اور کئی آوازیں اور ہیولے بھی ہیں جو بار بار ابھرتے ہیں اور ڈرامائی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔

"انسان" کا شمار عالؔی کی ان اہم نظموں میں ہوتا ہے جن کا موضوع بظاہر عاشقانہ ہے لیکن اس طویل نظم میں جو دوسرے موضوعات لائے گئے ہیں ان کے پیشِ نظر اس نظم کی معنویت تبدیل ہو جاتی ہے۔

بقول ڈاکٹر حنیف فوق "یہ ایک ڈرامائی نظم ہے جس میں جمالی، اسرار، کئی ہیولے، آواز، ایک نسوانی آواز، چند نوجوان، حسینہ معینہ اور خود سیما یا سیما کی خیالی/روحانی تجسیم اپنے اپنے حصے کے ذہنی رویوں کو پیش کرتے ہیں۔" (۳)

عالؔی نے اس طویل نظم میں اپنے وسیع مطالعے اور مشاہدات کے ساتھ انسان کے ارتقاء پر شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ ایک سوالیہ نظر ڈالی ہے "انسان" عالؔی کی ذاتی زندگی کے کرب کی داستان ہے۔ جسے "غیر ذاتی" رنگ دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بڑے خوبصورت الفاظ میں اس طویل نظم کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے کہتے ہیں کہ "روز آفرینش سے لے کر آج تک کے انسان کی داستان۔ فتح و شکست کو اس انداز سے قلم بند کر دیا ہے کہ اس کا قاری انسان ہونے کے ناطے خود کو اس سے مانوس پاتا ہے۔ اس کی زندگی کے بلند و پست اور خوب و ناخوب پہلوؤں کو اپنی ہی زندگی کا جزو خیال کرنے لگتا ہے اور اس کی احسن و اسفل صورتوں کو اپنے اعمال خیر و شر کا آئینہ جان کر اس میں اپنا چہرہ بھی دیکھنے لگتا ہے۔" (۴)

دوسرے الفاظ میں ہم اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک انسان جب عالؔی کی زبان سے انسان کی کہانی سنتا ہے تو وہ

اسے اپنی ہی کہانی سمجھ کر کبھی خوش ہوتا ہے اور کبھی افسردہ ہو جاتا ہے۔ اور " کبھی اس کے اندر غم وغصہ کروٹ لیتے ہیں کبھی ملائمت پہلو بدلتی ہے۔ کبھی محبت کی آگ بھڑکتی ہے کبھی محبت کی شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کبھی رشک کبھی حسد، کبھی بدی، کبھی نیکی، کبھی عداوت، کبھی رافت، کبھی اطاعت، کبھی بغاوت، کبھی سرکشی، کبھی خود سپردگی، کبھی رعونت، کبھی فروتنی، کبھی جبر، کبھی اختیار غرض کہ طرح طرح کی نفسی کیفیات سے انسان دوچار ہوتا ہے اور کچھ ایسی پہنچ سے دوچار ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس امر کا اقرار کر لیتا ہے کہ "اے مرے وحشتِ سخن" میں جو کہانی سنائی گئی ہے وہ کسی خاص فرد یا صرف عالی کی کہانی نہیں، بلکہ دنیا کے سارے دردمند اور سوچتے ہوئے دل و دماغ رکھنے والوں کی کہانی ہے اور یہ کہانی اس انداز سے سنائی گئی ہے کہ جو سنتا ہے اس کی داستان معلوم ہوتی ہے۔" (۵)

یوں "انسان" اولادِ آدم کے عذابوں، ثوابوں، خوابوں، امنگوں، حوصلوں، خیالوں اور خلا کے رازوں کی داستان ہے۔ جیسا کہ پہلے باب کے آغاز میں جمالی کہتا ہے۔

کوئی مری داستان لکھے
کوئی مری داستان لکھے
جو میری مانند اور لاکھوں شکست کھائے ہوؤں کی تاریخ بھی رہے گی
جنھوں نے کس کس عذاب کو اک بہت امید کی خوشی میں دبا رکھا تھا
جو ان کو سورج کی اک کرن کی طرح بھی شاداب کر نہ پائی۔

عالی کی حس مزاح اور خودشکنی کا رنگ بھی بہت نمایاں ہے۔

میں کیسی الجھن میں مبتلا ہوں
مجھے یہ کیسی روایتوں اور شکایتوں کے سپنولے اندر سے ڈس گئے ہیں
یہ میری کم مائیگی کے قریوں میں کن بزرگوں کے لاؤلشکر
مجھے ڈرانے کو بس گئے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی عالی کی بلند حوصلگی بھی قابلِ داد ہے وہ ایک ایسا بیان چاہتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہو۔

تری کراہیں تو اب کوئی ایسا دوست انسان مانگتی ہیں
جو تجھ سے پوچھے بغیر بس تجھ کو دیکھ کر تیرے درد تیری جلن کو سمجھے لگن کو سمجھے
اور اس طرح اک بیان لکھے
کہ جیسی ساری زمیں کے مظلوم یاسیوں کا فسانہ خود آسمان لکھے۔
کوئی مری داستان لکھے۔

عالی کے ہاں مظاہر جدید اور سائنس کی لائی ہوئی تجدیدیت کے باوجود روایت بھی موجود ہے اس نظم میں مسلم

روایات کے حوالے بھی ملتے ہیں۔

جمالی کا مسئلہ سیما کی موت کا مسئلہ ہے کہ گلابوں کو رشک آنے والا تازہ دم وجود ہزاروں صدیوں کی منجمد کالی مٹی میں دب گیا ہے کہ۔

ارے، وہ اک جسم تھا وہ اک جیتی جاگتی گفتگو ملی تھی
ارے وہ کیا وقت تھا کہ جب مجھ کو تو ملی تھی
سو آج اس کا بھی حشر یہ ہے!
وہ تازہ گرم جسم جس پر جواں گلابوں کو رشک آئے
ہزاروں صدیوں کی منجمد کالی کالی مٹی میں دب گیا ہے
وہ شوخ، معصوم، روح جس کی لطافتوں کا بیاں
ہومر سے دانتے اور شکسپیئر سے
ہمارے سعدی سے اور حافظ سے
اور غالب سے اور اقبال تک۔۔۔ نہ ہو سکے گا۔

اس نظم میں کون ومکاں اور تسخیر طبعیات کی نئی دریافتوں کی طرف شاعرانہ اشارے بھی ملتے ہیں جن کا موثر ترین حصہ پہلے باب کے اختتام میں پایا جاتا ہے جب جمالی کہتا ہے کہ

چلو بھی اب تم ہی اٹھو سیما
مری توانائی طلب سے تمام پردوں کو چاک کردو
یہ پتھروں کی سلیں مری آتش تمنا سے خاک کردو
نہیں تو مجھ کو قسم ہے اپنے تمام راتوں کے درد تنہا میں شدتوں کی تمام دنیا کے مردوزن میں تڑپ سے بھر پور خواہشوں اور بغیر خواہش پرستشوں میں صداقتوں کی
ازل سے اب تک ہر اہل دل کی ہزار صنواں محبتوں کی
کہ میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا
اور ایک دن بس اسی جگہ میں تمھارے پہلو میں آ بسوں گا
ہوا اگر اس کے بعد کوئی نیا دھماکہ
تو وہ ہمارے لیے ہو جشن ابد اور اک ساتھ ہی چلیں ہم
زمین، شمس وقمر، سرائم
کوئی سمجھتا ہو ان کو تخلیق کوئی کہتا ہو ان کو دائم

یہ میرے جوشِ غضب کے آگے نہ رک سکیں گے

جو میرے مٹنے کے بعد بھی پھیلتا رہے گا

سبھی کے ٹکراؤ سامنے ہیں میں سن رہا ہوں سبھی کے ماتم

مرے تمھارے لیے، یہ تابودیت نہ ہوگی ذرا بھی مبہم

ہمیں نہ ہوگا جدائی کا آج کی طرح غم

مرے خیالوں کی قوتوں سے ضرور ابھریں گے بن کے ہم پیکرِ مجسم ہمیں تو وہ دوسرا دھما کہ عطا کرے گا

ہمارے سراور سنگتوں کا اک ایسا شدھ اور ایک ایسا کامل

عجیب عالم

جو آج ان کہکشاؤں کے رقص میں بھی بے بھاؤ اور مدھم چھپا ہوا ہے

دوسرے باب میں عالی نے جو بحثیں اٹھائی ہیں وہ حسنِ معنی اور لطفِ کلام میں اپنی مثال ہیں۔

کچھ شعر و ادب کے اہلِ فن ہیں

جو اپنی ہواؤں میں مگن پائیں

سائنس، معیشت اور سیاست

اکثر کے لیے ہیں خارجیت

کہتے ہیں جو رچ نہ جائے خوں میں

کیسے ٹپکے گا آنسوؤں میں

جب تک نہ ہوں فیض یاب ان سے

کیا جانیں گے پیچ و تاب ان کے

انسان اگر دیوتا نہیں ہیں

مضمون جدا جدا نہیں ہیں

چل اتنی بہت سی کائناتیں

کیا ان میں بس اک کرے کی باتیں

دوسرے باب کی جان وہ مکالمہ ہے جو نسوانیت پر حسینہ اور معینہ میں قائم ہوا ہے۔ حسینہ اپنا دکھ بیان کرتی ہے اور معینہ اس کی ہمت بندھاتی ہے یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ مفاہیم جب موج در موج آتے ہیں تو عالی مثنوی کا قالب اپنا لیتے ہیں اور مست و بے خود ہو کر دادِ سخن دیتے ہیں۔

حسینہ۔ ساون آیا نہ مینہ برستا ہے

آپ ہی آپ جی ترستا ہے،
زندگی اتنی دل خراش ہوئی
غیر مردوں میں بودوباش ہوئی

معینہ۔ تم اور اس انتشار میں پھنس جاؤ
دوصدی کی زبان بھی دہراؤ
حسینہ۔ کیا بدل دوں اپنے احساسات
کیا تراشوں کوئی جذبات
تم نے کس حق سے کہہ دی ہے یہ بات

معینہ۔ ہائیں کیا میں کوئی پرائی ہوں
میں تمھاری مدد کو آئی ہوں
کچھ خبر کچھ خیال لائی ہوں
ابھی والد تو دوسرے گھر ہیں،
والدہ جانماز ہی پر ہیں
وہ دوائیں وہ چھوڑ چکیں ساری
شام سے رو رہی ہیں بے چاری
اس سے پہلے کہ ہو کوئی ننٹا
گھر چلو میں کہوں گی یک نک تھا
مثنوی تو نہیں سنائی ہے
بات ایک مختصر بتائی ہے

"انسان" کا ایک رخ عورت بھی ہے اسی لیے عالؔی نے تحریک نسوانیت کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہتے ہیں کہ "دوسرے باب میں تحریک نسواں کی طرف بھی بعض بلیغ اشارے ہیں جن سے عالؔی کا ترقی پسندانہ رویہ جھلکتا ہے۔"(۶)

فرقِ طبقات ہی نہیں ہے غضب
شاونیت کا ارتقا ہے عجب
کیا لقب کیا حسین چابک ہے
صنفِ نسواں تو صنفِ نازک ہے
کی مقرر رز راہ سرشوری
جسم کی وضع خاص کمزوری
جبکہ اس میں حمل کی طاقت ہے
بارہا زچگی کی قوت ہے

نسائیت کی ایک مغربی مثل بیان کرتے ہیں کہ۔

کم نہ تحقیر میں تھا مشرق بھی
اک مثل مغربی بھی خوب چلی
"شاخ اخروٹ عورتیں کہیے
جتنا پیٹا نہیں وہ ٹھیک رہے"

عالی نے مغرب کی نسائی تحریک کی مغربی خواتین رہنماؤں کا نام لیا ہے۔لیکن جمیلہ بو یا تری، بیگم سن بات سن، مادام فاوَ، عصمت چغتائی، ادا جعفری اور مادرِ ملت کو نہیں بھولے ہیں۔

ایک مسز پنکھر سٹ پائی ہے
ایک سیموں دی بوار آئی ہے
ایک جمیلہ بو پا بڑی گزری
ایک سن پاٹ سن کی بیگم تھی
واں مدر ٹریسا مگر نا کام
ہاں ہیں مادام فاو پر گم نام
اپنے ہاں ایک عصمت چغتائی
ان کے ہاں امرتا پریتم لائی
کچھ ادا جعفری کی سعی بیاں
مادرِ ملت ایک روحِ زماں

جن سے ڈرتا تھا لشکر مرداں
ایک گرز گراں ہی بن کے رہیں
پھر بھی افواج ظالماں ہیں وہیں
ایک صف بھی نہیں بنی ہے ابھی
جنگ کرنی بہت بڑی ہے ابھی

معینہ تحریک آزادی نسواں کی ترجمان بن کر کہتی ہے کہ

ہم کچن، کھیتوں، کتابوں سے
مل کے نکلیں نہ کیوں عذابوں سے
اب اور آئندہ جو زمانے ہیں
ان میں کچھ انقلاب لانے ہیں
ذات میں بھی تصورات میں بھی
ہم سے منسوب کلیات میں بھی
اور یہ عشق وشق کے ہفوات
یہ جو ہے ایک ادارہ جذبات
کچھ کثافت یہاں بھی دھونی ہے
ان کی تطہیر بھی تو ہونی ہے
یہ کلاسیک، یہ گراں تودے
ان کو چیرو تو ہیں بڑے بودے
دوست ایک جہد مشترک کے بغیر
دہر میں ہوگی اس چمن کی سیر
جس کے پھولوں پہ حق ہمارا بھی
اور جسے غاصبوں نے مارا بھی
کیوں رہے یہ چمن مراعاتی
رنگ و بو اس کے ہیں مساواتی
نعرہ یہ ہے رعایتیں مت دو

آگے حسینہ کہتی ہے کہ

آؤ کچھ مجھ سے بھی بگفت وشنید
سیدھی سادی سی ایک حقیقت ہے
مجھ کو اک شخص سے محبت ہے
وہ کسی اور کا اسیر ہوا
چھوٹنا مجھ سے ناگزیر ہوا
پھر بھی ہر وقت اس کی یاد آئے
اور ہر نفس میں بس جائے
میں کہ خود ایک حسین لڑکی ہوں
پڑھتی لکھتی ہوں اور سوچتی ہوں
ایک جاگیر کی سنتانی بھی
یعنی معروف خاندانی بھی
کیسے کھودوں جو اس کو پا نہ سکوں
کیا کروں گر اسے بھلا نہ سکوں
ایسی باتوں کی کیا زباں ہوگی
کیا کچھ آرائش بیاں ہوگی
سیکس کی شرح و داستاں ہوگی
یا کوئی اور این و آں ہوگی

اس کے بعد اسرار اور چند نوجوان آتے ہیں۔ جمالی اور اسرار ایک دوسرے کی ضد ہیں جمالی اسرار کو ذلیل، سیاہ باطن، مکروہ شکل والا کہتا ہے اور اسرار جمالی کو

اسرار۔ عجب بے وقوف آدمی ہے جمالی
کہ بس اتنی سی لونڈیا کے لیے مول لی اپنی بھی پائمالی

عالیؔ کی اس نظم میں انسان کے تصورات و اعمال کو بعض زاویوں سے مضحک زدہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اسرار اگر طنز و تضحیک کو راہ دیتا ہے تو جمالی جذباتی اور ذہنی غم و اضطراب کی ترجمانی کرتا ہے۔

آفرینش کائنات اور ثوابت و سیار کے لامختتم اسرار، انسانی فطرت، آگہی، خالق کون و مکاں، مذاہب عالم کی روایتیں، فلسفوں کے سلسلے، تاریخ، تشکیل اور جیسوں دوسرے مسائل کا ذکر عالیؔ نے تیسرے باب میں کیا ہے۔

عاؔلی نے جمالی اور ہیولوں کے روپ میں، زندگی، انسان، کائنات اور فرد و معاشرہ کے آغاز و ارتقاء اور عروج و زوال پر گفتگو کی ہے۔ خالق و مخلوق کے باہمی رشتوں، فکر انسانی کی رسائی اور نارسائی، جدید علم و فکر کی مدد سے انسانی ذہن کی فتوحات پر ایک دو نہیں بلکہ درجنوں سوالات اٹھائے گئے ہیں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس سلسلے میں رقم طراز ہیں

"عاؔلی کے اٹھائے گئے سوالات اور ان کے جواب کی تلاش کا سلسلہ نیا نہیں بہت پرانا ہے۔ ہر دور، ہر زمانے ہر انسان معاشرے میں یہ سوالات زیر بحث رہے ہیں اور ان کے اپنے بالغ ترین و بہترین ذہنوں نے ان سوالوں کے تحت موضوع گفتگو بننے والے مسائل کے حل میں زور مارا ہے۔ سوالات و مسائل ایسے پیچیدہ و مشکل ہیں کہ غیر معمولی دل و دماغ کے مالک اور جدید و قدیم علم و فکر سے پوری طرح بہرہ مند اشخاص کے سوا کسی دوسرے کے لیے جوابات کی تلاش تو دور کی بات ہے سوال کرنا بھی آسان نہیں ہے، اس لیے کہ سوالات خواہ کسی قسم کے ہوں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا ذہن موضوع زیر بحث سے خاطر خواہ آگہی کے ساتھ حصول جواب کے لیے ہمہ وقت مضطرب بھی رہتا ہو اور جس کے پاس کسی نہ کسی شکل میں سوالات کے جوابات بھی موجود ہوں۔" (۷)

عاؔلی ایک ایسے ہی مضطرب ذہن کے مالک ہیں لہذا وہ انسان و حیات اور کائنات ان کی تخلیق و غایت کے بارے میں صرف سوالات ہی نہیں اٹھاتے بلکہ کبھی خود کو ضمیر متکلم، کبھی ضمیر مخاطب اور کبھی ضمیر غائب کی صورت میں رکھ کر بحث و استدلال کے ذریعے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عاؔلی نے انسان کی تنہائی کے احساس اور احساس تنہائی کے شدید کرب کو جمالی کے ذریعے کہلوایا ہے۔

جمالی۔ کوئی نہیں کہ ہو اس دشت میں مرا دم ساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے اپنی ہی آواز

لیکن انسان اپنی کوشش سے کوئی یادگار کارنامہ چھوڑ جانے کا شوق رکھتا ہے
ہیولی کہتا ہے۔

تو کاروبار شراکت میں رکھ لے سوز و گداز
ہر ایک فرد کی فرہنگ غم میں سود و زیاں کے الگ الگ انداز
ہر ایک لفظ میں لاکھوں فسانہائے دراز
بطور خاص یہ حرف اساس یاد رہے
جو اپنی اپنی صلیبوں کو خود ہی لے کر پہنچ جائیں قتل گاہوں تک
انہی میں سے کوئی پاتا ہے وہ لب اعجاز
جو اس کی ذات سے اس کا مکالمہ بھی کرائے
جو بے شمار دکھی مرد و زن کے درد بٹائے

اور اپنے گرد سے یا اپنے بعد جس کو چنے یا جو اس سے فیض اٹھائے
وہ عہد عہد میں اس کا ہی ترجمان کرامت بیاں بھی کہلائے
اور ایک روز کوئی مکتب حیات بھی منسوب اس سے ہو جائے

جمالؔ ۔

مری طلب کی تو بنیاد میں وہ شعلے ہیں
جو ساز گار ہواؤں سے پرورش پا کر
سواد کون و مکاں میں وہ روشنی پھیلائیں
کہ سارے چاہنے والے جدائیوں کے سمندر عبور کر آئیں
سنا ہے ویسے ہی شعلوں کی آنچ سے بھی ابھرتے رہے ہیں پیغمبر

غم اور خوشی کی حقیقت، ان کے بدلتے ہوئے روپ فرد بہ فرد اور طبقہ بہ طبقہ بدلتے ہوئے ان کے مضامیم، مضامیم بامعنی اور بے معنی اسباب و جواز، تشریحات، ترجیحات اور نظریات کی معنویت بھی جگہ جگہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ ایک ہیولی کہتا ہے کہ

گل و گلاب گر یہاں بھی ہیں مگر کم کم
زیادہ تر تو وہی خار خار دامن ہیں،
تو پھر شکوک کی دنیا بسائے جا پیارے
نہ کوئی حق ہو نہ باطل نہ کوئی خیر و شر
روایتوں سے
اصولوں سے
کلیوں سے
مگر
تمام کشمکش فکر و گفتگو سے حذر
وہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔
شعلہ خورشید آرزوئے حقیقت وہ اک طویل سا نام
شروع و ختم میں جس کے ہزار ہا ابہام
اگر وہ بھڑکے تو اس کو بھی جان رقص شرر
دل و نگاہ کو رکھ وسوسوں کی راہ گزر

اسی میں خجلت عصیاں کے سینکڑوں تریاق
اسی میں سارے حسابات خود بہ خود بے باق
نہ اس میں زیست المیہ، طربیہ اور، نہ فراق

اس کے بعد جمالی کا مکالمہ ہے۔ اور پھر دوسرے ہیولے کا نہایت فکرانگیز بیان ہے کہ

یہ پودنے کہ جو بنتے ہیں عزم و جہد و کمال
نہ جانے کس لیے دیو فنا سے لڑتے ہیں
شکست ہوتی چلی آئی ہے ازل سے انہیں
مگر یہ اور ابھرتے ہیں اور اکڑتے ہیں
کوئی انہیں کوئی سمجھائے
اصلیت بتلائے
تو کلیت اسے کہتے ہیں اور بگڑتے ہیں
یہ سب پٹی ہوئی مشقیں نہیں ان کو کیا کیجیے
بس ایسی نام نہاد آزمائشوں سے
نہیں
معرکوں سے
جو بھی وہ ہیں لطف لے لیا کیجیے
پڑے ہی رہے کوئی دھوپ کوئی سایا ہو
کوئی بھی آیا ہو یا کوئی بھی نہ آیا ہو
رچا ہوا ہے جب انساں میں شیطنت کا خمیر
جب آج تک بھی نہیں طے کہ چیز کیا ہے ضمیر
ضمیر یعنی وہ بے شرط مصلحت کوئی اندر کی رہنما تاثیر
رہی نہ ہو جو کسی جبر و تربیت کی اسیر
کوئی بتائے حقیقت اور اس کے ساتھ ضرورت ہی ضمیر کی کیا ہے
خوشی کے جتنے ہیں مفہوم ہر نظر میں الگ بلکہ مختلف، متضاد

ہر ایک دور میں بدلی ہوئی بدلتی ہوئی قدر نیک و بد کی نہاد
تغیرات کے سیلاب سے رہے برباد
وہی جو بانگ فتوحات ہے وہی فریاد
کبھی غلام کہے خود کو اور کبھی آزاد
کبھی بنائے مصائب کبھی کمال ایجاد
تو اور لوگوں کی
اور اپنی بھی
خوشی کیا ہے۔

سائنس نے آگہی کو فروغ دیا ہے اور سماجی علوم کے دروازے کھولے ہیں۔ لیکن آدمی کے انسان بننے کی منزل ابھی نہیں آئی ہے عالی نے آواگون کی قدیم عقیدے اور ری سائیکلنگ کے جدید طریقے کا ایک ساتھ ذکر کر کے ماضی و حال کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ ہیولی کہتا ہے کہ

اگر یقیں ہو ری سائیکلنگ، پر تم کو
کوئی مصر ہو تو آواگون اسے کہہ دو
تو یوں سمجھ لو کہ تم بھی کچھ اور بن کر آئے
اور اپنے کرموں کے جو پھل نصیب میں تھے وہ کھائے
اور اس کے بعد وہی مرگ بعد مرگ آ جائے

دراصل جمالی کے سامنے سیما کی موت کا مسئلہ ہے اور ہیولے اس سے استفسار کرتے ہیں کہ

ایک ۔ کبھی کسی نے جو ویدوں میں ہے بتایا ہے
کبھی کسی نے مجھے رقص شو دکھایا ہے
کبھی کسی نے جو گیتا کہے سکھایا ہے

جمالی ۔ نہیں ابھی تو نہیں

دوسرا۔ کبھی مہاتما بدھ سے بھی دل لگایا ہے

جناب جین کا مسلک سمجھ میں آیا ہے

جمالی ۔ نہیں ابھی تو نہیں

تیسرا۔ کسی نے آتش زردشت میں تپایا ہے

جمالی ۔ نہیں ابھی تو نہیں

چوتھا اور پانچواں ۔ کبھی ہماری اناجیل دیکھ پایا ہے

جمالی ۔ کسی قدر مگر ان کے کئی مقاموں کو

محققین تمھارے ہی مسخ مانتے ہیں

اور ان کے حکم مسلمان فسخ جانتے ہیں

چھٹا ہیولی۔ کبھی کسی نے تجھے لاوزے پڑھایا ہے

کبھی پیا جوخم تاؤ نے پلایا ہے

یہ سب حوالے اپنی جگہ اہم ہیں مگر ان سے اہم یہ نتیجہ ہے کہ انسانی تاریخ کا مستقبل ماضی سے منقطع نہیں ہوتا اور تاریخ کے سفر میں ماضی کے نشانات راہ سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال انسانی علوم اور تہذیبی ترقی کا بھی ہے۔

جو بے الف کے پڑھے میم نون کرتے ہیں

وہ صرف ونحو معانی کا خون کرتے ہیں

میں اتفاق وخشیت کو کیسے پہچانوں

میں ابتداء کے بغیر آج کیا ہوں کیا جانوں

ہر ایک دلیل مقابل دلیل رکھتی ہے

بس ایک قوتِ ایمان کا ذکر سنتے ہیں

جو بعض خاص دلوں میں سما کے ان کے بقول

بڑے سکوں سے انھیں خود کفیل رکھتی ہے

وہ میرے پاس نہیں

کبھی مجھے بھی ملے گی خوش آمدید مگر وہ بے اساس نہیں

اب آئے گی تو بہت ساتھ لے کے ساز وبراق

بڑے ہلاہل ماضی کو چاہیے تریاق

جمالی کا ایک روایتی مکالمہ

مجھے تو اس کی جدائی ہی کھائے جاتی ہے

کوئی بھی ذکر ہو سیما ہی یاد آتی ہے

نہ جانے عمر ہے کتنی طویل اور کب تک

اسی طرح سے شب و روز مجھ سے جنگ کریں

حقیقتیں جو بہت بے حیا ہیں تنگ کریں

سنا یہ ہے کہ جنہیں انتظار مرگ رہے

انہیں سے موت کو اکثر گریز رہتا ہے

اب سیما جو مر چکی ہے مگر وہ جمالی کے سامنے آ جاتی ہے اور ایک روایتی انداز کا مکالمہ ایک روح کی زبان سے۔

ہاں مری جان یاد ہیں تم کو

اپنے وہ فلسفے وہ سب باتیں

جن کو دیں ہم نے کتنی ہی راتیں

اپنے اعلان یاد ہیں تم کو

تم تو کہتے تھے عشق مطلق ہے

عشق بے نفس و بے تمنا ہے

عشق بے قید ہر زماں و مکاں

عشق بس عاشقوں کی روح و رواں

عشق بے گانہ وصال و فراق

عشق ہر قہر و زہر کا تریاق

عشق کچھ ماسوائے عشق نہیں

عشق میں مدعائے عشق نہیں

حسینہ جو جمالی کو قبرستان سے واپس لے جانے آتی ہے کہتی ہے کہ

ہنسی میں تلخی ایام کو چھپائے ہوئے

چلے چلو یونہی بار حیات اٹھائے ہوئے

جمالی کی غم انگیز کیفیت کا اظہار یوں ہوتا ہے۔

ہوئی طلوع نہ وہ صبح جس کی حسرت تھی

ہر ایک رات گزرتی ہے لو لگائے ہوئے

"انسان" کا تیسرے باب میں جس کے بہت سے اقتباس اوپر بیان بھی کیے گئے ہیں جبر و اختیار، تقلید و اجتہاد، عقل و وجدان، فرد و کائنات، خیر و شر اور سزا و جزا کے بہت سے نازک پیچیدہ مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری "امکان اس کا تھا کہ اس بحث میں عالی کسی نہ کسی جگہ پھنس کر رہ جائیں گے لیکن چونکہ وہ ہر مسئلے کے بارے کھلا ہوا خود اعتماد ذہن رکھتے ہیں اور جن مباحث کو موضوع سخن بنایا ہے وہ سب ان کے علم و فکر کی سطح پر ستارے کی طرح روشن ہیں۔" (۸) اور واقعی عالی نے ہر شوار گزار مرحلہ نہایت خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔

زیر بحث نظم "انسان" کا آخری جزو جسے "دشتِ سخن" میں چوتھا حصہ یا چوتھی نظم کہا گیا ہے ابتدائی تین حصوں کے مقابلے میں سادہ بھی ہے اور مختصر بھی، سادہ ان معنوں میں کہ اس کا موضوع اور عنوان "حسد" ہے۔ اور عنوان خود آپ اپنا انکشاف ہے اس حصے کے مصرعوں کی تعداد بھی دوسرے حصوں سے کم ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ "پوری نظم کو بہ اعتبار بہت طویل منظوم ڈرامے کا جزو بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاعر اور شاعر کے ہم زاد کے مابین مکالماتی نظم کا نام بھی دے سکتے ہیں اور ریڈیائی منظوم فیچر سے بھی موسوم کر سکتے ہیں اس لیے کہ پوری نظم میں صرف "حسد" کا موضوع، اپنے جملہ معاشرتی اسباب و علل اور انسان کے طبع و فطری خصائل کے سیاق و سباق میں زیر بحث رہتا ہے۔" (۹) اور اس بحث میں دو کردار بوڑھا اور جمالی حصہ لیتے ہیں۔ دونوں کے بول عالی ہی کے بول ہیں عالی شیخ سعدی کی طرح زندگی کے سماجی مسائل کو زیر بحث لا کر ان کے نفع و نقصان کے پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ "قاری، اصل داستان کو بھول کر صرف داستان اور داستان سنانے والے ضمنی کرداروں کے ساحرانہ مکالموں میں اس طرح کھو جاتا ہے، گویا سعدی کو بھول کر سعدی کی تخلیق کردہ حکایات اور حکایات سنانے والے بادشاہوں، وزیروں، درباریوں، اور مشیروں کو حقیقی کردار سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح کا جادو جمیل الدین عالی نے اپنی نظم "حسد" میں جگایا ہے۔" (۱۰)

اس باب میں بوڑھا اور جمالی "حسد" کے موضوع پر انتہائی فنکارانہ اسلوب اور شاعرانہ سلیقے سے گفتگو کرتے ہیں یہاں تک کہ شاعر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ دونوں میں "حسد" کے حوالے سے اتنی خوبصورت اور عالمانہ بحث ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا اور جمالی دونوں ہی شاعر کا روپ ہیں۔

"حسد" کا موضوع نیا نہیں ہے روز مرہ کی گفتگو سے لے کر نثر اور شاعری دونوں میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے اور جیسا کہ خود عالی کی نظم سے ظاہر ہے۔

ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

بوڑھا۔ حسد سے خبردار رہنا

حسد سے خبردار رہنا

مری جاں

پڑھی ہے کبھی بوستاں اور گلستاں

کہ نکلے ہو پیدل بقولِ ایک ملکِ خدا یعنی لاانتہا

زندگی کے تعاقب میں افتاں وخیزاں

مری جاں

وہ کیا ہے

سہیلی

نہیں پنچ تنترا

یہ نام آرہے ہیں، تو اب کا ہے تھمنا

کلیلہ و دمنہ

حکایات لیپ

ہزاروں ہی قصے

اوران کے دانش فزا ایسے حصے

جو ہم نے سنے اور پڑھے تھے شپا شپ

مری جاں

چلو میں ہی ڈالوں تمھاری جوانی کے توشے میں کچھ ساز و ساماں

بہت سے سبق ہیں

کچھ آسان اور کچھ ادق ہیں

اور ایسے تو لاکھوں ہی سادہ، طویل اور عریض اور مخفی ورق ہیں

جنہیں زندگی خود ہی لکھتی ہے ہر زندگی میں

انہیں دوسروں کے لیے مٹھی بھر کے دینے کا دم تو نہیں تھا کسی میں

مگر کچھ نہ کچھ دے گئے ہیں۔

انسانی آگہی کے تضادات اور انسانی زندگی میں غم انگیز کیفیتوں کو عالی نے بہت سنجیدگی سے بیان کیا ہے لیکن انسان کے سرمایہ واقفیت کے ایک بڑے حصے پر ان کا یہ طنز بھی قابل غور ہے کہتے ہیں کہ

تو بولو کہ میں کچھ بتاؤں

نہیں تو تمھیں سارے دانے تمھارے ہی چڑیا سے پوٹے کی حد میں کھلاؤں
سو ایسی تو خوراک پا ہی رہے ہو
یہ جو ہڑانا کے
یہ تالاب
ناواقفیت سے لبریز لیکن تمھارے تصور میں آب بقا کے
تمھارے لیے حوضِ خاص شہاں ہیں
سو کچھ ڈبکیاں ان میں کھا ہی رہے ہو
وہ جیسے بھی معیار کا ہو مزا وہ اٹھا ہی رہے ہو
بہت سے میاں چمن اپنی پتی ورت، آنکھیں ڈھکے اور چپ چاپ گھروانیوں کو جلیبی، امرتی، ملائی کھلا کر یہ
کہتے رہتے ہیں
مزے ہی مزے ہیں!
مزے ہی مزے ہیں!
جمالی اس اندازِ بیاں پر اعتراض کرتا ہے
حضور آپ کو جو بھی کہنا ہو کہیے،
بس اپنے بیاں میں متانت کو ملحوظ رکھیے
اور اخلاق اسلاف کے دائرے میں بھی رہیے
بوڑھا اس اعتراض پر غصے کا اظہار کرتا ہے کہ
ابے کیا میں اہلِ زباں ہوں
فصیح البیاں ہوں
کسی داغ کا جانشیں ہوں
کسی باغ استاد میں تیرا نائب! میں ہوں
ابے کیا میں تیرے اتالیق کی نوکری پر تیرے گھر کے شاگرد پیشہ علاقے کا مسکیں مکیں ہوں!
جمالی اپنے اعتراض پر معذرت طلب کرتا ہے۔
خطاوار ہوں، معذرت، بس حضور آپ جو بھی کہیں وہ مری ہی مدد ہے۔ سورہ فلق کی آخری آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "میں پناہ مانگتا ہوں حاسد سے جب کہ وہ حسد کر رہا ہو۔" تفسیر قرآنی میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ جب حاسد اپنی قلبی کیفیت کو ضبط نہ کر سکے اور عملی طور پر حسد کرنے لگے یعنی دوسروں کو ملی ہوئی نعمت الٰہی سے سرفرازی کے زوال و تباہی کی

آرزو کرنے لگے تو اس کے شر سے پناہ مانگنا چاہیے۔اس لیے کہ اس نوع کا حسد کسی شخص کی عظمت و نعمت کو حقیقتاً کوئی نقصان پہنچا سکے یا نہ پہنچا سکے لیکن ذہنی تکدر اور پریشانی کا سبب ضرور بن جاتا ہے۔

یہ بابِ حسد ہے
حسد یعنی اک زندہ ناسور جواز وحوشِ ازل تا ابد ہے

عالیؔ کی نظم "حسد" سے ایک اور بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان کی نظم محض تخیلاتی نظم نہیں ہے یعنی اس کا انداز وہ نہیں ہے جو عموماً نظری و غیر مرئی موضوعات مثلاً زندگی، موت، خزاں، بہار، غم، خوشی، نفرت وغیرہ جیسے موضوعات پر کہی گئی نظموں کا ہوتا ہے بلکہ اس نوع کی نظموں سے بہت مختلف ہے "حسد" کے متعدد اجزاء اور درجنوں مصرعے ایسے ہیں جو اس بات کا واضح سراغ دیتے ہیں کہ "حسد" عالیؔ کی عملی زندگی کا تجربہ ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری "وہ گھر سے لے کر باہر تک اپنے حسنِ سیرت وصورت اور کمالات فکر وفن کی بناء پر نو عمری ہی سے حسد کا نشانہ بنے اور ہم رتبہ ساتھیوں نے ان پر حسد کے زخم لگائے ہیں۔ ان زخموں میں بیشتر مندمل ہو گئے ہیں لیکن بعض ناسور بن گئے ہیں۔"(۱۱)

یہ بابِ حسد ہے
حسد جو کبھی ایک سبب ہے کبھی ایک وتد ہے
ہوا یہ ہے بھیا
کہ جو ساتھ والے ذرا دیکھ لیں کوئی بڑھنے لگا ان کی مرتی ہے میّا
عزیز اور دوست اور بچپن کے ساتھی
بہن بھائی، ماں باپ میں بھی، فقط ماں کو ہی چھوڑ کر
اے خدائے حقائق نہ رکھنا مری بحث کا رخ کبھی موڑ کر
ہاں تو سن
اور سر دھن نہ دھن
بس سنے جا
وہ دانے جو بکھریں بتولی کی مانند اس نیم جیسی زباں سے
جواہر کی بارش سمجھ کر چنے جا
توجہ کی لیزر سے کر چھید ان میں ارے یہ بڑے قیمتی ہیں
روایات کے سوئی دھاگے بنا بھی بنے جا
سگے رشتے دار اور کزن، یار غار اور دو تایا چچا خالہ خالو
وہ ہاتھی وہ گائیں وہ بھیڑیں وہ بھالو

وہ سب دور و نزدیک کے مانجھے گامے

وہ پھوپھا وہ مامے

اگر تجھ کو اپنے سے شمہ بھر آگے نکلتے ہوئے دیکھ لیں

جل مریں گے

چھپی اور ظاہر ہزار ایسی باتیں کریں گے

کہ تجھ تک وہ بن بن کے پہنچیں فسانے تو تیری شرافت ہزار ان کو چھانے

ہے اغلب کہ انکے تواتر سے خود نفرتی میں ہی پھنس جائے

تجھے کیا بتاؤں حسد کے رتوندے میں بیمار

ہو جاتے ہیں کس قدر خوار

کوئی حد اخلاق ہو اس کو دیکھے بغیر اپنے زورِ عداوت میں ہی پھاند جائیں

یہاں تک کہ اپنے بقول اپنی عینی شہادت کی تصدیق لائیں

سرِ عام صد کذب و افواہ کے کارخانے بنائیں

اور اس ہوشیاری سے ہر سمت تشہیر کروائیں

کہ ہر دم پریشانیاں اور بغیر گنہ بھی پشیمانیاں

اور حیرانیاں

تیرے چاروں طرف دلدلیں بن کے ابھری چلی آئیں اور ترا ماضی و حال اور آنے والا زمانہ سبھی ۔۔۔۔۔

ان میں دھنس جائیں

ارے یہ بلاغت کی مجبوریاں

کیسے رکھتی ہیں الفاظ و تفہیم میں دوریاں

اب معاصر

معاصر عجب چیز ہے میرے بھائی

اور ان میں سے جو دوست بنتا ہے تیرا

وہ دراصل ، اچھا ، عموماً ، ہے زہر ہلاہل بظاہر مٹھائی

مگر ہاں وہ تو بھی تو ہو سکتا ہے میرے پیارے

کبھی یہ سمجھ لے کہ بس تو ہے محسود حاسد ہیں سارے

معاصر، جو وہ بھی ہیں تو بھی
رہے یاد یہ نکتہ گفتگو بھی
معاصر جو اکثر کسی سے بھی خود کو کسی طرح کمتر نہ مانیں
کہیں یا چھپائیں سمجھتے یہی ہیں کہ دنیا نے صرف ان کی ہی تانیں
میاں ہم نے دیکھی ہیں بہتوں کی سب اونچی اونچی اڑانیں
اگر اپنے علامہ کے مرد مومن بیک وقت دو یا زیادہ ہوں پیدا حسد،
ہاں مرے منہ میں خاک، اک نہ اک شکل میں ان سے ہوگا ہویدا

حسد کے اس خوفناک و مہلک اثرات کے واقعاتی ثبوت پند و نصائح کی حکایتوں سے لے کر مقدس صحیفوں اور آسمانی کتابوں تک سبھی میں موجود ہیں عالی کے ہاں بھی حسد اور ان کے مضر نتائج کے سینکڑوں شواہد ملتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادگان یا برادران یوسفؑ کے واقعات کا بنیادی محرک بھی ان کے بھائیوں کا حسد ہی تھا لیکن حسد کے سلسلے میں مردوں کی تخصیص نہیں خواتین کے کارنامے اس سلسلے میں مردوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ عالی نے شاید طوالف کے خوف سے خواتین سے متعلق حسد کی بحث نہیں چھیڑی صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے

کہ میں لایا نہیں عورتوں میں حسد کے مسائل
اگر میں جیا اور ہم آگے چلے تو کبھی ان کے تیروں سے بھی تم کو مل کر کروں گا گھائل
یہاں تو ابھی ایک محدودی جستجو اور معاصر کے اطوار پر گفتگو ہے۔

عالی خود کو حاسدوں کے ہر گروہ اور ہر فرد سے بچا لے گئے ہیں اور اپنے دفاع و تحفظ کے لیے انہوں نے ضبط، تحمل و برداشت اور شفقت و محبت کے انہیں نسخوں کو استعمال کیا ہے جو انہوں نے ایک بوڑھے اور تجربہ کار مرد دانا کی حیثیت سے جوان جمالی کو بتائے ہیں۔

میاں میں بتاتا نہیں تم سے باتیں
عجب ان کے حیلے عجب ان کی گھاتیں
مگر کیوں
یہی جاننے میں تو میں نے گزارے، بغیر نتیجہ، کوئی ساٹھ صدیوں کے دن اور راتیں
مگر اس وقت تم صرف تیار رہنا
خبردار رہنا
حقیقت یہ ہے گو کہ کھل کر کوئی بھی نہیں مانتا ہے
کوئی بھی ذرا سی ذہانت، کا مارا معاصر کسی دوسرے کا کوئی حق ارفع نہیں جانتا ہے

وہ ہم فن نہ ہوا ور اک دوسرے کو کہے جو بھی کچھ
دل میں کم تر ہی، غاصب ہی گردانتا ہے
اگر جبر یا صبر یا مصلحت یا نمائش کی پابندیاں ہوں
تو جیسا بھی ظاہر کرے
سچ یہی ہے یہی ہے یہی ہے
کہ وہ اپنے اندر کی چھلنی میں صرف اک حسد چھانتا ہے
بھروسہ کرے اور اکیلے میں پوچھو تو غالب اور اقبال بھی اک کہانی
کہاں پھر وہ حسرت، فراق اور حفیظ اور جوش و جگر
کیا یگانہ و فانی
کہاں فیض و مخدوم کی جاں فشانی
اور ان کے معاصر کئی اور ناموں کی بھی خوش بیانی
کہے گا انہیں صرف لاشیں پرانی
وہ سچائی کے ساتھ پوری صدی میں فقط اپنا چہرہ یہی پہچانتا ہے
حسد سے خبردار رہنا
کہ بیٹے
اگر تم نہیں نکلے قسمت کے ہیٹے،
تو سب کا حسد تم کو کھانے لگے گا

بوڑھے نے نوجوان جمالی کو حسد کے اثرات سے محفوظ رہنے کے جو نسخے بتائے ہیں اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عالی کے نزدیک حسد لاعلاج مرض نہیں ہے بلکہ انہیں یقین ہے کہ اگر محبت، محنت، شفقت کا دامن استقامت کردار کے ساتھ تھام لیا جائے تو ضمیر اور انا کو حاسدوں کی ضرب سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

میاں بس جدھر بھی تجھے لے کے جائے ہوا و ہوس، بس
خبردار رہنا
سنو اب میں نسخوں پہ آنے لگا ہوں
جو تر کیبیں ہشیار لوگوں نے اپنے تحفظ میں کی ہیں
جو قدرت سے خدام خلق اور عظام فکر و عمل کو ملی ہیں
بتانے لگا ہوں

تو حضرت اگر جاگنے پر ہی تل جائے قسمت
تو پھر خوب سو کر بھی بیدار رہنا
اور ان لمحوں میں یاد رکھنا یہی مجھ سڑی کی نصیحت
حسد سے خبردار رہنا
وہ نسخے یہ ہیں، مجمل و مختصر
ہاں مگر مجھ سے ان کی کتاب حوالہ نہ بنوائیو اے لسپر
کوئی مطبوعہ ہے کوئی مخطوطہ ہے
علم سینہ بھی ہے
اپنے گیلن سے تا ابن سینا وز اں بعد افکارِ بسیارِ اہلِ نظر
نسخہ اولیں
ایک داروئے صبر
جس میں محنت، مشقت، محبت کے ہمراہ
ایک جزوِ اعظم ہے
اظہارِ ردِ عمل پر بڑا سخت جبر
دوئمش
العطش العطش
سخت دھوپوں میں چلتے چلتے جاؤ اور مت رکو
نرم راتوں میں بستر سے ہٹ کر تڑپتے رہو اور کہو
اے خدا
عالمِ اندروں
تو ہی مجھ کو پرکھ تو ہی مجھ کو بتا
کیا کروں
ہیر پر گر مرا حق ہے جائز تو یہ حق دلا
اتنے کیدو جو حلقہ بنائے ہوئے ہیں مرے گرد میں ان سے کیسے بچوں
تیسرا بھی دعا کی زباں میں وہی ایک گنج گہر تجزیہ
یاالٰہی اگر میں غلط چل رہا ہوں تو پھر راست رستے دکھا

ورنہ مجھ کو مری راہ پر تیز تر اور محکم چلا

ابتدائے سفر میں ہے اک شئے ضمیر

بعد میں جتنا آلودہ ہوتا چلا جائے آغاز میں ہے منزہ، مقتطع، سمیع وبصیر

وہ بھی دیتا ہے سب خامیوں کا پتا

وہ بھی بانگ خودی

وہ بھی صوتِ خدا

اس کو مرنے نہ دے

اس کو اک زخم ہی کی طرح دل میں رکھ اور بھرنے نہ دے

جب رہے گا بڑا ہی غضب ڈھائے گا

جانے کن کن دکھوں میں تجھے کیسا کیسا مزا آئے گا

حسد کا وہ حملہ وہ نمونما مٹے گا تو کیا

ہاں تری خلوتِ فکر وتخلیق میں بار کم پائے گا

حسد کے بارے میں علم النفس کے ماہرین، مذاہب وتوارخ اور ادبیات وشعریات کی روایات سے الگ بلکہ ان سے مختلف زاویہ نظر رکھتے ہیں۔ یعنی حسد ایک جبلی عمل ہے اور اس کی جذباتی کیفیات اکتسابی نہیں بلکہ فطری ہیں اور یہ کیفیات معاشرے اور فرد دونوں کے ارتقاء وارتفاع میں مثبت اور اہم کردار ادا کرتی ہیں اور زندگی کا مقصود اصلی، بقائے زندگی ہے یعنی زندگی کو بہر صورت بہ ہر عالم اور ہر لمحہ برقرار رکھنا ہے اور خود زندگی کی تخلیق چونکہ اشتیاق زندگی کے وفور اشتعال سے ہوئی ہے اس لیے زندگی خود اپنی زندگی کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مارتی رہتی ہے۔

اسی طرح انسان بھی اپنی ذات وصفات کی بقا کے لیے سرگرم عمل رہتا ہے وہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدل دینے کی کوشش کرتا ہے اور حاسد کا مد مقابل بن جاتا ہے۔ جذبہ حسد محسود کے حق میں ہمیشہ مہلک ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ محسود میں مسابقت کی ایک نئی طاقت پیدا کر کے نامساعد حالات سے آنکھ ملانے اور اپنی انا کو محفوظ رکھنے کا ایسا سلیقہ دیتا ہے کہ محسود نہ صرف یہ کہ حاسد کی زد سے اپنے آپ کو بچالے جاتا ہے بلکہ خود کو حاسد سے برتر وافضل ثابت کر دکھاتا ہے۔

لیکن حسد کے اس پہلو کی طرف عالی نے زیادہ غور نہیں کیا ورنہ وہ نوجوان جمالی کو بوڑھے کے پند ونصائح سے اس قدر خوف زدہ نہ کرتے۔ عالی نے خود کو بھی حاسدوں سے ہمیشہ بچائے رکھا ہے بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہ "عالی نہ تو خاندانوں کے حاسدوں کے سامنے کبھی سپر انداختہ ہوئے اور نہ ہم عمروں اور ہم عصروں یا ہم رتبہ یا ہم مشربوں کے حاسدانہ حربوں اور رویوں سے خوف زدہ ہوئے۔ مشکلیں بہت سی آئیں، مصائب بہت سے ٹوٹے اور عذاب طرح طرح کے جھیلے لیکن اپنی توانائی کی مدد سے اپنی انا کو حاسدوں کی گزند سے بچائے رکھا۔" (۱۲)

یہی وجہ ہے کہ عالی اپنے عہد کے ایک نہایت منفرد شاعر، باشعور دانش ور ہر دلعزیز نغمہ نویس، گیت نگار اور معتبر اظہاریہ نویس کی حیثیت سے سامنے آئے اور فکر وفن کے بلند منصب پر فائز ہوئے۔ دراصل عالی کا جام جم آج کی دنیا ہے اور جمالی آج کے اضطراب کی ترجمانی کرتا ہے۔ آج کے انسان کی جستجو کے مراحل پیچیدہ ہیں۔ کیونکہ وہ تہذیبی اور اجتماعی زندگی کے بہت سے سلسلوں سے وابستہ ہے ایسے سلسلے جن میں انسانی زندگی اور افکار دونوں انقلاب اور تبدیلیوں کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں۔ ان تبدیلیوں سے بدلتی ہوئی اقدار کا تعین ہوتا ہے۔ ان ہی سے ذات کی اثر اندازی کے حدود قائم ہوتے ہیں اور ہر بڑے انقلاب کے بعد یہ حدود زیادہ جامع اور زیادہ وسیع ہوتے رہے ہیں۔

"انسان" کی خوبی یہ ہے کہ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے لائے ہوئے انقلاب کے دور میں انسانی زندگی کے پھیلے ہوئے تضادات کو پیش کیا ہے اور تاریخ کی راہ میں سرگرم سفر انسان کے ذہنی کرب کی ترجمانی کی ہے۔ عالی نے انسانی سوچ کے متعدد رخ پیش کیے ہیں اس میں استدلال اور ردِ استدلال کی فضا موجود ہے عالی کی پیشِ نظر وہ نشانات بھی ہیں جو انسان کی درونی اور روحانی میلان نے قائم کیے ہیں۔

اس نظم میں بعض اوقات بذلہ سنجی اور دیگر عناصر طنز وظرافت کی جو آمیزش ہوئی ہے وہ خود اپنی جگہ لطف انگیز ہے۔

اس نظم میں گفتگو کی صورت یہ ہی ہے کہ مکالماتی مباحثے میں عالی کے ساتھ مختلف مرئی کردار شریک رہے ہیں۔ نوع بہ نوع سوالات قائم کیے گئے ہیں پھر واقعاتی دلائل اور تاریخی شہادتوں کے ذریعے ان سوالات کے جوابات تلاش کیے گئے ہیں اور یہ تلاش خشک مزاج فلسفیوں یا کم علم ملاؤں جیسی نہیں ہے بلکہ نہایت خوش ذوق و بالغ نظر اسکالرز جیسی ہے اور عالی کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیت، حیرت انگیز وسعت مطالعہ اور لائق تحسین طرز استدلال پر دلالت کرتی ہے۔

یقیناً اس نظم میں بعض بہت نازک اور سخت مقامات آتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عالی کا بچ کر نکلنا مشکل ہوگا لیکن بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہ

"عالی کی تخلیقی صلاحیت، لسانی جمالیات، ہمت عالی اور وسعت مطالعہ انہیں نہایت خوش اسلوبی سے اس دشوار گزار مرحلے سے نکال کر لے گئی۔" (۱۳) خصوصاً یہ بات لائق تحسین ہے کہ تخیل و تفکر کی اس صبر آزما طویل مسافت میں کسی ایک جگہ بھی نہ تو ان کے قدم ڈگمگائے نہ ان پر واماندگی طاری ہوئی اور نہ قنوطیت کو انہوں نے اپنے قریب آنے دیا۔ ہر چند کہ جبر واختیار کے مسئلے کو انہوں نے بار بار چھیڑا ہے اور قضا وقدر کو کئی جگہ موضوع سخن بنایا ہے لیکن عقیدے کی جبریت ان کی فکر آزاد کو کسی بھی جگہ بے اثر نہیں کر سکی۔ اور منقولات کی ہر بحث میں اس مقام پر ان کا معقولاتی ذہن غالب رہا ہے۔

بلاشبہ جمیل الدین عالی ہمارے دور کے عظیم شاعر ہیں جنہوں نے اردو کو "انسان" کے عنوان سے ایک فکر انگیز طویل نظم دی ہے۔ عالی کی اس جگر کاوی اور سینہ فگاری کی داد آگے چل کر ایک زمانہ دے گا "انسان" اگر مکمل نہ ہوئی تو بھی ایک مثالی نمونہ کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

حواشی وحوالے

(۱) ماہ نامہ چہارسو راولپنڈی ص ۳۸ تا ۴۱ براہ راست۔ گلزار جاوید

(۲) ارمغانِ عالی اگست ۱۹۹۸ء کراچی، لاہور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، آٹھویں سر کی جستجو اور جمیل الدین عالؔی ص ۴۱، ص ۴۲

(۳) ارمغانِ عالی اگست ۱۹۹۸ء کراچی، لاہور، ڈاکٹر حنیف فوق "عالؔی اور دشتِ سخن" ص ۲۲۹

(۴) ارمغانِ عالؔی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۰۶، ص ۱۰۷

(۵) ارمغانِ عالؔی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۰۷

(۶) فرمان فتح پوری ارمغانِ عالی ص ۱۱۵

(۷) ارمغانِ عالؔی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۰۷، ص ۱۰۸

(۸) ارمغانِ عالی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۱۵

(۹) ارمغانِ عالی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۱۶

(۱۰) ایضا

(۱۱) ارمغانِ عالؔی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۲۵

(۱۲) ارمغانِ عالؔی فرمان فتح پوری ص ۱۲۵

(۱۳) ارمغانِ عالؔی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۱۱۵، ص ۱۱۶

حالی کی نثر نگاری

عاؔلی کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسی ہمہ جہت اور رنگا رنگ ادبی شخصیت کا تصور اُبھرتا ہے جن کی زندگی میں منزل نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے بلکہ ایک ایک لمحہ سفر سے عبادت ہے اور سفر بھی وہ جس میں قدم بہ قدم پر پیچیدہ اور رنگین مقامات نے اُن کا استقبال کیا مگر عاؔلی نے ایسے تمام مقامات کو اپنی ذات کے لئے چیلنج کے طور پر قبول کیا اور سُرخرو ہو کر گزر گئے۔ دوہا، گیت، غزل، کالم نگاری، دیباچے، سفرنامے الغرض وہ کون سا میدان ہے جہاں انہوں نے کامیابی کے علم نہ گاڑے ہوں۔ عاؔلی کی اِن تمام ادبی وغیر ادبی کاوشیں ہر اہلِ نظر سے ژرف بینی کا تقاضا کرتی ہیں مگر اِس کے باوجود کوئی شخص اگر محض سطحی مطالعے سے بھی کام چلائے تب بھی اُسے یہ کہنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ پاکستان کا اگر کوئی دوسرا نام ہے تو وہ ہے "جمیل الدّین عاؔلی" "جیوے جیوے پاکستان" جیسے بیش بہا قومی نغمات کے بعد عاؔلی کے سفرناموں میں ان جذبہء حب الوطنی کی شان سب سے نمایاں ہے۔

زندگی کی دوڑ میں مستقل فعال، باعمل اور متحرک عاؔلی کے سفرنامے بھی ہو بہو ان کی شخصیت کے ترجمان ہیں تادمِ تحریر اُن کے تین سفرنامے منظرِ عام پر آ چکے ہیں "دنیا میرے آگے" (اشاعت ۱۹۷۵ء)، "تماشا میرے آگے" (۱۹۷۵ء) اور "آئس لینڈ" (اشاعت ۲۰۰۲ء)۔

بحیثیتِ مجموعی عاؔلی کے تینوں سفرنامے ایک ایسے بحیرۂ علوم کی مانند ہیں جو تواتر کے ساتھ بہہ رہا ہے، کبھی معمول کی رفتار سے رواں رہتا ہے اور کہیں باقاعدہ ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ جب قاری کی ملاقات عاؔلی سے اِن سفرناموں کے توسط سے ہوتی ہے تو جلد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دہلی سے تعلق رکھنے والے لوہارو خاندان کے فرد نہیں ہیں، یہ وہ عاؔلی نہیں جو خود کو نواب کا بیٹا بتاتے ہیں، یہاں نہ اِن میں غاؔلب کے پوتے کی سی کوئی بات ہے اور نہ خواجہ میر درد یا داغ دہلوی سے کسی قسم کی وابستگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ بلکہ یہاں ہم غیر ممالک کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے ایک ایسے عاؔلی سے ملتے ہیں جن میں نواب کے برعکس قلندرانہ اور فقیرانہ شان غالب ہے جو صرف جیبوں میں ہاتھ ڈالے حیرت کے مقامات سے گزرتے ہیں اور پھر اپنے قاری کے لئے اِس رنگا رنگ دنیا کی تمام بوقلمونیوں کا پردہ تیغِ قلم سے چاک کرتے ہیں۔ رختِ سفر کے طور پر عاؔلی نے ہمیشہ محض ایک چیز کو ساتھ رکھا اور وہ تھا اُن کا پاکستانی تشخص و وقار۔ تمام ملکوں کے باسیوں کو انہوں نے مذہب، اخلاق اور نفسیات کی کسوٹی پر پرکھا اور قدم قدم پر اِن امور کا موازنہ وہ اپنے وطن کے ذہنی عناصر سے کرتے گئے۔ کہیں

فخر سے ان کی گردن تن جاتی ہے اور کہیں وہ بالکل بجھ کر رہ جاتے ہیں۔ سفرنامہ قلبند کرتے ہوئے مصنف کو کئی لوازمات مدنظر رکھنے پڑتے ہیں مگر اس سے زیادہ اہم بات ہے کہ وہ اجزائے سیاحت کو بھی ملحوظ رکھے وہ ایک وسیع النظر اور کشادہ قلب انسان ہیں بذلہ سنجی لطافت، شوخی وشرارت، بے باکی وفراغت، یہ تمام عناصر یکجا ہوکر انہیں ایک مکمل اور متحرک سیاح کا روپ عطا کرتے ہیں اور دیکھا جائے تو عالی کے ہی اوصاف ہر خاص وعام کو ان سفرناموں کا بہترین لطف فراہم کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قوتِ مشاہدہ، تجزیہ عالی کا سب سے اہم ہتھیار ہیں جن کے بہترین استعمال کے سبب انہیں اردو کے اولین صف کے سفرنامہ نگاروں میں مقام ملا۔

"دنیا میرے آگے"

ایران، عراق، لبنان، مصر، دہلی، روس، فرانس، برطانیہ کی سیاحت کا جامعیت و اکملیت کے ساتھ احاطہ کیا ہوا عالیؔ کا یہ سفرنامہ اولاً ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کے بعد اِس کی اشاعتِ دوم کا سال ۱۹۸۴ء ہے۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو عالیؔ نے مذکورہ ممالک کے علاوہ جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، سوئزرلینڈ اور امریکہ کا بھی سفر کیا جن کی تفصیل ان کے دوسرے سفرنامے "تماشا میرے آگے" میں موجود ہے۔ مگر ابتداء میں یہ دونوں سفرنامے روزنامہ جنگ کراچی میں ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۶ تک اتوار کی اشاعت میں قسط وار چھپتے رہے۔ قارئین اُردو کے لئے یہ ایک منفرد احساس تھا لہذا لوگ گرہوں کی شکل میں بیٹھتے اور ذوق وشوق سے پڑھواتے اور سنتے۔ البتہ بعد میں بکھری شکل میں شائع ہونے والے اِن ٹکڑوں کو یکجا کیا گیا اور انہیں مرتب انداز سے دو سفرناموں کی شکل دے دی گئی۔ اس امر میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ اِن سفرناموں کے توسط سے قاری جس طرح خزینہ علوم سے استفادہ کرر ہا ہے اِس میں عالیؔ کے حلقہء احباب کا بڑا اہم کردار ہے جنہوں نے عالیؔ سے اس منتشر مواد کو حاصل کیا اور اسے باقاعدہ کتابی پیکر عطا کیا۔ ورنہ عالیؔ نے ہر بڑے تخلیق کار کی طرح اپنی نگارشات کے ساتھ وہی روایتی بے نیازی کا برتاؤ کیا۔

بالائی سطور میں یہ کہا جا چکا ہے کہ عالیؔ اپنے وطن اور اِس سے وابستہ تمام جذبات، تصورات اور احساسات کو کسی مقام پر اپنی ذات سے جدا نہیں کرتے یا پھر یوں کہا جاسکتا ہے کہ عالیؔ کو یہ جدائی کسی قیمت پر گوارا نہیں۔ پاکستان عالیؔ کا وطن ہے اور اِس سرزمین سے اُن کے جذباتی ربط و وابستگی میں کوئی شبہ نہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ عالیؔ کا دل مشرقی دنیا اور امتِ مسلمہ کے لئے بھی برابر دھڑکتا رہتا ہے۔ وہ ایک وسیع النظر انسان کی حیثیت سے جب وہ مغربی دنیا کے ناگوار رویوں، تلخ نظریوں، چالاکیوں اور عیاریوں کے ہاتھوں عالمِ اسلام کو بے بس دیکھتے ہیں تو اُن کا دِل خون کے آنسو روپڑتا ہے اور عالمی سطح پر روبہ عمل ہونے والے ہر انقلاب وتحریک سے آشنا قاری اِس عمل میں عالیؔ کا شریک بن جاتا ہے۔ عالیؔ کے سفرنامے کا یہ رُخ ڈاکٹر تحسین فراقی نے بہترین انداز سے اجاگر کیا ہے۔

"دورانِ سفر عالیؔ صاحب منظر ہی کو نہیں، پسِ منظر اور ماورائے منظر کو بھی دیکھتے ہیں اور جگہ جگہ تقابل

پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ اِن ہنستے بستے شہروں اور ہمکتے بولتے انسانوں کے خارج اور باطن میں پھیلی علتیں، علالتیں، کج رویاں، نارسائیاں، مجبوریاں اور ملامتیں بھی ان کی نگاہ میں رہتی ہیں۔ وہ جدید مشرق کی لاچاری، بے چارگی، خود فریبی، ناتجربہ کاری، اور بھول پن پر دکھی نظر آتے ہیں اور مغرب کی ساحرانہ چالوں اور مکاریوں پر برہم اور متاسف۔" (۱)

ہر ناول، افسانے یا کسی نظم کے اندر ایک موضوع ہوتا ہے جو محور کا کردار ادا کرتا ہے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ عالؔی کے سفرناموں کا بھی ایک مرکزی خیال ہے اور وہ ہے "پاکستانیت" سفرنامے میں اِس خیال کی اہمیت اُس مرکز کی ہے جس کے اردگرد عالؔی دیگر واقعات کا تانا بانا بنتے ہیں۔ عالؔی کے سفرنامے "دنیا میرے آگے" کا مکمل مطالعہ کرنے کے بعد اگر عالؔی کے جذبہ حب الوطنی کے واقعات کی فہرست مرتب کی جائے تو یقیناً وہ کافی طویل ہو جائے گی۔ اِن میں سے کوئی واقعہ اہمیت کے اعتبار سے کسی دوسرے واقعے سے کم نہیں۔ عالؔی ایک کٹر قسم کے وطن پرست انسان ہیں۔ پاکستان کا تصور ہر جگہ اُن کے ہمراہ رہتا ہے عالؔی اِس سے آگے کچھ نہیں سوچتے کہ وہ ایک پاکستانی ہیں۔ دِل میں پیدا ہونے والی باقی احساسات کی دنیا اور جذبات کا اُمڈتا دریا اسی ایک سوچ سے منسلک ہیں۔

کسی بھی سرزمین سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی بلند کردار شخصیت، عظیم الشان عمارت، زیرک اور محب وطن حکمران، محنتی عوام، تاریخ ساز درس گاہ، بے مثال کتب خانہ، بے لوث خدمت انجام دینے والے ہسپتال، جدت و قدامت کے امتزاج سے جنم لینے والا فن اور اُن کے خالق، وطن کی محبت سے سرشار مزدور، کسان، بہادر افواج، صحت و صفائی کا منہ بولتا نمونہ کوئی سڑک یا گلی غرض اِن تمام مظاہرات کا تعلق خواہ کسی بھی سرزمین سے ہو، عالؔی اِن مقامات سے بیگانہ وار نہیں گزرتے بلکہ

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

کے مصداق ہر شے کا جائزہ بہ نظرِ عمیق لیتے جاتے ہیں اور دعوتِ دید دینے والے ایک ایک گوشے کا مشاہدہ اُس کی جزئیات سمیت کرتے ہیں۔ اِس پوری کیفیت میں قاری اُن کے قدموں سے قدم ملا کر چلتا ہے۔ ایک منجھے ہوئے سفرنامہ نگار کی طرح عالؔی محض اِس امر پر اکتفا نہیں کرتے کہ قاری کے روبرو تمام منظر اور اُس کے ہر پہلو کو کھول کر بیان کر دیا جائے بلکہ عالؔی کا طرزِ بیان قاری کو اُس کیفیت میں بھی شریک کرتا ہے جو کسی مرحلے، یا

مقام سے گزرنے کے بعد خود عالی کے اپنے اوپر طاری ہوئی۔ یہی عالی کے سفرناموں کا بلند امتیاز ہے جسے حاصل کرنے کے بعد اُن کے سفرنامے مقبولیت اور کامیابی کے اعلیٰ درجوں کو چھو لیتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا اندازہ وہاں ہوتا ہے جب عالی نے ترکمانستان کے عوامی شاعر مخدوم قلی کی دو سو پچیسویں برسی کے موقع پر اُنہیں خراجِ تحسین، پیش کرنے کے لئے پاکستان کا قومی ترانہ گایا۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا جب کمیونسٹ مندوبین مخدوم قلی پر گفتگو کے بجائے محض سوویت نظام کی تعریف میں اظہارِ خیال کر رہے تھے مگر عالی نے حالات کے بالکل برعکس ایک منفرد تحفہ دیا اور اظہارِ جذبات کے لئے ایسا الگ انداز اختیار کیا جو تمام حاضرینِ محفل کے لئے حیران کن تھا۔ مگر صورتِ حال یہ تھی کہ جب عالی نے پورا سینہ تان کر قومی ترانہ پڑھنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ تمام لوگ کھڑے ہو کر اُن کے ساتھ سُر ملانے لگے۔ ترکی کے نامور شاعر ناظم حکمت سب سے پہلے کھڑے ہوئے اور اُن کی قیادت میں ایک ایک وزیر، مندوب اور عہدیدار کھڑا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بینڈ ماسٹر بھی اپنے عملے سمیت کھڑا ہو گیا اور عالی کی آواز کے ساتھ سُر ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسلامی اخوت سے سرشار شخصیات نے عالی کو گلے لگا لیا۔ اُن کی پیشانی چوم لی اور بقول عالی وہ یہ جلسہ جیت گئے۔ ناظم حکمت کے دِل میں عالی کے اِس عظیم عمل کے بعد اُن سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ خیر، یہ سب تو ہوا اور یقیناً عالی کا یہ کارنامہ ہر پاکستانی کے لئے باعثِ افتخار بنا مگر خود عالی کی جو کیفیت ہوئی اور اُس کیفیت کے بعد جن خیالات نے اُن کے ذہن میں چکر لگایا وہ کیا تھے؟ ملاحظہ ہو۔

"ہال میں تقریباً پانچ منٹ تک تالیاں بجتی رہیں اور میں اپنی نشست پر سب سے غافل آنکھیں بند کئے گنگناتا رہا۔ شاید میں بھی رویا تھا۔ کیونکہ مجھے اپنی آواز بھرائی ہوئی لگی۔

پاک سرزمین کا نظام

قوتِ اخوتِ عوام

قوم ملک سلطنت پائندہ تابندہ باد

شاد باد منزلِ مراد

شاید میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ منزلِ مراد۔ وہ قوتِ اخوتِ عوام، میری زندگی میں اپنا جلوہ نہ دکھا سکے گی یا ممکن ہے کہ ایک آدھ جھلک دکھا جائے۔ وقت عام طور پر بہت سستی سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر

کبھی اس کی تیز رفتاری نظر بھی آنے لگتی ہے۔" (۲)

افسوس عالی جی! آپ نے بھی کس قوم سے امید باندھی ہے۔ وہ قوم جس کے افراد ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں، حالانکہ جانتے ہیں کہ مستقبل کس قدر خوفناک ہے مگر اپنی ذات میں ہر کوئی بے عمل شخص راہِ غفلت پر سفر کرتے ہوئے لحظہ بہ لحظہ ایسی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے جس کا نام تباہی و بربادی ہے۔ وہ قوم جس کا ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ تھا آج اُس قوم کے تمام افراد کے پاس آپ کے حضور پیش کرنے کے لئے ندامت کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں اور شاید کچھ لوگوں کے پاس تو یہ بھی نہیں ہے۔ عالی جی! جو اس آپ نے ہم سے لگائی ہے اُس کا جلوہ دکھانا تو دور کی بات ہے ہم تو شاید ایک آدھ جھلک بھی دکھانے کے قابل نہیں رہے، ہمارے سر شرم سے جھکے ہوئے ہیں۔ اب معذرت نامہ لکھنے کے لئے اس قدر طاقتِ قلم کہاں سے لاؤں، عالی جیسے زمانہ شناس انسان اِس معاملے کو خود بھی اچھی طرح جانتے ہونگے۔

ایک اور تجربہ جو عالی کے ساتھ روس میں پیش آیا وہ بھی عالی کے اعلیٰ پاکستانی تشخص کی علامت بنا۔ جب لینن گراڈ میں نازیوں کے ہاتھوں دوسری جنگِ عظیم میں بھوک اور سردی سے مرنے والے بچوں اور عورتوں کی قبروں پر سفید پھولوں کی چادر چڑھانے کا اعزاز عالی کو ملا مگر ایک جرمن شاعر ہرنس فیلڈ نے عالی سے درخواست کی کہ وہ یہ اعزاز اُسے منتقل کر دیں کیونکہ پانچ لاکھ اِن بے گناہ شہریوں کی موت کی ذمہ دار اسی شاعر کی قوم تھی اور اِس وقت وہ اس وقت وہ احساسِ ندامت سے مغلوب ہو کر حقیر سا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ عالی نے جب باقاعدہ اُسے روتے دیکھا تو وہ چادر اُسی جرمن شاعر کے ہاتھوں میں تھما کر خود پیچھے ہٹ گئے۔ اُس نے، چادر چڑھا دی۔ اُس کے بعد کیا ہوا یہ عالی کی زبانی سنیئے

> "واپسی میں ہرنس فیلڈ نے سب کو بس کے آگے روک لیا۔ وہ پائدان پر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنے سر سے ہیٹ اتار لیا۔ "دوستو۔ "انہوں نے بلند آواز سے کہا" یہ شخص کمیونسٹ نہیں ہے۔ پاکستان کمیونسٹ نہیں ہے۔ میں سچا کمیونسٹ ہو مگر۔۔ مگر میں اظہارِ تشکر کے لئے آپ کے سامنے پاکستان کو سلام کرتا ہوں۔" سب نے تالیاں بجائیں۔ کرشن کریلانی شیشوں سے مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ ایک کمزور ایشیائی نے، ایک طاقت ور یورپین کا دل جیت لیا ہے۔" (۳)

عالی کے نزدیک تشکیلِ پاکستان کا سب سے اہم متحرک اسلام ہے۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ پاکستان کی بات کریں اور اسلام کو نظر انداز کر دیں۔ کمیونزم کو آزادی انسانیت کا علمبردار سمجھنے والوں کے لئے اِس سفر نامے میں جگہ جگہ بیداری کا پیغام ہے۔ عالی اس نظام ہر موقع پاتے ہی چوٹ کر جاتے ہیں اور اس کے برعکس وہ اسلام کو انسانی اقدار کا حقیقی محور و مرکز قرار دیتے ہیں۔ جنرل عبدالکریم قاسم کے انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کے لئے آنے والا تمام طائفہ کمیونسٹ افراد پر مشتمل تھا مگر عالی نے وقت پڑتے ہی ثابت کر دیا کہ پاکستان اور عراق کے مابین اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ اسلام ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ کمیونزم کو سطحی انداز سے دیکھنے والے کے لئے شاید اس میں کشش کا کوئی پہلو نکل آئے مگر عالی کا سفر نامہ "دنیا میرے آگے" اِس حوالے سے جو معلومات فراہم کرتا ہے اُس کے مطابق جن ممالک میں کمیونزم کا پرچار ہے وہاں کسی اور مذہب کی تعلیم کے لئے معمولی درس گاہ کا قیام بھی ممکن نہیں۔ مساجد صرف اوقاتِ نماز کے لئے کھولیں اور پھر بند، صحافت اور اخبارات کو آزادی اظہار کا حق نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ کوئی اور سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ اپنی مرضی سے کوئی پوسٹر یا کسی قسم کا پمفلٹ چھاپنا اور تقسیم کرنا نہایت دشوار ہے۔ اِن اقوام کا فقط اپنا نقطۂ نگاہ ہے جن پر اِن کی نسلیں آنکھ بند کر کے لکیر کے فقیر بنی چل رہی ہیں۔ دیگر غیر ملکی یا غیر مذہبی نظریات اِن کے لئے نا قابلِ قبول ہیں۔ باہر سے آنے والی ہر روشنی اور ہر آواز کے راستے یہاں بند ہیں۔ عالی نے ایسے ممالک کو بڑے بڑے کنوؤں سے تشبیہ دی ہے۔

عالی کے سفر نامے کو پڑھتے وقت اِن کی اس شرط کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ قاری کو ہر اُس جگہ جانا پڑے گا جہاں عالی اُسے لے جانا چاہیں اِس شرط کو نبھانے والا قاری اُن کے ساتھ نائٹ کلب، شراب خانوں اور رقص گاہوں کی بھی زیارت کرتا ہے اور اگر کوئی شخص نہیں جانا چاہتا تو وہ سفر نامہ بند کر دے اور اللہ رسول کے ذکر سے ایمان کو تازہ کرے۔ عالی تو ایک روشن دماغ کے مالک بے باک انسان ہیں۔ وہ قاری جو دِل مضبوط کر کے عالی کے ساتھ ایک بار نائٹ کلب چلا جائے تو پھر اُسے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عالی کا اُسے یہاں لانے کا منشا و مقصد کیا تھا۔ لبنان، مصر، فرانس، روس، برطانیہ یہ وہ ممالک ہیں جہاں اخلاقیات اور تہذیب معاشرہ کے با آواز بلند دعوے کیے جاتے ہیں مگر جونہی رات بارہ بجے کے بعد تاریکی کا جال پھیلتا ہے۔ ابنِ انشا نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے محض ایسے مقامات کا ناموں اور اشتہارات کے ذریعے تعارف

کروایا۔ مگر عالی نے سڑکوں پر ہونے والے واقعات کی مکمل تفصیل فراہم کی ہے۔ جسم فروشی وہاں کی عورتوں میں اب ایک کاروبار کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ عالی اور اُن کا قاری دونوں بیک وقت اِس تجربے سے دو چار ہوتے ہیں۔ عالی اِس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ معصوم قاری کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اُسے رقص گاہ یا نائٹ کلب لے جاتے ہیں اور اطمینان سے اُن مقامات پر ہونے والے حیا سوز واقعات اور برہنہ رقص کا منظر مرحلہ وار تمام جزئیات سمیت بتاتے ہیں اِس لئے قاری کو بڑی حد تک سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جلد ہی اُس فضا میں دم گھٹنے لگتا ہے مگر عالی کی شرط کو پورا کیئے بغیر آگے بڑھ جانا ممکن نہیں۔ میں نے بات کی تھی کہ عالی ایک مخصوص فرض و غایت، کے تحت وہ منظر دکھاتے ہیں۔ حقیقتاً یہاں عالی کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو مغربی دنیا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے اخلاقی نظام اور تمدنی ارتقاء کی ظاہری چکا چوند سے متاثر ہیں اور اپنے معاشرے میں مروجہ اخلاقی اصولوں پر احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ عالی نے بظاہر مہذب دکھائی دینے والے اِن معاشروں کے عبرت ناک تاریک پہلوؤں کا پردہ چاک کر کے ثابت کر دیا کہ نفسانی لذتوں کا رجحان اور جنس پرستی کے اثرات نے ایک محدود حلقے سے نکل کر اب وہاں کے شرفا کو بھی اپنے پنجوں میں جکڑ لیا ہے اور سماج کی رگوں میں سرایت کرنے والا اخلاقی پستی کا یہ زہر اُن کی نسلوں کو متاثر کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اِس کے برعکس پاکستان میں موجود سماجی اور اسلامی نظامِ اخلاق میں ابھی تہذیب و تمدن کی اقدار زندہ ہیں جنہیں عقل و دل کے اندھے انسانی جبلت و فطرت کی پابندیاں قرار دیتے ہیں۔ انہی جبلی اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسلام نے ایسا نظام تشکیل دیا ہے جس میں زندہ رہ کر مذہبی اور تمدنی روح کو زخمی کیئے بغیر ہر شخص متوازن طریقے پر زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ ممالک جن کا ذکر عالی نے کیا ہے، ایسے چند اصول و ضوابط کے بل بوتے پر خود کو اخلاقی بلندیوں اور ثقافتی عظمتوں کا علمبردار کہتے ہیں جو اب بے روح ہوتے جا رہے ہیں اور جب نگاہوں کے سامنے سے نام نہاد دعووں کا نقاب اُٹھتا ہے تو تصویر کا ناقابلِ یقین اور گھناؤنا رخ دکھائی دیتا ہے۔ اس مقام پر عالی دعوت دیتے ہیں

"فاعتبروا یااولی الابصار"

قرآن کے بعد عالی کے سفرنامے ہی ہیں جہاں اِس آیت کا سب سے زیادہ برمحل استعمال ہوا ہے۔ عالی نے "دنیا میرے آگے" میں اس سے ملتے جلتے چند اور ایسے تجربات قلمبند کیے ہیں جنہیں پڑھ کر

ہم بجا طور پر خود کو قابلِ فخر قوم کا باشندہ اور عالمگیر مذہب کا پیرو کار سمجھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ مگر اس سفر نامے میں کئی مقامات ایسے بھی آئے جہاں قاری کو بڑی تلخ صداقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں عالی خود اپنی قوم کو اُن کی معاشرتی زندگی کے وہ شرمناک پہلو دکھاتے ہیں جواب ہم کو بربادی کے راستوں تک لے آئے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک ایک واقعے کا اجمالی جائزہ بھی لیا جائے تو اِس پورے سفرنامے کا خلاصہ تیار ہو جائے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ جس نعرے کو بنیاد بنا کر آزادی حاصل کی گئی تھی اب اُس نعرے کی کہیں بازگشت بھی نہیں سنائی دیتی۔ اسلام کی مسخ شدہ تصویر میں اب وہ کیفیت نہیں رہی جو اِس قوم کو دیگر اقوامِ عالم سے ممتاز کرتی تھی۔ اِس اوّلین شناخت کا ہاتھوں سے نکل جانے کا مطلب یہی تھا کہ اب ہماری داستان کا زوال شروع ہو گیا ہے۔ ایسے تمام سماجی مظاہرات جنہیں ایک منفرد پہچان کے طور پر اختیار کرنا تھا اب وہی ہمارے لئے باعثِ شرم ہیں۔ عالی نے اپنے طنزیہ لہجے اور کاٹ دار جملوں میں جن سچائیوں کو ایک پاکستانی پر کھولا ہے اُن سے نظریں چرانا گویا اپنے نیست و نابود ہو جانے کا خاموش اعتراف ہے۔ عالی کے انداز میں بیک وقت ملامت اور چیلنج کا امتزاج ہے۔ جو برتاؤ پاکستان میں اِس کی زبان، لباس، مذہب، اخلاقیات، تحقیق علوم و فنون اور آبائی ورثے کے ساتھ ہوا عالی نے اِس سفرنامے میں موقع ملتے ہی جگہ جگہ اِس کی نشاندہی کی ہے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ عالی کا مقصد صرف دیس دیس کی خاک چھاننا ہرگز نہیں بلکہ وہ ایسے تمام امور کا جستہ جستہ جائزہ لیتے ہیں جو کسی قوم کے زوال یا ترقی کے اہم محرکات ہوں۔ انہوں نے فرانس، برطانیہ اور روس کے علاوہ دیگر عرب ممالک میں جا کر جو چیز محسوس کی وہ اِن ممالک کا اپنی زبان کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ تھا جس نے عالی کو بے حد متاثر کیا۔ سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری معاملات ہوں، تعلیمی یا غیر تعلیمی سرگرمیاں ہوں یا پھر دیگر ذرائع نشر و اشاعت مثلاً اخبار، رسائل، جرائد اور ٹیلی وژن غرض ہر جگہ قومی زبان کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ یہ ممالک اپنی قومی زبان کو ہر سطح پر اس فوقیت کے ساتھ برتتے ہیں کہ بین الاقوامی سطح پر قومی زبان ہی اِن ممالک کی شناخت کا ایک اہم ذریعہ بنتی ہے۔ دوسری جانب پاکستانیوں نے اُردو کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک بدسلیقہ اور پھوہڑ عورت اپنے گھر کی ہنڈیا روٹی کے ساتھ کرتی ہے۔ ضبط و تحمل کا مظاہرہ کر کے اگر کھا سکتے ہیں تو کھائیں ورنہ باہر تو ہر جگہ انگریزی ریستوران موجود ہیں۔ ایک صورت تو یہ بھی ہے کہ ہم اُس پھوہڑ عورت کی جگہ دوسری سلیقہ مند عورت کو لے آئیں بہر حال یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ اُردو کی

بقاوترقی کے لئے کون سی صورت زیادہ مناسب ہے۔ پاکستان میں اردو پر گزرنے والے ہر حادثے کے عالؔی چشم دید گواہ ہیں اور وہ بھلا کہاں چُپ رہنے والے انسان ہیں۔ حقیقت کے تمام پہلو دکھانے کے لئے اُن کے پاس اپنا انداز ہے۔ نہایت منفرد و جداگانہ۔ عالؔی کا اسلوب خاص، اُردو کے حوالے سے جو کچھ حالؔی نے "دنیا میرے آگے" میں بیان کیا، اُن کی یہ تحریر خود پکار اُٹھتی ہے کہ یہ خاص عالؔی کے قلم سے نکلی ہے۔ اس انداز کی ایک جھلک کچھ یوں ہے۔

"میں نے سوچا خدانخواستہ اگر ہمارے ملک میں حکومت قومی زبان بولنے لگے تو عوام کے خوش ہونے میں پہلے خواص اور حکام نہ جانے کیا تختہ پلٹ دیں۔ ملک بھر کی انتظامی مشینری رُک جائے، وکیل عدالتوں میں گھبرا جائیں، لائسنس جاری ہونے بند ہو جائیں محکمہء ڈاک و تار معطل ہو جائے اور مغرب زدہ خاندانوں کی فلرٹ کنواریاں اپنے عاشقوں کے سامنے گونگی نظر آئیں۔ اچھا، حکومت اور عوام کو تو چھوڑو، ذرا فلرٹ کنواریوں اور بیگمات کا تصور کرو۔ اب تو جب رمبا سمبا ناچتے ناچتے "محبوب" کے ہاتھوں کی گرفت ان کے گرد سخت ہو جاتی ہے تو وہ سسکی بھر کر کہتی ہیں:

Oh ! You pig

اب اگر اردو رائج ہو جائے تو وہ کیا کہیں گی۔

"اوہ! تم سور کے بچے۔"

ظاہر ہے کہ اُردو میں سور کے بچے کے معنی سور کا بچہ ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہماری ایشیائی روایات میں ابھی تک سور کو مقامِ محبوبی نہیں مِل سکا ہے۔ پس وہ عاشق فوراً بُرا مان جائے گا، لہٰذا اے حکام! اور اے خواتین! اس ملک کی مغرب زدہ کنواریوں اور بیگمات کے جذبات کا خیال رکھنا اور کم از کم اپنے جیتے جی اس غیر مہذب زبان کو اس کا مقام نہ ملنے دینا۔" (۴)

عالؔی کے اِن چند جملوں سے غور و فکر کے کئی راستے نکلتے ہیں۔ اُردو زبان جو ہماری قومی شناخت تہذیبی تشخص کا اہم جزو ہے اُس سے وفا شعاری کا تقاضا یہی ہے کہ پڑھنے والا اِس اقتباس کے ذریعے بین السطور پوشیدہ اصلاح کا پہلو تلاش کرے۔ حقیقت شناس پاکستانی کے لئے عالؔی کے لہجے میں کاٹ دار طنز بھی موجود ہے اور وقتی مزا لے کر پڑھنے والے کے لئے اِس میں چٹخارہ اور لطافت بیک وقت شامل ہے۔ گویا عالؔی کا قلم ایسا

تیر ہے جس سے وہ دونہیں کئی کئی شکار کر جاتے ہیں ۔ عالیؔ کے اِس شکار کی زد سے نہ اُن کے ملک کی رعایا بچ سکی اور نہ اعلیٰ حکام محفوظ رہے ۔ بلکہ وقت پڑنے پر عالیؔ نے غیر ممالک کے عوام اور حکمران طبقے کو بھی نہیں بخشا ۔ عالیؔ کی ذات میں تلخ حقائق کی ذہرناکی اِس حد تک بڑھ چکی ہے کہ اپنے طنزیہ جملوں کی نشتریت سے خود اپنے آپ کو زخمی کر جاتے ہیں ۔ عالیؔ جانتے ہیں کہ وہ ایک پاکستانی ہیں اور وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اِس زوال آمادہ قوم کے ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اُن پر کیا ذمہ داریاں عائد ہیں ۔ وہ کہاں کہاں ان ذمہ داریوں کو نبھاتے گئے اور کہاں اُن سے غفلت ہوئی ، اِن تمام معاملات کا اظہار وہ " دنیا میرے آگے " میں برملا کرتے ہیں ۔ قومی زبان کی مانند قومی لباس کی اہمیت شاید اپنے وطن میں اتنی نہ ہو جتنی بیرونِ ممالک میں اِس کی قدر و منزلت کا خیال کرنا پڑتا ہے اور عالیؔ نے جب اِس امر کا خیال نہ رکھا تو پھر اُن کے اوپر عجیب کیفیت گزری ۔ ایسے میں پاکستان کے ساتھ آزاد مملکت کی اصطلاح کا استعمال صرف ایک مذاق معلوم ہوتا ہے ، جب قومی زبان بولنا اور قومی لباس پہننا باعثِ شرم ٹھہرے اور انگریزی زبان ، انگریزی لباس اور دیگر طرزِ حیات میں مغربیت وجہ افتخار سمجھا جائے ۔ تو آیئے ! ذرا ہم بھی عالیؔ سمیت اُس کیفیت کو محسوس کریں جو اُن پر اُس وقت گزری جب عراق میں کسی کا آزادیِ پاکستان کے حوالے سے ایک طنزیہ جملہ عالیؔ کی سماعت سے ٹکرایا وہ لکھتے ہیں ۔

" ایک لمحے کے لئے میرا جی چاہتا ہے کہ کوٹ پھاڑ کر پھینک دوں اور اپنے گلے میں پھنسی ہوئی کالی پٹی سے دم گھونٹ لوں مگر مجھے اپنے ملک واپس جانا ہے ۔ جہاں یہ لباس پہنے بغیر میں ہائی سوسائٹیوں کے استقبالیوں اور عشائیوں میں شریک نہیں ہوسکتا ۔ جہاں نہ صرف اس واقعے کا ذکر کرنے سے میرا مذاق اُڑے گا بلکہ شاید میرا مستقبل بھی خطرے میں پڑ جائے گا ۔ " (۵)

بالآخر یہاں آ کر عالیؔ کا طنز اپنے پورے عروج پر جا پہنچتا ہے اور وہ احتجاجاً حقائق پر مبنی چند نعرے بلند کرتے ہیں ۔

" زندہ باد ملکہ معظمہ قیصرہ ہند و پاکستان "

" زندہ باد لارڈ مکالے "

" زندہ باد مغربی تعلیمی نظام "

"زندہ باد آل برطانیہ ثم طبقہ بلند پاکستانیہ" (۶)

اس طرح کی کئی مثالیں سفرنامے کے مکمل مطالعے کے بعد سامنے آسکتی ہیں جن میں طنز و مزاح کا بہترین امتزاج ہے۔ عالی درحقیقت ایسے مصلح قوم ہیں جو سماجی فلاح و بہبود کی خاطر اپنے قاری کے روبرو منبر پر کھڑے ہو کر وعظ یا تقریر نہیں فرماتے اور نہ ہی پند و نصائح کے وہ لمبے چوڑے پُل دکھائی دیتے ہیں جو چند ابواب پڑھنے کے بعد قاری اور اُس ذہن کے لئے بارِگراں ثابت ہوں۔ نہایت لطیف پیرائے میں یا پھر طنزیہ انداز سے دعوتِ تفکر و تدبر دینا عالی کے اِس سفرنامے کی کلید کامیابی ہے۔ عبدالعزیز ساحر عالی کی شخصیت اور مزاج کو بڑی خوبی سے اُن کے سفرنامے کے اندر دریافت کرتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں وہ یوں رقمطراز ہیں

"یہ طنز ایک طرح سے المیاتی فضا میں جنم لیتا ہے لیکن اِس میں یاسیت اور قنوطیت کا عنصر پیدا نہیں ہوتا بلکہ مثبت اندازِ فکر کا نمائندہ بن کر رجائی طرزِ عمل کا داعی ٹھہرتا ہے۔ ان کے طنز میں کسی قسم کی گھٹن پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح سے تازگی کا احساس بڑھ جاتا ہے اور اِن کی رعنائی فکر خارجی ماحول میں ہلکے پھلکے مزاح کی جانب پیش قدمی شروع کر دیتی ہے۔ عالی مزاجاً مصلح واقع ہوتے ہیں۔ اِس لئے اِن کے ہاں یہ رنگ کئی جہتوں میں نظر آتا ہے، طنز اِن میں سے ایک ہے۔ اگر اِن سفرناموں سے طنزیہ حصّوں کو الگ کر لیا جائے تو اچھا خاصا مجموعہ ترتیب پاسکتا ہے۔" (۷)

مضمون نگار کی اس رائے سے بڑی حد تک اتفاق ممکن ہے۔ کیونکہ عالی کی طنزیہ تحریر میں اصلاح پسند پہلو تلاش کرنا صرف آنکھ والوں کا کام ہے جو دیکھیں اور عبرت پکڑیں اور پھر یہی آنکھ والے شاید "لاَ تَقنَطُو" کی زندہ تصویر بن کر مثبت طرزِ فکر اختیار کریں تب ہی اصلاحِ معاشرہ کی جانب پیش رفت کی ایک صورت جنم لے گی۔ مگر جس دھرتی پر عالی اور اُن جیسے کئی پُر امید افراد سانس لے رہے ہیں اُسی دھرتی کی زمین پر وہ لوگ بھی دندنا رہے ہیں جو اِس ملّی و تہذیبی عمارت میں ہونے والی شکست و ریخت کے اصل ذمہ دار ہیں۔ کچھ ہو جائے مگر عالی اُن مخصوص افراد سے چشم پوشی نہیں کرتے جو خود کو طبقۂ عالیہ و اشرافیہ کا نمائندہ کہتا ہے۔ عالی کے نزدیک یہی طبقہ سماجی تنزل اور تمدن کی پامالی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ عالی نے اُن کی ماتھوں پر اُبھرنے والی شکنوں کی پروا کئے بغیر اُن پر چوٹ کی ہے۔ مگر عالی نے یہ کام کُھل کر نہیں کیا عالی ایسے لوگوں کو

عوام کے سامنے واضح طور پر بے نقاب نہیں کر سکے۔ وہ اِس نام نہاد معزز طبقے کو منظرِ عام پر لا کے ان کا حقیقی روپ دکھانے میں ناکام بھی ہوئے اور ایسا کیوں ہوا؟ اِس کی وضاحت عاؔلی ایک جگہ خود کر دیتے ہیں۔ وہ طبقہ بلند پاکستانیہ سے راست مخاطب ہیں:

"اے طبقہ بلند پاکستانیہ جس کا اصلی نام میں نہیں لے سکتا۔ اے میرے آقا! میری روٹی، میرے کپڑے، میرے تمدن، میری زبان، میرے دل و دماغ کے مالک، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ملک سے باہر نکل کر اس حقیر فقیر بے تقصیر پر کیا گزر رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔ یقیناً مجھے اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہے جو آپ کے فیاض اور عظیم ہاتھوں میں ہے۔"

(۸)

یہاں عاؔلی بے دھڑک اور بلا جھجک سچ بول گئے اور اپنی ذات کے ہمراہ اُن لوگوں کو بھی نشانہ بنا گئے جن کی نسلوں کا مستقبل صرف اِسی صورت محفوظ ہے جب وہ طبقہ بلند کے سامنے اپنے اپنے لبوں کو سی کر رکھیں۔ استحصالی قوتوں کے ہاتھوں میں کمزور اور بے بس کٹھ پتلیوں کی مانند تمام زندگی تماشا بنے رہیں۔ عاؔلی کو اپنی اور اپنے جیسے تمام افراد کی کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ دوسری جانب عاؔلی اُس معمولی درجے سے تعلق رکھنے والے افراد کی صلاحیتوں کے بھی معترف ہیں جنہوں نے اپنی اقوام کو محض فرض شناسی کی بنیاد پر ترقی کی شاہراہوں پر گامزن کر دیا اور اپنے معاشرے، کو دنیا کے صفِ اوّل معاشروں میں لا کھڑا کیا۔ عاؔلی نے برطانیہ میں سڑکوں پر گشت کرنے والے معمولی پولیس بابی اور نچلے طبقے سے وابستہ میم کو اِس ضمن میں ہمارے روبرو ایک مثالی کردار کے طور پر پیش کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ حکمران طبقے سے لے کر کسان مزدور، غرض ہر شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد ادیئگی فرض کے احساس کے تحت قلیل مدت میں اپنے ممالک کو ترقیاتی معاملات میں سو برس آگے لے آئے۔ یہ صداقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ اِس نوعیت کی فضا سازی میں جمہوری عمل کو بڑا دخل حاصل ہے۔ مگر عاؔلی نے ایسی قوموں کو پھر بھی معاف نہیں کیا۔ جمہوریت اور انسانی مساوات کی تابندہ علامت کے طور پر جن ممالک نے خود کو منوایا، عاؔلی نے بیک جنبش قلم اُن کا سفاک روپ بیان کر دیا۔ بھیڑ کی کھال کو اُدھیڑ کر اُس میں چھپے خونیں بھیڑیوں سے قاری کو عاؔلی نے یوں متعارف کروایا:

"برٹش پارلیمنٹ کے لئے بہت سی گائیڈ کتابیں مل جاتی ہیں۔ کئی تاریخیں بھی ہیں جنہیں انگریز"

جمہوریت پسند" علما نے بڑی محبت اور محنت سے لکھا ہے۔ دو چار میں نے بھی پڑھی ہیں۔ مگر کہیں کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ آزادی کا قلعہ یہ جمہوریت کا ضامن ادارہ، یہ مادر پارلیمان آخر صدیوں تک ایشیائیوں اور افریقیوں پر ناجائز قبضہ، استبداد، ظلم، لوٹ کھسوٹ کیوں برداشت کرتا رہا۔ وہ پارلمینٹ جو انگلستان میں گوشت کی قیمتیں زیادہ ہونے پر حکومت بدل دیتی تھی، اپنے اہکاروں سے ایشیا میں انسانی گوشت کی بوٹیاں کیوں نچواتی رہی۔" (۹)

دراصل اِس امر سے تو عالی بھی بخوبی واقف ہونگے کہ عالمی سطح پر طاقت کے طور پر اُبھرنے والا ہر ملک فوقیت و اوّلیت کے درجات پر آنے کے لئے صدیوں کا سفر طے کرتا ہے۔ اُس کے اپنے سماجی اصول وضوابط ہوتے ہیں جو کسی ایسے نظامِ اخلاقیات کے تحت وضع نہیں پاتے جہاں اپنے معاشرے سے قطع نظر کوئی انسانی ہمدردی، مساوات یا فلاح و بہبود وغیرہ جیسا کوئی معاملہ ہو۔ ہر طاقت ور سلطنت اپنا اخلاقی نظام خود بناتی ہے۔ ایسا نظام جس میں وقت پڑنے پر رنگ و نسل کے تعصب جیسے گمبھیر مسائل بھی جنم لے سکتے ہیں مگر اِن مسائل کا حل تلاش کرتے وقت یہ "جمہوریت پسند" حکمران محض محدود مفادات کو اور ذاتی اغراض کو ان مسائل پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ ہماری آپ کی کیا مجال جو لب کشائی کریں۔ یہی تو اُن کا اخلاقی نظم و نسق ہے جس میں طبقہ عالیہ کے روشن خیالات کے مطابق ملک کا وسیع تر مفاد پوشیدہ ہے۔ "دنیا میرے آگے" میں عالی عراق کے حوالے سے لکھتے ہیں

"سب سے بڑھ کر ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تیل کے چشموں پر سے انگریز کی بالا دستی ختم کر دی ہے!اور اب انگریزوں کو اپنے نفع میں عراقیوں کو بھی ان کے حق کے مطابق شریک کرنا پڑا ہے۔ ہاں یہ کہا جاتا ہے مگر ہم برِصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں کو اس پر یقین نہیں آتا۔ " بھولے عراقی " ہم سوچتے ہیں" پتا نہیں اِن کو حساب کتاب کے گھپلے میں کس نے پھنسا دیا! انگریز نے۔ انگریز بھلا یوں آسانی سے مرنے والی چیز ہے۔ انگریز آفتاب کی طرح لازوال ہے۔ انگریز امر ہے.......... پس یہ عراقی تو ہم سے بھی زیادہ پس ماندہ ہیں۔ ان کے وزیران کے افسر ہمارے وزیروں اور افسروں سے بہت کم تربیت یافتہ ہیں۔ پتا نہیں برطانوی وفد نے انہیں کیا کیا نقشے دکھائے ہونگے۔ بغداد میں آج بھی تمام تقریبات میں انگریز شرکا کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔" (۱۰)

عاؔلی نے اِس پوری صورتِ حال کا مشاہدہ ۱۹۶۰ء میں کیا تھا اور آج سن ۲۰۰۳ء میں عراق کی صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ بغداد سمیت عراق کے کئی علاقوں پر امریکہ کا قبضہ ہو چکا ہے۔ تیل پر سے اپنی بالا دستی کا خاتمہ انگریز کے لئے نا قابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے تمام شرائط اور معاہدات کو بالائے طاق رکھ کر فرعونیت کے نشے میں سرشار امریکہ نے عراقی بے گناہ عوام کے لہو کا خراج حاصل کیا محض اس لئے کہ اُسے تیل کے دولت سے مالا مال یہ خطّہ درکار تھا۔ ایک طرف امریکہ کے برخوردار اسرائیل کے ہاتھوں فلسطین کی زندگیاں عذاب ہیں دوسری جانب امریکہ کی شہہ پر بھارت برِ صغیر میں مظلوم کشمیریوں کا خون بہا رہا ہے۔ تو جناب! "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" امریکہ وہ طاقت ہے جس کے آگے اقوامِ متحدہ کی نہ چلی۔ ہم آپ کیا چیز ہیں۔ ہماری آپ کی حیثیت صرف تماشائی کی ہے۔ اور یہ حیثیت اُس وقت تک برقرار ہے جب تک ہم خود اِس تماشے کا حصّہ نہیں بنتے۔ یہ گفتگو سیاسی دائرے میں جا پہنچی ۔بات صرف اتنی ہے کہ عاؔلی کی پیش گوئی کام دکھا گئی۔ یہ تو معاملہ دیگر ممالک کا تھا مگر عاؔلی اپنے وطن کے حوالے سے کسی قسم کی پیش گوئی سے خائف ہیں اور ہونا بھی چاہئے۔ انہوں نے ملکی سطح پر آ کے ہر پہلو سے بہ نظرِ عمیق جائزہ لیا ہے اور وہ اپنی قوم کے مزاج سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قاری رو برو کبھی ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور کبھی مجسمہ فریاد بنتے ہیں۔ کہیں تو عاؔلی یہ کام غیر محسوس طور پر کر جاتے ہیں اور بات آگے بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن اکثر مقامات پر اُن کا اپنے قاری کے ساتھ رویہ نہایت تلخ ہو گیا۔ برطانیہ میں عظیم تحقیقی مراکز اور تاریخی جامعات اور کتب خانے دیکھ کر اُنہیں اپنی قوم کی تہی دامنی پر رونا آتا ہے مگر وہ اپنی کیفیت کو صاف چھپا جاتے ہیں۔ اور ایک شانِ بے نیازی سے اپنے قاری کو مخاطب کر کے یہی کہتے ہیں کہ

"چھوڑ یئے اِس دھندے کو، نہ آپ کو تعلیم سے دلچسپی ہے نہ مجھے ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر میں اور آپ چاہیں بھی تو تعلیم سے واقعی دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اسباب آپ کو معلوم ہیں۔ اس لئے چپکے سے آگے بڑھ جایئے۔" (۱۱) اِس کے بعد سرسری معلومات کے حامل جملے مل جاتے ہیں۔ کیا عاؔلی واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟ وہ در پردہ بہ زورِ تحریر عوام کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔

بہر حال ایک طرف تو عاؔلی کا یہ لا اُبالی رویہ قاری کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے مگر دوسری طرف یہ حالت ہے کہ روس میں عاؔلی نے ایک بڑے تاجر کی بڑی مونچھوں کا پورا پورا ناپ لے ڈالا اور لمبائی، چوڑائی، گہرائی، اونچائی اور جھکاؤ تمام سائز نوٹ بھی کر لئے۔ یہ عجیب تضاد ہے۔ اسی طرزِ اسلوب کا نام جمیل الدین عاؔلی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عاؔلی اکثر مقامات پر انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں اور جزئیات سے صرف نظر کر جاتے

ہیں مگر بغور مطالعے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ پورے سفر نامے میں عالؔی کو جا بجا انواع اقسام کے لوگ ملتے گئے جو کبھی عالؔی کو متاثر کر گئے اور کبھی عالؔی نے انہیں متاثر کیا لیکن عالؔی نے "دنیا میرے آگے" میں اگر کسی سے حقیقی دوستی نبھائی ہے تو وہ ہے اِن کا قاری انہوں نے سفر نامے کے تمام تقاضوں اور قاری کے مجموعی مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے بوقتِ ضرورت معلومات کے خزانے بھی لٹائے ہیں اور کہیں مصلحتاً قاری کو محروم بھی رکھتے ہیں ۔ عالؔی نے کئی بار اپنے قاری کو براہِ راست مخاطب کیا اور اِس دوران جو گفتگو کی اُس میں سلاست، روانی، بے ساختگی اور برجستگی ہی اُن کا وہ وصفِ خاص ہے جو پڑھنے والے کو ابتداء تا انتہا اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ عالؔی اس صلاحیت کے بل بوتے پر ایک عام قاری کے ذہن کو بھی قوتِ پرواز عطا کرتے ہیں اور پھر جہاں چاہتے ہیں لئے لئے اُڑتے ہیں۔

"تماشا میرے آگے"

بحیثیتِ سیاح جو تجربات و واقعات عالیؔ کے ساتھ جرمنی، اٹلی، ہالینڈ، سوئٹزر لینڈ اور امریکہ میں پیش آتے اُن پر مشتمل سفرنامہ "تماشا میرے آگے" پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ٹھیک دس سال بعد یعنی ۱۹۸۵ء اِس کی اشاعتِ سوم کا سال ہے۔

گو کہ یہ ایک علاحدہ کتاب ہے مگر دراصل "دنیا میرے آگے" سے پیوستہ یہ ایک اور سفری سلسلہ ہے۔ ناشرین نے قارئین کی سہولت کے لئے اسے دو جلدوں میں تقسیم کر دیا۔ یا پھر یوں کہا جا سکتا ہے کہ عالیؔ کی طویل سیاحت کی وزنی زنجیر کے دو حصے کر دیئے ایک کا نام "دنیا میرے آگے" اور دوسروں کا "تماشا میرے آگے" رکھا گیا۔ چونکہ زیرِ تبصرہ عالیؔ کا دوسرا سفرنامہ ایک لحاظ سے پہلے سفرنامے کی اگلی قسط ہے اِس لئے "تماشا میرے آگے" میں بھی عالیؔ بطور سیاح اُسی روپ میں جلوہ گر ہوئے یعنی جو شخصیت کی رعنائی، خوش خرامی اور روشن خیالی پہلے سیاحت نامے میں موجود تھی وہ یہاں بھی برقرار ہے۔ "دنیا میرے آگے" کا اختتام برطانیہ کی کہانی پر ہوا اور "تماشا میرے آگے" کا آغاز جرمنی سے ہوا ہے۔ عالیؔ نے برطانیہ سے جرمنی کا سفر بلا توقف کیا لہٰذا قاری کو اپنی جانب متوجہ رکھنے والے سیاحت اور تحریر کے تمام منفرد اجزاء و عناصر جنھوں نے عالیؔ کے سفرناموں کو بلند امتیاز عطا کیا، اُنہی اجزاء و عناصر کا تسلسل اپنی اعلیٰ روایات سمیت یہاں بھی دِکھائی دیتا ہے۔ میری مراد قومی اور مذہبی تشخص و اقدار سے ہے جن سے عالیؔ کا مضبوط روایتی رشتہ ہر جگہ قائم ہے۔ اب اگر ان معاملات کو مدِ نگاہ رکھ کے عالیؔ کے سفرنامے "تماشا میرے آگے" سے کوئی نیا تنقیدی پہلو تلاش کرنا چاہوں تو بڑی حد تک ناکامی ہوگی اِس کا واحد سبب یہی ہے کہ عالیؔ نہیں بدلے۔ دورانِ سفر کئی خطۂ زمین بدلے، آب و ہوا، ماحول، معاشرت، انسان، نظریات اور جغرافیہ بدلتا گیا مگر چونکہ عالیؔ کی شخصیت میں موجود سیاح کے اندر کسی نوعیت کا تغیر واقع نہیں ہوا اس لئے کچھ بدلا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔

وطن پرستی کے جذبات، شجرِ روایت کے ایک ایک برگ و بار سے محبت کا احساس اور جداگانہ قومی شناخت کے حامل اعلیٰ خیالات، انہی سے "تماشا میرے آگے" میں سفر جرمنی سے عالیؔ شروعات کرتے ہیں

عالی ہر منظر نامے کے تاریخی پسِ منظر میں ضرور جاتے ہیں۔

جدید ملک، جدید شہر اور جدید مظاہرات یہاں تک آنے میں ہر قوم ایک ارتقائی سفر طے کرتی ہے اور اس سفر میں وہ جن راہوں سے گزرتی ہے۔ عالی اپنی ذات کو بھی ماورائی طور پر انہی راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ یہاں پھر کٹھن مراحل بھی آتے ہیں۔ خونیں جنگوں کے واقعات ہیں۔ لہو سے لکھی داستانیں ہیں۔ جابر فاتح، ظالم حکمران، مجبور عوام اور عوام کا درد اپنے سینوں میں محسوس کرنے والے شاعر، ادیب اور فنکار۔ عالی ہر منظر کو دیکھتے ہیں، ماضی میں رونما ہونے والے قدیم واقعات میں اور اُس فضا میں خود کو اِس طرح سمو دیتے ہیں کہ پھر حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت اُن میں سما جاتی ہے۔ عالی اُس کیفیت کو ہر انداز سے محسوس کرتے ہیں۔ وہ گئے وقتوں کی ہر دلعزیز شخصیات اور ناپسندیدہ افراد سے بھی ملاقات کرتے ہیں۔ اُن کی عالی سے گفتگو بھی ہوتی ہے۔ عالی اُن سے اپنا ماضی الضمیر کہتے ہیں۔ ماضی کے پردے پر یکے بعد دیگر سے چلنے والی ہر فلم دیکھنے اور اُس کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ کردار سے ملنے کے بعد رفتہ رفتہ عالی کے قدم زمانہ حال کی طرف آتے ہیں۔

عالی کے نزدیک یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ تاریخی اوراق سے ظاہر ہونے والے سیاسی انقلابات، تہذیبی تغیرات اور دیگر سماجی تحریکات انسانی نفسیات پر کس طرح اثر انداز ہوئیں اور پھر یہی اجتماعی نفسیات تشکیل معاشرہ میں اپنا کردار کس طور ادا کرتی ہے۔ پھر عالی اپنی ایک اور عادت سے بھی مجبور ہیں۔ وہ تمام ممالک کے حالات کو پاکستان کے تناظر میں ضرور دیکھتے ہیں۔ خواہ اِس عمل کی انجام دہی میں انہیں کتنی ہی جہتوں میں سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔ رودادِ جرمنی کی ابتداء میں لکھتے ہیں۔

" کس جرمنی پر قناعت کی جائے۔ جب " آزاد " دنیا کا باشندہ جرمنی کہتا ہے تو اِس کی مراد مغربی جرمنی سے ہوتی ہے کمیونسٹ ملک کا آدمی جرمنی کے پہلے معنی مشرقی جرمنی سمجھتا ہے۔ بے چارہ جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ جیسے کشمیر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک تاریخ، ایک جغرافیائی وحدت اور پھر دو ملک اور دو حکومتیں! مغربی جرمنی میں مغربی قسم کی حکومت ہے اور مشرقی جرمنی میں مغربی قسم کی اشتراکیت ہے۔ اصل نقصان جرمنی کا ہے جو کٹ گیا ہے۔ اصل نقصان کشمیر کا ہے جو کاٹ دیا گیا ہے۔ (۱۲)

عالؔی نے جرمنی کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیر کی بات کی ۔ حالانکہ دیکھا جائے تو یہ اُس زمانے کی بات ہے جب پاکستان کے ساتھ بھی مشرقی اور مغربی قسم کی اصطلاحات استعمال ہوتی تھیں ۔ مگر جب عالؔی تہذیب، تاریخ، جغرافیہ اور حکومت جیسی وحدتوں کا ذکر کرتے ہیں تو پھر مشرقی اور مغربی پاکستان اس تعریف پر پورا نہیں اُترتے ۔ اس لئے یہاں کشمیر ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ جس کے ایک بڑے حصے پر بھارتی افواج کا جابرانہ تسلط ہے ۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان ایک بازو کی طرح کاٹ دیا گیا ۔ اور کیا معلوم

آگے آگے ہوتا ہے کیا

بہرکیف، جب جرمنی کا ذکر نکلے تو گوئٹے، نطشے، کارل مارکس کے ذکر کے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی بلکہ بڑھائی نہیں جاسکتی ۔ اپنے وطن کے یہ مایہ ناز فلسفی اور شعراء جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے عوام کو ایسے تصورِ حیات سے آگاہ کیا جس کے نتیجے میں پھر اس قوم نے دنیا پر چھائی ہوئی عظیم طاقتوں سے آنکھیں ملائیں ۔ جرمنی کو تمام عالمی سطح پر ایک اعلیٰ ترین نسل کے طور پر اُبھارنے میں علم و فن سے وابستہ ان شخصیات کا کردار بلاشبہ مثالی ہے ۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ عوامی طبقے میں انقلابی روح کو بیدار کرنے میں ادب، فلسفے اور علم کی دیگر شاخوں کا جو عمل دخل ہے اگر اس کی کوئی مثال ہے تو وہ جرمنی ہے ۔ ۱۹۶۱ء کے جرمنی کو دیکھ کر جب عالؔی اس ملک کا موازنہ اِس کی تاریخ سے کرتے ہیں تو اُن کا لہجہ بجھ جاتا ہے ۔ جس قوم کی کوئی جاندار تاریخ نہیں اور جس کا ماضی ایک معمولی درجے کا ماضی ہے اُس کا حال کس قدر طاقتور اور شاندار ہے ۔ اور جب عالؔی حسبِ عادت اپنے وطن کی فضا میں آتے ہیں تو یہ امر اُن کے لئے باعثِ ملال ہے کہ عظیم الشان ماضی کی حامل قوم عہدِ حاضر میں مائل بہ زوال ہے ۔ یقیناً عالؔی کے متاسف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ برصغیر میں ایک غلام قوم کا درد رکھنے والا عظیم شاعر پیدا ہوا تھا ۔ جس نے اپنے پیش کردہ تصورِ حیات کے ذریعے ایک نیم مردہ عوام کو جھنجھوڑنے کی سعی کی ۔ جس نے خوابیدہ افرادِ ملت کی غیرت کو جگانے کے لئے "قومِ رسولِ ہاشمی" کی ترکیب وضع کی ۔ اور ایک عالمگیر مذہب کے تناظر میں "فوق البشر" کا تصور بھی دیا جو کملیت اور جامعیت کے اعتبار سے نطشے کے پیش کئے گئے "فوق البشر" کے تصور سے کسی طرح کم نہیں ۔ مگر اِس انقلاب پرور شاعر کے کلام کا ایک بڑا حصہ عوام کے لئے ناقابلِ فہم بنادیا گیا ۔ نطشے اور گوئٹے کی آواز پر جرمن باشندے لبیک کہتے ہیں مگر اقبالؔ کی صدا محض ایک محدود طبقے میں گردش کر کے پلٹ آتی ہے ۔ لیکن کیا اقبالؔ کا یہ احسان کم ہے کہ

اُن کے نام کی وجہ سے آج بے شمار ادیبوں کے گھر کا چولہا جل رہا ہے اور دال روٹی کا خرچا نکل رہا ہے۔

شاید خیالات کی رو میں بہتے بہتے میں احاطۂ موضوع سے تجاوز کر گئی۔ تحریر کا موضوع تو عالؔی اور اُن کا سفرنامہ ''تماشا میرے آگے'' ہے لہٰذا انہیں کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ عالؔی کو نظر انداز کرنے کے معنی ہیں پاکستان کو نظر انداز کرنا۔ جس طرح گوئٹے، نطشے وغیرہ کے بغیر جرمنی کا تذکرہ ادھورا ہے بالکل اسی طرح پاکستان پر گفتگو کے وقت اقبالؔ، حفیظؔ، جوشؔ اور عالؔی کا ذکر ناگزیر ہے۔ عالؔی اپنے دل کی بات کہنے میں مہارت رکھتے ہیں ذہن میں چکر لگانے والے، خیالات کو وہ جس خوبی سے باہر لاتے ہیں وہ ہر کس وناکس کے اختیار میں نہیں اِس ضمن میں عالؔی کا وہ مکالمہ خاص دلچسپی واہمیت کا حامل ہے جو ہٹلر کے ساتھ ہوا۔ جی ہاں! عالؔی نے ہٹلر سے بڑے بے باک انداز میں گفتگو کی۔ اور اِس طرح عالؔی نے اِس ستم ایجاد شخص کے گھناؤنے اور سفاک کردار کی حقیقت بیان کر دی۔ عالؔی نے یہیں اکتفا نہیں کیا بلکہ اِس مکالمے کی آڑ میں تاریخ کا ایک ایک صفحہ کھول دیتے ہیں جن میں فی الاصل قاری کے لئے حقائق کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے۔ عالؔی جرمن عوام کے ذہن میں ہٹلر کے حوالے سے قائم شدہ منفی تصور اور ناپسندیدہ رائے پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ہٹلر اور عالؔی کے درمیان جو بھی گفتگو ہوئی اُس کے ذریعے عالؔی نے انتہائی دلکشی کے ساتھ فکر کے کئی زاویے عطا کر دیئے۔

عالؔی کا یہ سفرنامہ اسی شد و مد کے ساتھ عقل کو حیران اور روح کو پریشان کر دینے والے تجربات و سانحات لئے آگے بڑھتا ہے۔ ویسے قاری کو بھی پریشان کرنا عالؔی کو اچھی طرح آتا ہے۔ عالؔی نے کئی اشاعت گھر دیکھے مگر قاری کو نہیں دکھائے فلسفے پر بات کرتے کرتے ایک دَم خاموش ہو جاتے ہیں۔ عالؔی غالباً ایسے قارئین کو کبھی فراموش نہیں کرتے جو بھولی بھالی ذہنیت اور سیدھے سادھے طرزِ زندگی کے قائل ہیں۔ اگر وہ یونیورسٹیوں اور اشاعت گھروں کی بحث میں اُلجھ جائیں یا فلسفیانہ گفتگو کے پُل باندھنے لگیں تو یہ معاملہ معصوم قاری کی طبعِ نازک پر بارِ گراں ثابت ہوگا۔ عالؔی کو معلوم ہے کہ پھر اس طرح اِن سفرناموں کا حلقۂ قارئین سکڑ سمٹ کر شاید آدھا بھی باقی نہ رہے۔ چنانچہ وہ نہایت فطری انداز سے سلیس اور رواں باتیں کہتے ہیں۔ عالؔی اُن موضوعات کو دانستہ نہیں چھیڑتے جو ایک عام ذہنی سطح سے بلند ہو۔ مگر ایک طبقہ ایسا بھی تو ہے جسے فلسفے سے لگاؤ بھی ہے اور وہ اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتا ہے اور انہی امور پر عالؔی کی شانِ استغناد دیکھ کر اِس طبقے کا قاری عجیب شش و پنج میں پڑ جاتا ہے۔ اُسے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ یہاں عالؔی مطالعہ کرنے

والے کے مزاج کا لحاظ کر رہے ہیں یا وہ عالی کی مرضی کا پابند ہے۔

عالی کا موڈ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ انہوں نے جامعات اور پریس کو نظر انداز کر دیا مگر اٹلی میں جوتے کی صنعت پر نہایت تفصیلی معلومات فراہم کر دیتے ہیں بلکہ جوتوں کی آڑ میں وہ اُن گل اندام، نازنینانِ پری تمثال لڑکیوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو اِن فیکٹریوں میں کام کر رہی ہیں اور جنہیں موچن کہتے ہوئے عالی کو بڑی تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ عالی کے سفرناموں کو پڑھتے وقت اُن کا ذوق جمالیات بھی کافی متوجہ کرتا ہے۔ یہ ذوق ان لڑکیوں اور خواتین کے حوالے سے واضح ہوتا ہے جو عالی کو ہر جگہ ہر ملک میں بطور ساتھی سیاح یا بطور گائیڈ ملتی رہیں۔ عالی کے سفرناموں میں لڑکی کا ذکر اِس کثرت سے ملتا ہے کہ اگر لڑکی منظر سے تھوڑی دیر کے لئے بھی ہٹ جائے تو قاری بوکھلا جاتا ہے اور عالی کے اپنے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں چنانچہ ایسی ہی صورتحال کے پیش نظر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اتنی دیر سے کسی لڑکی وڑکی کا ذکر بھی نہیں آیا ہے۔
سفرنامے کا زور کم ہو رہا ہے۔ یار عالی صاحب، ذرا پھر
وہی چٹ پٹا کام شروع ہو جائے۔ قسم ہے بڑا مزا آتا ہے۔" (۱۳)

معاملہ اصل میں کچھ یوں ہے کہ مصنف اور وہ بھی عالی جیسے مصنف کی تحریریں بڑی حد تک یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق قاری کا ذہن بنا دیتے ہیں۔ عالی کے سفرناموں میں واقعی کوئی ایک خاتون یا لڑکی ہر حال میں دکھائی دیتی ہے یہ اُن کے سفرناموں کا جزوِ خاص ہے۔ ورنہ اگر صرف سفرنامے کے لوازمات یا فنی محاسن پر بات کی جائے تو یہ کوئی شرطِ لازم نہیں۔ آخر ابنِ انشا بھی ملک ملک کی سیر کرتے ہیں اور کسی زنانہ وجود یا نسوانی آواز کے بغیر ہی قاری کو خوش کر دیتے ہیں اور بہت زیادہ خوش کر دیتے ہیں۔ البتہ کچھ عرصے سے پاکستان کے سفرناموں کی فضا میں اُن کے مصنفین شعوری طور پر عورت کے وجود کو اِس صنفِ ادب کا لازمی جزو بنا رہے ہیں اور یہ کوئی خاص قابلِ تحسین فعل نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں عورت ہر جگہ ہے تو پھر سفرناموں میں اِس کے وجود سے انکار کیوں؟ تو اِس کا جواب بھی کچھ یوں ہے کہ عورت تو وہ حقیقت ہے جس کے وجود سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہے۔ مگر رنگ مقدس بھی ہوتے ہیں اور عالی لڑکی کے ذکر کو اپنے سفرنامے میں چٹ پٹا کام کہتے ہیں جس میں اُن کو بڑا مزا آتا ہے۔ معلوم نہیں کیا

مزا آ تا ہے۔ ورنہ سفرنامے کے مخصوص ماحول کو سامنے رکھ کر پڑھنے والے کو بشیر فرجو اور کبوتر وف کے ساتھ بھی بہت مزا آتا ہے اور اِن میں سے کبوتر وف صاحب تو نہایت دلچسپ انسان ہیں۔

اب اگر یہاں اُن عورتوں پر بات ہو جنہوں نے یورپی ممالک میں حیا سوزی کا بازار گرم کر رکھا ہے تو میرے نزدیک یہ محض الفاظ کا زیاں ہوگا کیونکہ عالی کے گزشتہ سفرنامے "دنیا میرے آگے" میں اِس حوالے سے کچھ گفتگو تو ہو چکی ہے اور یوں بھی دنیا کے سفرنامے اِس نوعیت کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں لہذا اسی موضوع پر اگر مزید دفتر سیاہ کروں تو یقیناً کوئی نیا پہلو ہاتھ نہیں آئے گا۔ البتہ جب عالی امریکہ کو ایک الگ زاویے سے دیکھنے کے لئے وہاں پہنچے تو ایک نشے کی عادی عورت سے عالی کی بڑی عجیب ملاقات ہوئی اور عالی کو ایک نہایت سنسنی خیز تجربہ بھی حاصل ہوا۔ منشیات کے پست اور گھناؤنے کاروبار نے دنیا کی عظیم طاقتوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور اِن ممالک کی نئی نسلیں اِس کاروبار کے ہاتھوں مر رہی ہیں مگر وہاں کے اربابِ اختیار خاموش ہیں۔ اُن کی یہ خاموشی اِن معاشروں میں کام کرنے والی مافیا کے ساتھ ایک طرح کا تعاون ہے۔ منشیات کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تیسری دنیا کے لئے ہمدردی رکھنے والے انسان دوست طبقے کو یقیناً یہ علم بھی ہوگا کہ یہ عظیم ممالک بھی اِس لعنت سے محفوظ نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ دنیا میں منشیات کی بنیاد فراہم کرنے کی اصل ذمہ دار بھی یہی ہیں۔ جب اِن ممالک کے حوالے سے انسانی اور اخلاقی علمبرداری کے پردے میں ہونے والے واقعات ایسے سفرناموں کے توسط سے ایک دم بے نقاب ہوں تو واقعی بڑا لطف آتا ہے۔

عالی دنیا کے نقشے پر رونما ہونے والے حیرت ناک انقلابات کو ایک مخصوص دیدۂ عبرت سے دیکھتے ہیں یہ صلاحیت ہر ایک کے پاس نہیں ہوتی۔ کسی بھی انقلاب یا اچانک پیش آنے والی تبدیلی کا بھی ایک وسیع پس منظر ہوتا ہے۔ سطحی مشاہدہ کرنے والے اِس پسِ منظر کی کوئی بھی جھلک دیکھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اپنے اِس سفرنامے کے ذریعے عالی مئے غفلت کے نشے میں سرمست معاشروں سے مخاطب ہیں:

"دنیا بھر نے سمجھ لیا کہ نیرو ختم ہو گیا تو اِس کے ساتھ بانسری بھی ختم ہو گئی، حالانکہ میں اِس بانسری اس گٹار کی آواز برابر سن رہا ہوں۔ سبھی کانوں والے سن رہے ہیں اور نہ جانے کب تک سنتے رہیں گے ....
میں پوری ذمہ داری کے ساتھ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے مشرق مغرب شمال جنوب یعنی دنیا کی چاروں سمتوں میں شعلے بھڑکتے دیکھے اور نیرو کی بانسری بھی سنی بلکہ گٹار بھی سنا، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ شعلے آج بھی زندہ

ہیں وہ بانسری آج بھی بج رہی ہے۔ اس گٹار کی دلخراش آواز آج بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ نیرومر گیا۔ ختم ہوگیا مگر اِس کی بانسری زندہ ہے اس کا گٹار زندہ ہے اس کے لگائے ہوئے شعلے بھڑک رہے ہیں اور نہ جانے کب بجھیں گے۔" (۱۴)

پتہ نہیں ہماری قوم کو اپنی خوش قسمتی پر کب یقین آئے گا۔ خوش قسمتی سے مراد یہ کہ ابھی ہمارے معاشرے میں وہ لوگ زندہ ہیں جو سروں پر منڈلانے والے خطرات سے ہمیں پیش از وقت آگاہ تو کررہے ہیں۔ اب اِس مقام پر عالؔی آنکھ والوں کے بجائے کان والوں سے مخاطب ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو بانسری کی آواز یا قیامتِ صغریٰ سے قبل پھونکے جانے والے صور کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ جب ہندوستان کی اعلیٰ ثقافتی مسلم ریاستوں میں تباہی کا آغاز ہوا تو اُس عہد کے نوابین اور طبقہ حکمران نہ صرف بانسری بجا رہے تھے بلکہ رقص وسرور کی پوری محفلیں سجائے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ اُس وقت تک بے خبر رہے جب تک سماج میں بھڑکنے والے شعلے اِن کے درباروں اور محلات تک نہ پہنچ گئے۔ انجام کار یہ کہ وہاں مسلمانوں کا تمدنی، تہذیبی، مذہبی، علمی اور تاریخی تشخص جل کر راکھ ہوگیا۔ آج بھی اِس خاکستر میں کچھ ایسی چنگاریاں بدستور باقی ہیں جنہیں بھارت کے شرانگیز عوام وقتاً فوقتاً تعصب کی ہوا دے کر بھڑکاتے ہیں۔ عرب دنیا میں تباہی کا شعلہ اُس وقت بلند ہوا جب وہاں کے امیروں اور رئیسوں نے علیحدہ علیحدہ مملکتوں کا خواب دیکھا۔ آج یہ فلک بوس شعلے پورے عرب کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں مگر نہ کسی کو دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی بانسری کی آواز پر کوئی کان دھرتا ہے۔

فی الحقیقت عالؔی ایک ایسے سچے اور کھرے وطن پرست انسان ہیں جن کو اگر فکر ہے تو صرف پاکستان کی وہ بانسری کے ہلکے ہلکے سروں کو محسوس کررہے ہیں اور اُنہیں تباہ کن شعلوں کی حرارت کا بھی احساس ہے۔ یہاں اِس تحریر میں عالؔی بیداری کا وہ پیغام دے رہے ہیں جس کو اگر عملاً قبول نہ کیا گیا تو پھر مستقبل میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اُس پر کچھ تحریر کرنے کے لئے الگ موضوع اور بڑا وقت درکار ہے۔ عالؔی نے مستقبل کے اندیشوں کو جس طرح قلمبند کیا ہے اس سے اِن کی تحریر میں جھلکنے والی آفاقیت سے انکار نہیں۔ عالؔی جیسے محبِ وطن اور ملکی قدروں کے ترجمان ہر جگہ ہر قوم میں ہوتے ہیں مگر ہمارے معاشرے میں اِن جیسے افراد کی صورتحال آٹے میں نمک کے مترادف ہے۔ عالؔی جذبہ حب الوطنی سے وابستہ اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جس

میں سرسیّد، حالّی، اقبالؔ، فیضؔ اور جوشؔ کا نام آتا ہے۔ البتہ حالی کے اِن دو سفرناموں "دنیا میرے آگے"، "تماشا میرے آگے" کے مکمل مطالعے کے بعد حالّی کے جن افکار، نظریات اور خیالات کا نچوڑ حاصل ہوا وہ یہی ہے۔

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں، شاید اُنہیں جگا دے

"آئس لینڈ"

حقیقی ماحول سے آراستہ اور رومان پرور فضا سے مزین عالی کا تیسرا سفرنامہ "آئس لینڈ" دسمبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اشاعت کے اعتبار سے چونکہ ابھی اِس میں تازگی کی خو موجود ہے اِس لئے عالی کا یہ جوہرِ فن اپنی منفرد آب و تاب کے سبب دنیائے اردو ادب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جب سے اُردو ادب میں تنقید و تحقیق کا باب کُھلا ہے اُسی وقت سے ہمارے ہاں اولیت کے تمغے پہنانے کی ایک رسم چل پڑی ہے اور جیسے جیسے دائرہ تنقید و تحقیق میں وسعت آتی چلی گئی ویسے ویسے یہ معاملات متنازع بھی بنتے گئے۔ لیکن اس وقت گفتگو کا محور عالی کا جدید سفرنامہ آئس لینڈ ہے اور اِس کے متعلق محققین اور ناقدین کو یہ رائے قائم کرنے میں یقیناً کوئی کلام نہیں کہ انگلستان کے شمال میں واقع اِس خطہء ارض کے پہلے اُردو سفرنامہ نگار جمیل الدین عالی ہیں۔

"آئس لینڈ" اُردو کے سفریاتی ادب میں حقائق سے معمور عالی کا وہ سفرنامہ ہے جس کے توسط سے ہم ایک اجنبی ماحول، انجانی تاریخ، بیگانی تہذیب، ناآشنا سیاسی احوال اور غیر مانوس جغرافیائی مناظر سے ایک دَم آگاہ ہو جاتے ہیں۔ یہ قصہ ۱۹۷۸ء کا ہے جب عالی نیشنل بینک آف پاکستان میں ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ تھے اور ایک تربیتی منصوبے کے سلسلے میں نیویارک جاتے ہوئے انہوں نے اتفاقاً ریکاوک میں قیام کیا جو آئس لینڈ کا صدر مقام ہے۔ وطن واپسی پر عالی نے اِس سرزمین سے وابستہ بہت سی یادداشتیں سپردِ قلم کیں۔ مختلف شخصیات کے مجبور کرنے پر عالی نے پندرہ بیس دن میں پورا سفرنامہ لکھ ڈالا۔ مگر پے در پے کچھ ایسے حادثات اور واقعات رونما ہوتے چلے گئے کہ سفرنامے کی اشاعت کا معاملہ ایک طویل تعطّل کا شکار ہو گیا ۱۹۸۳ء میں کراچی میں ہونے والی شدید بارشوں کے سلسلے نے آئس لینڈ سمیت کئی ممالک کے سفرناموں کے مسودات کو تباہ کر دیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب عالی ڈیفنس سوسائٹی میں رہائش پذیر تھے بے تحاشا بارش کے نتیجے میں آنے والے سیلاب نے ان کے گھر کو بُری طرح متاثر کیا اور گھر کا وہ حصہ بھی زد میں آیا جہاں عالی کا کتب خانہ تھا۔ یہاں اُن کی کئی اہم تحریریں، دستاویزات، مسودات اور کاغذات وغیرہ موجود تھے۔ اِس حادثے نے عالی کو کافی مایوس کر دیا اور آئس لینڈ کی اشاعت کے سلسلے میں وہ بے یقینی کا شکار ہو گئے۔ گو کہ عالی

۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہو گئے مگر ذاتی اور سرکاری مصروفیات نے دامن پھر بھی نہ چھوڑا۔ مشاعروں اور مذاکروں کے لئے دیگر ممالک کے دورے بھی جاری رہے۔ نوے کی دہائی میں آپ کو بھی چند ایسی محبت کرنے والی ہستیاں ملیں جنھوں نے عالی کی ہمّت بندھائی۔ ادھر عالی نے بھی جگرِ لخت لخت کو جمع کیا اور یوں اِس سفرنامے کا طویل حصّہ ۱۹۹۷ء میں "معاصر" کے سالنامے میں شائع ہوا۔ عالی کی بے پایاں مصروفیاتِ زندگی اور عارضہ قلب جیسی تلخ حقیقت اِس سفرنامے کو مرتب شکل میں دینے میں بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ۱۹۹۹ء میں پارلیمان معطّل ہوئی تو عالی کی سرکاری مصروفیات کا خاتمہ تو ہو گیا مگر ادبی شہرت کے باعث ابھی وہ فرصت و فراغت حاصل نہ ہوئی کہ وہ اِس سفرنامے کی طرف مکمل توجہ کرتے۔ ۲۰۰۰ء میں ہونے والے دوسرے حملۂ قلب نے ایک بار پھر آپ کی ہمت کو بُری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ مگر اِن تمام سانحات کے باوجود چند احباب کی بے پناہ خواہش پر عالی نے حوصلہ پکڑا اور اِس سفرنامے کی تمام اقساط اور مسودے کو یکجا کیا گیا بالآخر ۲۰۰۱ء میں یہ "آئس لینڈ" کے نام سے منظرِ عام پر آ گیا۔ اِس طویل تمہید کو باندھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ وہ جواز سامنے آئیں جو پہلے ذہن میں سوال بن کر چکر لگاتے ہیں۔ یعنی ۱۹۷۸ء میں عالی نے جو سفر کیا وہ ۲۰۰۱ء میں تحریری شکل اختیار کرتا ہے۔ آخر اِس سفر اور تصنیف کے درمیان تیئس سال کا عرصہ کیوں حائل رہا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اِس دوران کوئی اور آئس لینڈ کا سفر کرتا واپسی پر فی الفور اپنے تجربات قلمبند کرتا اور نہایت شان سے اولیت کے باب پر اپنے نام کی تختی نصب کر دیتا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ عالی کی روایتی بے نیازی کے باوجود اُردو ادب کے سفرناموں میں "آئس لینڈ" کے حوالے سے یہ پہلا کارنامہ ہے جو عالی نے انجام دیا۔

بالائی سطور میں تمام گفتگو اِس سفرنامے کی اشاعت کے ذیل میں ہوئی اب اِس سفرنامے کے متن پر بھی کچھ بات ہو جائے! سچائی تو یہ ہے کہ یہ سفرنامہ گوناگوں رموز و اسرار کے رنگا رنگ انکشافات کی وسیع دنیا ہے۔ سفر میں عالی کے قدم اور تحریر میں عالی کا قلم ایک ایسی مناسب رفتار سے بڑھتے ہیں کہ دورانِ مطالعہ ہر شخص آئس لینڈ کے منکشف ہونے والے ہر خفیہ راز کی مسحور کن کیفیت میں جذب ہو جاتا ہے۔ قاری کا ہاتھ تھامے تھامے چلنا عالی کے سفرناموں کی وہ وصفِ خاص ہے جو اُن سے کہیں الگ دکھائی نہیں دیتا۔

"آئس لینڈ" پاکستانی قارئینِ ادب کے لئے عالی کا بیش بہا تحفہ ہے وہ اس لئے کہ عالی نے اِس کی خاطر انتھک محنت کی، تمام حادثات اور مسلسل بیماری کے باوجود عالی نے اِس سفرنامے کو اُسی جانفشانی، اثر

آفرینی اور شدتِ جذبات کے ساتھ لکھا جو اُن کے گزشتہ سفرناموں کا طرۂ امتیاز تھے۔

اگر عالؔی کے پچھلے دو سفرناموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے "آئس لینڈ" کا مطالعہ کیا جائے تو سیاحتی اور تحریری لحاظ سے عالؔی کے روایتی لوازمات یہاں بھی قائم ہیں۔ رواں اور آسان فہم اندازِ گفتگو، مختصر اور دلچسپ مکالمے، الفاظ کا وسیع ذخیرہ اور اُن کا دلکش استعمال، قوتِ مشاہدہ، تجزیاتی صلاحیت، معلومات کا اُمڈتا دریا غرض ہر طرح کا عنصر یہاں کارفرما ہے۔ البتہ ایک واضح تبدیلی جو محض سرسری مطالعے کے بعد بھی محسوس کی جاسکتی ہے وہ عالؔی کی پاکستانیت کے حوالے سے ہے۔ یہ عالؔی کے لئے ایسا سامانِ سفر تھا جسے انہوں نے اپنے پچھلے سفرناموں میں اِس حد تک استعمال کرلیا کہ یہاں آئس لینڈ آنے تک اِس میں بڑی کمی واقع ہوگئی۔ حب الوطنی کے جذبات، اُن کی اثر آفرینی اور حرارت میں وہ شدت انگیزی نظر نہیں آتی۔ شاید یہ آئس لینڈ کی سرد آب وہوا اور برفانی ماحول کا اثر تھا کہ قاری کو عالؔی کی وطن پرستی واضح طور پر ٹھنڈی محسوس ہوتی ہے۔ کسی بھی مقام پر پہنچ کر عالؔی وہاں کی سیاسی فضا، تمدنی وعہدِ دینی عناصر، معاشی عروج وزوال اور دیگر سماجی پہلوؤں کا ہر زاویے سے جائزہ لے کر عادتاً اُس کا موازنہ اپنے وطن کے انہی پہلوؤں سے کرتے تھے مگر عالؔی کا یہ انداز آئس لینڈ میں دھیما ہے۔ یہاں پر نہ وہ اپنی زبان کے ضمن میں مزاحمتی رویہ اختیار کرتے ہیں اور نہ لباس کی مد میں کوئی فخر وندامت کا اظہار ہے اِس کے برعکس عالؔی آئس لینڈ میں دو دن مقیم رہے اور اِس دوران انہوں نے وہاں کے افراد کو اپنی قیمتی انگریزی لباس سے خوب متاثر کیا اور گلے اور سینے پر سجائی ہوئی بیش قیمت ٹائی کا ذکر وہ بار بار کر کے لاشعوری طور پر قاری کو بھی مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا معاملہ ہے تو اِس سفرنامے کے مکمل مطالعے کے بعد جب میں نے یونہی اِس میں تحریر انگریزی الفاظ کی فہرست بنائی تو یہ کافی طویل ہوگئی اِن میں سے کچھ پیشِ خدمت ہیں۔ اَن ٹیلنٹڈ، فِکس، سوواٹ، ڈِس کریڈیو، شاک، ورژن، ڈسپلن، ڈرائنگ روم، نان سینس، کامپلیکس، رُوڈنس وغیرہ عہدِ حاضر میں پاکستان کے ادیب اِس طرح کے الفاظ کا گفتگو میں استعمال معیوب نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اس طرزِ گفتگو کو آج کا پاکستانی لب ولہجہ قرار دیتے ہیں جس کے لئے ساسیور (ماہرِ لسانیات) نے Synchronic کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک کسی بھی معاشرے میں دو طبقے ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ خواص اور دوسرا طبقہ عوام۔ خواص اور عوام کا ہر فعل اُنہیں زندگی کی ہر سطح پر ایک دوسرے سے علیحدہ رکھتا ہے۔ یہی سلسلہ لب ولہجے کے ساتھ بھی ہے۔ جسے آج کا خالص

پاکستانی لب ولہجہ کہا جا رہا ہے وہ طبقۂ عام کے لئے تو ٹھیک ہے مگر طبقہ خواص میں ایک دائرۂ ادب بھی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون کس کی زبان بولے گا۔ ادیب قاری کی سطح پر آ کے اُسی کی طرح بات کرے گا یا پھر عوام اور قارئین میں ایک ایسی زبان کو فروغ دے گا جسے جداگانہ شناخت کہتے ہیں۔ بالفرض اگر ادیب کو چند درجے نیچے اُتر کے قاری تک آتا ہے تو پھر عالی کے اُن تمام پیغامات کے کیا معنی تھے جو انہوں نے اپنے پچھلے سفرناموں میں دیئے۔ غیر ممالک میں اُردو کی تشویشناک صورتِ حال، اِس زبان کے مٹتے نقوش کی طرف توجہ دلانا اِس کی مسخ شدہ شکل کی نشاندہی کرنا، زبان کے زوال اور فنا پر پریشانی کا اظہار یہ سب عالی کے گزشتہ دو سفرناموں میں بار بار عیاں ہے۔ مگر اب "آئس لینڈ" میں انگریزی الفاظ کا یہ بے محابا استعمال کیا مطلب رکھتا ہے۔

عالی کے انداز میں اتنی بڑی تبدیلی کیوں اور کیسے آئی؟ یہ کہنا انتہائی نامناسب ہوگا کہ عالی نے سماج میں پروان چڑھنے والے منفی حالات کا اثر قبول کرلیا ہے اور یہ بات بھی درست نہیں کہ کوئی امید افزا صورت نہ دیکھتے ہوئے قنوطیت اور یاسیت عالی پر حاوی ہوگئیں۔ یہ کیوں اور کیسے کا قطعی اور یقینی جواب تلاش کرنا فی الحال ناممکن ہے۔ مگر اب اُردو کی بقا و اصلاح کے سلسلے میں صورتحال مزید پریشان کن معلوم ہوتی ہے۔

جب ذکر لب و لہجے کا چل پڑا ہے تو "آئس لینڈ" میں اسی لحاظ سے ایک اور بڑا واضح فرق محسوس ہوا۔ وہ یہ کہ اِس سفرنامے کے اندر سے عالی کا طنزیہ لہجہ، جملوں کی زہرناکی، گفتگو کی نشتریت اور حق گوئی کی تلخی ایک دم غائب ہوگئی۔ اصل میں یہاں پر وہ پاکستانی آن بان رکھنے والے عالی بھی نظر نہیں آتے جو بار بار اپنے معاشرے کے ظلمت کدوں سے باہر آ کر قاری کے دل پر جملوں کی کاٹ سے زخم پر زخم لگاتے ہیں۔ اِس کے برعکس "آئس لینڈ" میں عالی بڑے سیدھے سبھاؤ طریقے سے بات کرتے ہیں۔ یوں بھی اِس سفرنامے میں بیانیہ اسلوب کی فضا بہت کم ہے اور زیادہ تر معاملہ مکالمات کے ذریعے طے پاتا ہے۔ عالی کی یہ دلچسپ مکالمہ نویسی ہی درحقیقت اِس سفرنامے کی انفرادیت ہے۔ اِس کے علاوہ وہ رنگا رنگ کردار جن کی ملاقات گاہے بہ گاہے عالی سے ہوتی رہی اور اِس ملاقاتوں کے حوالے سے جو بھی عجیب تجربات پیش آئے وہ عالی نے سفرنامے کے توسط سے اپنے قاری کو سنائے۔ مگر سفرناموں کے رواج کے مطابق یہاں فوقیت پھر خواتین کے کردار ہی کو حاصل ہے۔ عالی کے سفرناموں میں مردوں کے داخل ہونے کا ایک دروازہ ہے تو خواتین کے

لئے چارہیں۔ یہ حقیقت ہمیں عاؔلی کے تینوں سفرنامے پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو جاتی ہے کہ اگر ایک جگہ بہت سارے مرد اور خواتین موجود ہوں تو عاؔلی دوستی کے لئے ہمیشہ خاتون کو ترجیح دیں گے۔ اور وہ خاتون بھی عاؔلی کے امیرانہ ٹھاٹھ باٹ سے فوراً متاثر دکھائی دے گی۔ اُن کا قیمتی کپڑے سے تیار لباس اور سلک کی ٹائی کی طرف بار بار عورت کی نگاہ جائے گی اور یہاں تک کہ ایک معمولی چیلنج پر عاؔلی کے اندر کا نواب زادہ اور مغل بچہ جاگ اُٹھتا ہے اور وہ حاتم طائی کی قبر پر لات مار کے فیاضی کے نمونے پیش کرنے لگتے ہیں۔ عاؔلی کے اِس سفرنامے کے اندر زنانہ کردار گزشتہ سفرناموں کے زنانہ کرداروں سے زیادہ طاقت ور اور پُر اثر معلوم ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے سید مظہر جمیل لکھتے ہیں:

"اِس سفرنامے کے نسوانی کردار اتنے زندہ، حقیقی اور فطری ہیں کہ ہم اِن سے کسی جعلی رومان کی توقع نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کردار اور اِن کرداروں کا سارا بیان اس سفرنامے میں جس طرح آتا ہے وہ بے حد جاذبیت رکھنے کے باوجود ہمارے اندر کسی طرح کے ارزل و اسفل جذبات کو ہرگز نہیں اُبھارتا۔" (۱۵) شاید بلکہ یقیناً عاؔلی یہ سمجھتے ہیں کہ ایک عام ذہنی سطح کے قاری کے لئے نسوانی کرداروں اور آوازوں کا شمول سفرنامے کو خاصا دلچسپ بنا دیتا ہے۔ میں نے پہلے ہی لکھ چکی ہوں کہ عاؔلی شعوری طور پر ایسے موضوعات سے خود کو الگ رکھتے ہیں جو ایک عمومی ذہنیت سے بالاتر ہوں۔ وہ قاری کا ہاتھ نہیں چھوڑنا چاہتے۔ مگر پھر بھی اِس سفرنامے میں وہ جہاں وقت کا فلسفہ بیان کرتے وہاں ایک فلسفیانہ دماغ کے لئے تو غالباً توجہ اور دلچسپی کا سامان ہے مگر یہ معاملہ اتنا طویل چلا گیا ہے کہ عام قاری بوکھلا جاتا ہے۔ گو کہ زبان سادہ و سلیس ہے مگر فلسفیانہ مباحث و معاملات سے عام ذہنی سطح کے قاری کا خاص تعلق نہیں۔ اگر عاؔلی یہی انداز اپنے ہر سفرنامے میں اختیار کرتے تو انہیں سلہٹ سے چاٹگام تک اُردو پڑھنے والے مجمع لگا کر نہ پڑھواتے نہ سنتے۔

بظاہر عاؔلی آئس لینڈ کی دو چیزوں سے بڑے متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک وہاں کے عوام اور دوسرے اُن کا ادبی اثاثہ "ساگا"۔ تو چلئے پہلے عوام کی بات ہو جائے۔ عاؔلی کو آئس لینڈ کی عوام میں وہی جانفشانی، حب الوطنی، احساسِ ذمہ داری اور خودداری دکھائی دی جو کسی بھی ترقی یافتہ قوم کی خاصیت ہیں یہاں نہ جنگلات ہیں، نہ صنعت، نہ زراعت اور نہ جابجا فیکٹریاں اور کارخانے، اِن کی معشیت کی گردش کا دارومدار صرف ماہی

گیری پر ہے۔ ملک کی آبادی سوا دو لاکھ کے قریب ہے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں ان میں بسنے والے محنت کش افراد نہایت خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جو لاوے اور برف کے سنگم سے بنے ہوئے خطہ زمین پر صدیوں سے آباد ہیں اِس عرصے میں کئی بار پہاڑوں سے اُگلتے لاوے اور برستی آگ نے اپنے آس پاس کی بستیوں کو اُجاڑ کر رکھ دیا۔ مگر وہاں کی قوم اِن آسمانی کیفیات کو ذہنی طور پر قبول کرتی ہے اور اپنے مکانوں سے نکل کر لاوے کو تباہی پھیلانے کا پورا موقع فراہم کرتی ہے۔ جب وہ اپنا غصہ مکمل طور پر نکال کے ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو یہی لوگ بڑے قرینے سے کدال اور پھاوڑں کی مدد سے لاوے کی پتلی مگر سخت تہہ کو توڑتے اور ہٹاتے ہیں۔ اور ایک بڑا حصہ لاوے میں سے بالکل درست حالت میں برآمد ہو جاتا ہے۔ عالی یہ تفصیلات اُس وقت فراہم کرتے ہیں جب انہوں نے آئس لینڈ میں ۱۹۷۳ء میں پھٹنے والے ایک آتش فشاں کی فلم دیکھی۔ یہاں دراصل وہ آئس لینڈ کی عوام کے نظم وضبط کے اور کڑی آزمائش میں سے کامیاب گزرنے پر بڑے قائل نظر آئے اور پھر ایسے مقامات پر وہ اپنے عوام کو بڑے پیار سے بھائیو اور بہنو کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور بین السطور اسی نظم وضبط کی خاموش نصیحت کر جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ اِس سفرنامے میں عالی نے ایک طنز، نشتریت اور تلخی سے کنارہ کر کے اپنے لہجے میں اپنی قوم کے لئے محبت کی چاشنی پیدا کر لی ہے۔ عالی کا خیال یہی ہے کہ شاید یہ ترکیب کارگر ثابت ہو جائے۔ گویا وہ اصلاح چاہتے ہیں مگر "آئس لینڈ" میں اِس امر کا باقاعدہ اظہار نہیں ہے۔ ایک مقام پر وہ خود کہتے ہیں۔

"مجھے اپنے ابتدائی سفر یاد آنے لگے۔ میں تقریر کرنے لگتا تھا۔ انڈیا اور پاکستان کا فرق بتاتا تھا۔ پاکستان کی تحریکِ آزادی کا حال سُناتا تھا۔ وہ حب الوطنی کا شاہ کار ہوتی تھیں، اب میں حب الوطنی اور حب الوطنی مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ خود وطن میں میری حب الوطنی کا مذاق اڑتا ہے۔" (۱۶)

جمیل الدین عالی جہاں بھی گئے وہاں اُس ملک کے ادبی ورثے اور اُس کی تاریخی اہمیت سے انہوں نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور اِس امر میں ہمیشہ عالی کے ادبی ذوق نے ہی مہمیز کا کام کیا۔ آئس لینڈ میں بھی انہوں نے وہاں کے نہایت اہم ادبی وتاریخی اثاثے "ساگا" کے حوالے سے بڑی معلومات حاصل کی اور یہ معلومات "آئس لینڈ" میں اتنے مفصل انداز میں مِل جاتی ہے کہ کلاسیکی ادب سے وابستگی رکھنے والا شخص بڑا لطف اُٹھاتا ہے۔ اور عالی نے معلومات کے لعل وجواہر بھی انوکھے انداز سے بکھیرے ہیں یعنی اِس ضمن میں

انہوں نے بیانیہ اسلوب کے بجائے مکالماتی انداز سے قاری کے دل و دماغ میں بات بٹھائی ہے۔ اور یہ مکالمہ عالؔی اور کارل صاحب کے مابین ہوا۔ کارؔل ایک دلچسپ آدمی ہیں جو ایک سرکاری محکمے کے چھوٹے سے افسر ہیں مگر "ساگا" کے متعلق وہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ یہ آئس لینڈ کی وہ لوک منظوم داستانیں ہیں جو بہادری اور جوانمردی کے کارناموں سے آراستہ ہیں۔ آئس لینڈ کے ذریعے عالؔی ساگا کے حوالے سے قاری کا دامن وافر علم سے بھر دیتے ہیں اور اِس کا اندازہ یہ سفرنامہ پڑھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ساگا سے دلچسپی کا اصل محرک عالؔی کا ادیب ہونا ہے اور اِس سلسلے میں ڈاکٹر ظفر اقبال رقمطراز ہیں۔

"عالؔی کا ادبی ہمزاد بھی جب آئس لینڈ گیا تو اِس نے وہاں کے نسبتاً کم معروف ادب ساگا اور ایڈا کو نہ صرف پاکستانی ادیب کی نگاہ سے دیکھا بلکہ اُردو داں طبقے سے اس کا بہترین تعارف کرایا اور اِس پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ ساگا اور ایڈا ادب سے متعلق ان کے بیانات کتاب کے مختلف حصوں پر پھیلے ہوئے ہیں اور قاری کو اس سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے پوری کتاب پڑھنا پڑتی ہے تب کہیں جا کے آئس لینڈ کے ادب کا ایک خاکہ ذہن میں بیٹھتا ہے۔ دراصل اِس عمل میں بھی عالؔی صاحب کی ادبی فنکاری جھلک مار رہی ہے، اگر وہ ساگا ادب کے متعلق تمام معلومات اور اپنے تجزیے ایک جگہ جمع کر دیتے تو وہ ایک مقالے کی صورت اختیار کر لیتا جو سفرنامے کی بنیادی روح کو متاثر کرتا، لہذا عالؔی نے ایک وسیع، قدیم، غیر معروف اور ان چھوے ادب کا تعارف کرانے میں جھلکیوں کی ٹیکنیک سے کام لیا ہے۔" (۱۷)

غرض کہ "آئس لینڈ" عالؔی کا وہ سفرنامہ ہے جس سے عالؔی کی غرض و غایت محض یہ نہیں کہ ایک اجنبی دنیا کے گوشے گوشے کو قاری کے روبرو آشکار کر دیا جائے اور جغرافیائی سیر و سیاحت سے دِل بہلا دیا جائے، بلکہ وہ یہاں ایسے بصیرت افروز مقامات اور مظاہرات دکھاتے ہیں جس سے ان گنت سنجیدہ، دلچسپ، عمیق، فکری اور نظریاتی زاویے عطا ہوتے ہیں۔ حیرت انگیز حقائق سے معمور آئس لینڈ کی یہ طویل داستان عالؔی کے اِس سرزمین پر دو دن کے قیام کے نتیجے میں جنم لیتی ہے اِس داستان میں عالؔی کا کردار ایک ایسے عاشق کا ہے جسے پہاڑوں، آتش فشانوں، گلیشیرز، وادیوں، آبشاروں، ندیوں، آبادیوں اور ان میں بسنے والے رنگا رنگ انسانوں سے عشق ہے۔ یہ تمام مظاہرات اپنے ہیرو اور عاشق کو اچھی طرح جانتے ہیں اور کُھل کر دعوتِ نظارہ دیتے ہیں بالخصوص آگ اور برف کے امتزاج سے بنی تضادات کی اس سرزمین کے عجائبات کو عالؔی نے جس

سحر انگیزی اور تحیر خیزی سے قلمبند کیا ہے اس کا پڑھنے کے بعد ہی صحیح لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔

عالی نے اپنے تینوں سفرناموں کے مجموعی مزاج کو سفرنامے کے بنیادی ڈھانچے کو ملحوظ رکھتے ہوئے تشکیل دیا ہے۔ سفرنامہ صنفِ ادب کی کسی ایسی شاخ سے تعلق نہیں رکھتا جس میں ادیب اپنے تخیل کی آمیزش سے کوئی افسانوی ماحول پیدا کر دے اور پڑھنے والے کے لئے دلآویز بنا دے۔ یہ تو جغرافیہ، سیاست، سماج، تمدن، تاریخ اور تہذیب جیسے اجزاء کا وہ مرکب ہے جسے قاری کے لئے دلچسپ بنانا بڑا دشوار عمل ہے اور عالی اس دشوار عمل سے بلکہ آگ کے دریا سے کمال خوبی اور کامرانی سے گزر گئے۔

عالی کی تحریر اور اسلوب بے تکلفی، بے ساختگی، برجستگی، بذلہ سنجی، شوخی و ظرافت اور بے باک و روشن دماغی جیسے لوازمات سے مزین ہے۔ بات کہنے کا یہ وہ طریقہ ہے جس کے استعمال سے قاری کچی ڈور سے عالی کی جانب بے اختیار کھنچا چلا آتا ہے اور انتہائی قریب آنے پر اجنبت اور بے گانگی کی فضا ایک دم عنقا ہو جاتی ہے۔ پھر عالی اور قاری ہاتھ میں ہاتھ دیئے دیس دیس کی سیر کرتے ہیں۔ عالی دوراز کار معلومات سے حتیٰ الامکان پرہیز کرتے ہیں البتہ کہیں کہیں وہ تقریر کے موڈ میں آجاتے ہیں اور بحث مباحثے میں فلسفے کو بھی داخل کرتے ہیں مگر جونہی اُنہیں قاری کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے نکلتا محسوس ہوتا ہے وہ فوراً پینترا بدلتے ہیں اور قاری کا ہاتھ ایک بار پھر مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔

خارجیت اور داخلیت کی ملی جلی کیفیت عالی کے سفرناموں میں ایک مخصوص معیار کے طور پر دکھائی دیتی ہے۔ خارجی اور داخلی ماحول کو عالی اِس طرح شیر و شکر کرتے ہیں کہ اِس امتزاج سے جنم لینے والا حسن سفرناموں کے ایک ایک صفحے سے صاف عیاں ہوتا ہے۔ یہ معیار یہ حسن قاری کی روح میں قطرہ قطرہ کر کے اُتر جانے کی انتہائی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور پھر ظاہر و باطن میں ہونے والی ہلچل میں وہ عالی کا برابر کا شریک بن جاتا ہے۔ یہ ہلچل ایک معمولی درخت کو دیکھ بھی عمل میں آسکتی ہے جو ملٹن نے لگایا۔ اور اسی ہلچل کا محرک وہ عظیم الشان اہرام اور ابوالہول بھی ہو سکتے ہیں جو فرعون نے تعمیر کروائے۔

عالی کی مشرقیت، پاکستانیت اور مذہبیت بھی وقت پڑنے پر ایسے ہتھیاروں کا کام کرتے ہیں جن کے ذریعے عالی اپنے پڑھنے والے کا دل فتح کر لیتے ہیں حتیٰ کے قاری کے پورے وجود پر اُن کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ اِن ہتھیاروں کا استعمال "دنیا میرے آگے" اور "تماشا میرے آگے" میں وہ بڑے پیشہ

وارانہ اور فنکارانہ انداز سے کرتے ہیں مگر " آئس لینڈ " تک آتے آتے جذبات کی آنچ کافی دھیمی پڑ گئی اور میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ اِس صورتحال کا توباقاعدہ جواز تلاش کرنا فی الحال ناممکن ہے۔

عالؔی کے سفرناموں کا حقیقی حظ اُٹھانے کے لئے جب ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو انہی کے ذریعے ہم عالؔی سے بھی ملاقات کرتے ہیں جو ایک انسان دوست آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کسی بھی ملک کی سیاحت پر کمر باندھیں مگر وہ سب سے پہلے ایک ایسے انسان کو تلاش کرتے ہیں جو بلاہچکچاہٹ عالؔی کے روبرو اپنے معاشرے کے منفی اور مثبت گوشوں کو ظاہر کر دے۔ عالؔی اِس حقیقت کے معترف بھی ہیں کہ سماج ایک ایسے دریا کی مانند ہے جس میں متنوع مخلوق آباد ہے۔ ہر کوئی اپنے طور پر زندگی بسر کرتا ہے۔ عالؔی نے ہر ملک کے انسانوں کو نفسیات کی کسوٹی پر پرکھا اور معاشرے میں ہر مکتبہ فکر سے متعلق انسانوں کے اُس کردار پر بھی روشنی ڈالی جو وہ تشکیلِ معاشرہ میں ادا کر رہے ہیں۔

مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ عالؔی کی رنگارنگ اور ہمہ جہت طبعیت نے اُن کے سفرناموں کو بھی اُن کی شخصیت کا ہو بہو ترجمان بنا دیا ہے۔ سفرناموں کے مطالعے کے بعد ہم عالؔی کی جس شخصیت سے متعارف ہوتا ہے اُس پر کچھ تحریر کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

حواشی

(۱) (دنیائے ادب: عالمی نمبر صفحہ نمبر ۶۷۰
(۲) دنیا میرے آگے: صفحہ نمبر ۱۹۷
(۳) دنیا میرے آگے: صفحہ نمبر ۱۸۵
(۴) دنیا میرے آگے: ص ۳۸
(۵) دنیا میرے آگے: ص ۵۲
(۶) دنیا میرے آگے: ص ۵۲
(۷) دنیائے ادب : عالمی نمبر ص ۶۸۲
(۸) دنیا میرے آگے: ص ۵۲
(۹) دنیا میرے آگے: ص ۳۰۰
(۱۰) دنیا میرے آگے: ص ۴۹
(۱۱) دنیا میرے آگے: ص ۳۱۲
(۱۲) تماشا میرے آگے: ص ۱۷
(۱۳) تماشا میرے آگے: ص ۲۱
(۱۴) تماشا میرے آگے: ص
(۱۵) کتابی سلسلہ "مکالمہ" مارچ ۲۰۰۳ء کراچی، ص ۵۳۱
(۱۶) آئس لینڈ: ص ۲۰
(۱۷) ماہ نامہ "صریر" کراچی، اگست ۲۰۰۲ء ص ۶۱

حرفِ چند

جمیل الدین عالی کی ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کا ایک منفرد رخ ایسا ہے جو اعلیٰ تفکر اور بدر جہا بلند علمیت کے اشتراک سے تشکیل پاتا ہے۔ فی زمانہ دنیائے فکر وفن میں عالی کے علمی مقام سے کون واقف نہیں لیکن اُن کے ذوقِ علم و آگہی کا اگر صحیح معنوں میں ادراک مقصود ہو تو پھر عالی کی عالمانہ شخصیت کو پرکھنے اور سمجھنے کے تقاضے یکسر بدل جاتے ہیں۔ اِس کے لئے، اوّل تو شعروادب کی وہ مخصوص عینک اُتارنی پڑے گی جس کی مدد سے ہم اکثر عالی کو سرتاپا بغور دیکھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اب عالی کا مطالعہ اُن وسیع و عمیق نظروں سے ہوگا جو عالی کی ذات کے حوالے سے بالکل مختلف زاویہ عطا کرتی ہیں اِس مرحلے کو طے کرنے کے بعد عالی کا وجود ایک ایسے دانشور کے روپ میں جلوہ ہوتا ہے جسے بیک وقت کئی موضوعات پر دسترس حاصل ہے۔ تاریخ، جمالیات، سیاسیات، معاشیات، ادب اور مذہب یہ تمام علوم اسی احاطہء دسترس میں آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ تحریر زبان کا عکس ہے۔ مگر اسی چیز کو اگر وسیع تر مناظر میں دیکھیں تو تحریر جس انسان کی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہوتی ہے اُسی انسان کے مزاج کا عکس بھی بن جاتی ہے اور کبھی کبھی تو ہر نوع کے احساسات، جذبات، خیالات، نظریات اور افکار غرض حیاتِ کامل کے ایک ایک گوشے کی بہترین ترجمانی صاحبِ تصنیف کی تحریروں سے ممکن ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ جمیل الدین عالی اور "حرفِ چند" کے درمیان موجود ہے۔

انتہائی جفاکشی، سخت کوشی اور مدو جزرِ واقعات سے بھرپور زندگی نے عالی کے خیالات میں بھی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اور اب عارضہء قلب جیسی تلخ صداقت اُن کے وجود کا لازمہ بن چکی ہے اِن حالات کے پیشِ نظر کئی بار عالی کے دل و دماغ میں بہنے والی خیال کی ایک رَو نے اُنہیں قلم اور گوناگوں مصروفیات سے ترکِ تعلق کا مشورہ دیا۔ عالی کے لئے یہ مشورہ خوش آئند بھی تھا اور قابلِ قبول بھی مگر انہوں نے حیاتِ پُر آشوب کے طویل ماہ و سال جن خطوط پر گزارے اُن سے یکسر سبکدوش ہو جانا شاید عالی، کے بس میں نہ تھا اور پھر جہاں ایک صاحبِ علم کا رشتہ ایک بار قلم سے مضبوط ہو جائے تو محض موت ہی اِس رشتے کو منقطع کر سکتی ہے ورنہ عالی جیسی غیر معمولی ہستیاں عارضہء قلب اور دیگر معاملاتِ روزگار کو یوں آسانی سے خاطر میں نہیں لاتیں، جبکہ لکھنے پڑھنے کا ذوق و شوق تو ایسے نشے کی مانند ہے، جس کا اگر ایک بار چسکا پڑ جائے تو

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

والی کیفیت سامنے آتی ہے۔لہذا عالی جیسے انسان کے نزدیک زندگی کے معمولی وغیر معمولی نشیب وفراز کے روبرو آسانی سے گھٹنے ٹکا دینا چہ معنی دارد؟

"حرفے چند" عالی کے قلم سے مضبوط ربط تعلق کی وہ طاقتور اسناد ہیں جن سے اُن کے مطالعے کی وسعت، تجزیاتی نگاہ اور قوتِ مشاہدہ کی بھرپور صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی دیگر نگارشات کی طرح تبصرہ نگاری کے بھی مردِ میدان ہیں۔ اِس باب میں جمیل الدین عالی نے شجرِ علم سے پھوٹنے والی ہر شاخ پر خامہ فرسائی کی اور دورانِ تبصرہ ممکنہ معلومات وآ گاہی کے دوش بدوش وہ کسی بھی تصنیف کے متعلق نئے نئے پہلو بھی اُجاگر کرتے گئے ہیں۔ بلاشبہ عالی کی یہ تحریریں اتنی جاندار ہیں کہ زیرِ بحث کتاب، شخصیت یا موضوع اپنی تمام ترجہات واوصاف کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہیں آ کر قاری کا ذوق بھی اسے مجبور کرنے لگتا ہے کہ وہ ان تمام تبصروں سے قطع نظر خود اِن تحقیقات، تخلیقات اور شخصیات کے حوالے سے مطالعہ کر کے اپنی معلومات کی دنیا وسیع کرے، گویا جمیل الدین عالی کی یہ تبصرہ نویسی ہمارے اندر ذوقِ آ گہی کو تحریک دیتی ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وفات (۱۹۶۱) کے بعد اُن خوابوں کی تعبیر دھندلی ہوتی ہوئی محسوس کی گئی جو انجمن ترقی اُردو کے تابناک مستقبل کے ضمن میں دیکھے گئے تھے۔ مولوی عبدالحق نے خطے میں اُردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے اپنے آخری سانس تک اِس بے لوث جذبے، انتہائی خلوص اور بھرپور وفا کے ساتھ خدمات انجام دیں کہ انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق ایک ہی وجود کے دونام قرار پائے۔ اِس صورتحال میں مولوی عبدالحق کی وفات کسی سانحے سے کم نہ تھی اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوا۔ انجمن پے درپے کئی مشکلات کا شکار ہوئی۔ جن میں سے کچھ کا آغاز مولوی صاحب کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ انجمن کو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کرنے والے گروہ کی سازش اور گرتی ہوئی مالی ساکھ علمی اور ادبی کاموں میں حارج تھیں۔ بابائے اُردو نے اِن تمام حالات کو ایک کتابچے "انجمن ترقی اُردو کا المیہ" میں مفصل تحریر کیا ہے۔ اور عالی جو اِن مشکلات کا مقابلہ کرنے میں بابائے اُردو کی معاونت اور رفاقت میں سرگرم تھے انہوں نے بھی وقتاً فوقتاً اپنے مقدمات میں اِس دور پر گفتگو کی ہے۔

عالی نے ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی اُردو کے معتمدِ اعزازی کا عہدہ سنبھالا۔ انہوں نے جس تحرک اور

فعالیت سے اپنے اِس سفر کا آغاز کیا تھا وہ سفر آج بھی اُسی تن دہی اور مستعدی سے جاری وساری ہے۔ انتہائی محدود مالی وسائل کے باوصف عالؔی نے انجمن کے تحت شائع ہونے والی مطبوعات اور تصانیف کی رفتار اور معیار میں کمی نہ آنے دی۔ یہی نہیں بلکہ ہر اشاعت پر اُن کے مقدمے اِس امر کی دلیل ہیں کہ انجمن کی شائع کردہ کتابوں میں موجود مختلف النوع موضوعات پر اُن کی نظریں نہایت گہری ہیں عالؔی نے ہمیشہ "حرفے چند" کے عنوان سے کتابوں پر مقدمہ نگاری کی۔ اِن مقدمات کی نوعیت بھی الگ الگ تھی، تحقیقی، تنقیدی، تعارفی، معلوماتی غرض موضوع اور کتاب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُنہوں نے اپنے مقدموں میں مختلف انداز اختیار کئے۔ اس طرح اب اِن مقدمات کی تعداد اڑھائی سو سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ چونکہ علمی اعتبار سے اِن مقدموں کی اعلیٰ ساخت میں کسی کو کلام نہیں لہٰذا انجمن ہی کے زیرِ اہتمام اِن تمام مقدمات کو اب کتابی شکل دی ہے جو ہر صاحبِ ذوق پر ایک طرح کا احسان بھی کہا جاسکتا ہے۔ اِن مقدمات کی روشنی میں انجمن کی سو سالہ علمی و ادبی تاریخ کے تعین میں بڑی مدد بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مقدمات کی کثیر تعداد کے پیشِ نظر اس مجموعے کو تین جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اِن تین کتابوں کے عنوانات بھی "حرفے چند" مقرر کئے گئے اور ان پر دیباچہ عالؔی کے رفیقِ کار مشفق خواجہ نے اِس انداز سے تحریر کیا کہ دنیائے علم و ادب میں "حرفے چند" کی تاریخی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔

"حرفے چند" جلدِ اوّل کا سالِ اشاعت ۱۹۸۸ء ہے۔ جلد دوم ۱۹۹۳ء میں منظرِ عام پر آئی جبکہ جلد سوئم ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ موضوعات کے اعتبار سے اِن مقدمات کی ضخامت بھی مختلف ہے۔ نو کی تعداد میں مقدمات کی ضخامت دس یا اُس سے زیادہ صفحات پر محیط ہے۔ طویل ترین مقدمہ چوبیس صفحات کا ہے اور کہیں کہیں جمیل الدین عالؔی نے جامعیت اور اختصار کو اپناتے ہوئے ایک ڈیڑھ صفحے پر اپنے اظہار کو مکمل کیا ہے۔ شاعری کے حوالے سے قدیم متون اور مخطوطات کی فہرستیں بھی نوٹو صفحوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں حرفے چند عالؔی کی علمی ہمہ گیری کا بے مثال اور اعلیٰ نمونہ ہیں بچوں کے ادب سے لے کر دیگر علاقائی زبانوں کا ادب، تراجم، لغات، اقبالیات، غالبیات اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات تک تمام موضوعات عالؔی کی تنقیدی توانائیوں اور تحقیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ عالؔی کی تبصرہ نویسی پر عبدالعزیز ساحر نے اپنے انداز سے نگاہ ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

"حرفِ چند میں علمی اور تحقیقی امتیاز کا جو معیار ظاہر ہوا ہے، وہ دراصل تاریخ اور ماحول کے اس تانے بانے کا مظہر ہے جو آفاقی قدروں کی تلاش سے عبارت ہے۔ انسانی تہذیب کا تدریجی ارتقاء انسانی شناسی کے اس اجتماعی شعور کی زین ہے جو حال کے قافلے کو مستقبل کا ہم رکاب بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ تہذیبی رویے جو عصری تاریخ سے نا آشنا ہوتے ہیں، ان کی مرکزیت کی فکری نمو رُک جاتی ہے......... مثنوی" کدم راؤ پدم راؤ" کے مقدمے کو "ابنِ انشاء۔ احوال و آثار" کے مقدماتی جدول سے ملا کر پڑھیئے تو فکری اساس کی اس ارتقائی صورت کا اندازہ ہوتا ہے جو اسلوب اور موضوع کی عمومیت کو شخصی اور ذاتی واردات سے دور نہیں جانے دیتی۔ اس طرح تخلیقی نوعیت اور فکری کیفیت محدود اور لامحدود کے درمیان ایک سنگم بن جاتی ہے"۔(۱)

بلاشبہ عالی کا تنقیدی شعور، تاریخ، فلسفے، مذہب اور فنونِ لطیفہ جیسے تمام اعلیٰ وارفع علوم سے مملو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریریں موضوعات سے ہٹ کر انسانی تہذیب کے رویوں اور دیگر سماجی عوامل کی جھلک بھی دکھاتی ہیں۔ ذہنِ انسانی کی ذرخیز زمین سے نمو پانے والے ہر علم کا بڑا محرک افرادِ معاشرہ کی اجتماعی نفسیات کے علاوہ تمدّن و روایات کا وہ سلسلہ ہے جس کی درست تفہیم کے لئے تاریخی شعور کا پختہ ہونا نہایت اہم ہے اور عالی اِس معاملے میں یکتا ہیں۔ ڈاکٹر ریاض الحسن کے مقالے "جمالیات اور اردو ادب" کے ذیل میں انہوں نے جو مقدمہ تحریر کیا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ محض چار صفحات پر عالی نے علمِ فلسفہ کی اِس اہم شاخ پر اپنے تبصرے میں انتہائی جامعیت کے ساتھ تاریخ کے اُن ابواب پر روشنی ڈالی ہے جن کی مدد سے جمالیات نے اُردو ادب میں رواج پایا۔ عالی لکھتے ہیں کہ

"اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جمالیات کو ایک جداگانہ فلسفہ کی حیثیت حاصل ہوئی اور کروچے تک آتے آتے جمالیات کے کتنے ہی نظریات مرتب ہو گئے۔ ڈاکٹر ریاض الحسن مرحوم نے اس خطبے میں بتایا ہے کہ عربوں نے ارسطو اور افلاطون کے فلسفے سے تو بے شک استفادہ کیا لیکن ان کے جمالیاتی افکار کی پیروی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی ادب میں ہمارے محدود علم کی حد تک جو دوسری زبانوں کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، جمالیات سے متعلق کوئی علیحدہ قابلِ قدر تصنیف معروف نہیں۔ اسی طرح فارسی ادبیات میں بھی اٹھارویں اور انیسویں صدی تک جمالیات ایک علیحدہ مضمون کے طور پر کہیں نظر نہیں آتی..... فارسی اور اُردو کے شعراء کے کلام میں حسنِ حقیقی اور حسنِ مجازی کا ذکر ملتا ہے۔ اس کا تعلق مغرب کے جمالیاتی افکار و نظریات سے نہیں،

بنکہ الہٰیات سے ہے۔ با الفاظِ دیگران شعراء کی جمالیات اسلامی تہذیب کے تصورِ حقیقت کے تابع اور اس سے ماخوذ ہے۔" (۲)

جمیل الدین عالیؔ نے "حرفِ چند" میں دورانِ تبصرہ جو سیر حاصل، پُرمغز اور تحقیق پر مبنی گفتگو کی ہے وہ دراصل بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری کے سلسلے کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جس نے عالیؔ کو بابائے اُردو کی اعلیٰ اور بے مثال کاوشوں کا امین بنا دیا ہے۔ چار دہائیاں گزرنے کے بعد بھی عالیؔ مقدمہ نویسی کی روایت کو بے لوث جذبے، جفاکشی اور خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں۔ عالیؔ کو بابائے اُردو کی جانشینی کا جو اعزاز و شرف حاصل ہوا ہے بلاشبہ وہ اس کے حقدار بھی تھے۔ انہوں نے ہر محقق، مصنف اور مقالہ نگار کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کو تحفظ دینے کی بڑی بھاری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے رکھی ہے۔ یہ بات بلا جھجک کہی جاسکتی ہے کہ جس بلند سطح پر آکے آج عالیؔ یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں دنیائے اُردو ادب میں شاید ہی کوئی اور دوسری شخصیت ہو جو اِن معاملات کے ساتھ پورا پورا انصاف کر پائے۔ یہ عالیؔ ہی کی شخصیت ہے جن کا قلم ہر علمی اثاثے کی بھرپور نگرانی کر رہا ہے۔ جمیل الدین عالیؔ کی مقدمہ نگاری کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مشفق خواجہ تحریر کرتے ہیں کہ

"اگر کوئی شخص گزشتہ پچیس سال کے علمی، ادبی، اور تحقیقی رجحانات کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کے لئے " حرفِ چند "ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِن دیباچوں میں اُردو ادب کی ربع صدی کی تاریخ بڑے سلیقے اور اہتمام سے بیان ہوئی ہے۔ انجمن کی مطبوعات میں ادب کی تاریخیں، تحقیقی مقالے، ادبی تنقید، مخطوطات کی توضیحی فہرستیں، حوالے کی کتابیں دکنیات، قدیم متون، لغات، فلسفیانہ افکار و مسائل، ثقافتی دید و دریافت، علاقائی ادب سب کچھ شامل ہے۔ " حرفِ چند " کے مشمولات انہیں مباحث کے حوالے سے قلم بند ہوئے ہیں۔ اور اِن تمام موضوعات کی وضاحت کرتے ہیں۔" (۳)

جمیل الدین عالیؔ کے مقدمات میں رسمی انداز دِکھائی نہیں دیتا۔ اِن تحریروں کی غرض و غایت محض یہ نہیں کہ موضوع اور مصنف کا تعارف قاری کو حاصل ہو جائے اور سطحی طرزِ تحریر سے مصنف کے ساتھ روابط و تعلقات کا حق بھی ادا ہو جائے۔ اِس صورتحال کے برعکس عالیؔ نے دیباچہ نگاری میں جو اجزاء و عناصر برتے ہیں اُن کی وجہ سے یہ ایک ایسی صنف قرار پا گئی جس کے اپنے فنی لوازمات اور محاسن ہیں۔ عالیؔ کے مقدمات کو

تاریخی استنادیوں بھی حاصل ہے کہ انہوں نے کسی بھی موضوع یا مصنف پر بہ زبانِ قلم بات کرتے ہوئے بذاتِ خود بھی تحقیقی اصولوں کو کارفرما رکھا اسی وجہ سے دورانِ مطالعہ ہمیں موضوع اور تصنیف کے طاقتور اور روشن پہلوؤں کے ساتھ خامیاں اور تاریک گوشے بھی عالی کے دیباچوں اور مقدموں میں جابجا نظر آتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں کوئی بھی تبصرہ نگار اپنے قاری کو کسی بھی نوعیت کی علمی و ادبی کتاب کے حوالے سے گہرا اور پختہ تنقیدی شعور عطا کرتا ہے۔ بحیثیت مقدمہ نگار جمیل الدین عالی کی بلاشبہ یہ ایک بڑی کامیابی ہے کہ اُن کے تبصرے قاری کو جداگانہ اور منفرد زاویۂ نگاہ عطا کرتے ہیں۔ اسی زاویۂ نگاہ کو بنیاد بنا کر قاری اپنے معیارات متعین کرتا ہے جن پر وہ بوقتِ مطالعہ کسی بھی تصنیف کو اس کی اچھائیوں برائیوں سمیت پرکھتا ہے۔ مقدمات میں یہ عالی کا وہ اسلوبِ تحریر ہے جو بہت کم کسی کے حصے میں آتا ہے مگر عالی اِس معاملے میں مالا مال دِکھائی دیتے ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق درحقیقت عالی کو مقدمہ نگاری کا جو بارِ امانت سونپ گئے تھے، عالی اب بڑی دیانت داری سے سبکدوش ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ تقسیم ہندوستان سے قبل نامساعد سماجی حالات اور پے در پے جنم لینے والی انقلاب پرور تحریکوں کو عالی نے محض تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ مولوی عبدالحق جو خود مختلف تحریکات کے سرگرم رُکن رہے اُن کی معیت اور سرپرستی میں ذمہ داریاں انجام دینے کا نتیجہ یہی نکلا کہ عالی خود بھی اِن حالات و تحرکات سے متاثر ہوئے۔ اُن کے عالمانہ اور ادیبانہ شعور کی پرداخت میں مدوجزرِ زمانہ اور عصری ناہمواریوں کا بڑا کردار ہے۔ عالی ایک مردِ ہوشمند، فعال اور باعمل شخصیت کے مالک ہیں۔ عبرت ناک سانحات، ناقابلِ یقین واقعات اور تلخ تجربات نے گو کہ عالی کے باطن اور روح کو بُری طرح زخمی بھی کیا مگر وجود کے اندر موجود شخصیت کی عمارت میں ہونے والی اِس شکست و ریخت نے اُنہیں زندگی کے نئے حقائق سے روشناس کرا دیا۔ نئے نظریات، افکار اور خیالات کی مدد سے شخصیت میں تعمیر ہونے والی نئی عمارت جو پہلے سے زیادہ پُر شکوہ اور مضبوط ثابت ہوئی اُس نے عالی کے علمی اور ادبی معاملات پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ عالی کی مقدمہ نگاری میں یہ کیفیت کہیں اجمالی اور کہیں تفصیلی انداز سے نظر آتی ہے۔ "حرفے چند" میں عالی کے کچھ ایسے جذبات کی آمیزش ہے جس میں حب الوطنی، اُردو زبان کی ترقی و ترویج کی خواہش، فروغ علم و ادب کی تمنا اور بھی کچھ شامل ہے۔ عالی نے اپنے مقدمات میں

اکثر جگہوں پر نہایت بلیغ اشارات کے ذریعے واضح کردیا ہے کہ اُردو کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ فرقہ واریت اور نسل پرستی و تعصب ہے لہذا اکثر مقامات پر وہ ملّی یک جہتی اور قومی اتحاد کی تحریری کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ فریضہ بڑی بے خوفی، بے باکی اور جراتمندی سے انجام دیا ہے۔

عالی کا طرزِ تحریر وہی ہے جسے عام طور پر سیدھے سبھاؤ بات کرنا کہتے ہیں۔ کسی بھی موضوع، شخصیت یا اشاعت کے ضمن میں خزینہء معلومات کے جو وافر ذخیرے عالی کی دسترس میں ہیں اُنہیں دوسروں تک پہنچانے کے لئے آسان، قابلِ فہم اور سادہ لفظیات کو آلہ کار بناتے ہوئے دِل کی بات دِل میں بٹھائی ہے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مباحث کو نہایت سلجھے ہوئے انداز سے بیان کر کے اُسے قاری کے لئے دلچسپ بنا دیا۔ بے جا لفاظی، رنگین بیانی، مبہم اور دشوار جملوں سے آراستہ تحریر کی یوں بھی مقدمہ نگاری اور تبصرہ نویسی میں کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا عالی کے دیباچوں کو سمجھنے اور جملوں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے قاری کو بے جا ذہنی مشقت سے کام نہیں لینا پڑتا۔ لکھت میں روانی سلامت اور سہل پسندی ہونے کی وجہ سے "حرفِ چند" کا مطالعہ صحیح لطف دے جاتا ہے۔

"عالی صاحب اگر چہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ لیکن ان کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل نہیں ہے۔ شاعر عام طور پر نثر لکھتے ہیں تو شعر کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے حالانکہ نثر کا مقصد توضیح و تشریح، تحلیل اور تجزیہ ہے۔ عالی صاحب کی نثر میں یہ سارے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کا نثری اسلوب سلیس، رواں دواں اور تشریحی انداز کا حامل ہے۔ بات کو سمجھانا، خیال کو پوری طرح واضح کرنا، موثر اور دلنشیں پیرایہ اختیار کرنا، عالی صاحب کی نثر ان عناصر سے مملو ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی نثر پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا ایک واضح، مضبوط اور مستحکم شخصیت کا حامل ہے۔" (۴)

انجمن سے وابستگی بعد کا قصہ ہے۔ اس سے چند سال قبل جمیل الدین عالی نے پاکستان رائٹرز گلڈ نامی ایک ایسے ادارے کی بنیاد رکھی جس نے ملک بھر کے تمام ادیبوں کو مضبوط پلیٹ فارم فراہم کیا۔ متنوع نظریات اور ہمہ رنگ خیالات کے حامل پاکستانی ادباء کی سماجی حیثیت و اہمیت کو عالی نے اسی ادارے کے توسط سے پورے معاشرے میں منوایا۔ اس سلسلے میں اُن کو کئی دشواریوں سے سابقہ پڑا مگر اِس اہم اور بڑے مقصد کی راہ میں اُٹھنے والے کسی قدم میں لغزش پیدا نہ ہو پائی۔ عالی نے یہ فرض ایک عبادت کی طرح ادا کیا۔ درحقیقت یہ

کوئی معمولی کام نہ تھا، عالی نے اپنے عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہر چیلنج کا جس طرح مردانہ وار مقابلہ کیا اُس کی داستان تحریر کرنے کے لئے الگ موضوع درکار ہے البتہ اِس ثقافتی ادارے کے قیام سے ایک اور اہم مقصد عالی کے ہاتھ آیا اور اُنھوں نے اِس میں کامیابی حاصل کی۔ پاکستانی ادب کے ہر اہم میلان و رجحان سے عالی کو نہایت زبردست اور گہری آگہی عطا ہوئی۔ اِن حالات میں ادب اور دیگر علوم کے دلچسپ سِرے عالی کے ہاتھ آتے گئے اور پھر اُن کے ذوقِ تحقیق و جستجو نے واقفیت و علمیت کے کئی در روشن کئے۔ اِس پوری کیفیت نے "حرفے چند" میں عالی کی تحریروں کو اُن جواہر بیش بہا کا روپ عطا کر دیا جن کے ایک ایک گوشے سے فکر و تدبر کی چمک پیدا ہو کر نظروں کو خیرہ کر رہی ہے۔ جمیل الدین عالی کی مدبرانہ، مفکرانہ اور معتبرانہ سوچ کی تشکیل میں گلڈ کا بڑا کردار ہے۔ گلڈ سے دلی و دماغی وابستگی کا اظہار "حرفے چند" میں جا بجا موجود ہے۔ عالی نے اپنے ذہن کی وسیع و زرخیز زمین کو اُن تمام ادیبوں، مفکروں، فلسفیوں، نقادوں، شاعروں اور تخلیق کاروں کے کارناموں سے سیراب کیا جو رائٹرز گلڈ کے ایک مرکز پر جمع ہو کر خود بھی منفرد اور مشترک طرزِ فکر و احساس سے روشناس ہوتے رہے۔

ہر چند کہ عالی خود کو تحقیق اور تنقید کا آدمی نہیں سمجھتے بلا شبہ یہ اُن کی کسر نفسی ہے لیکن ذوقِ سلیم کا حامل کوئی قاری جب عالی کی مقدمہ نویسی کا مطالعہ کرے گا تو یقیناً بلا تامل اُن کی زبردست علمی و ادبی آگہی، ژرف بینی، محققانہ صلاحیت، مطالعے کی وسعت اور تجزیاتی و مشاہداتی قوت کی ضرور داد دے گا۔ جن ذہنوں میں تلاش و جستجو کی تشنگی ہے یا جن کی روحیں علم و آشنائی کے لئے مضطرب ہیں، جمیل الدین عالی کی "حرفے چند" اُن کے لئے بلا شبہ آبِ حیات کا کام انجام دے رہی ہے۔ اگر کوئی شخص گزشتہ چار دہائیوں کی نہایت مستند اور جامع تحقیق پر مبنی علوم و فنون کی تاریخ متعین کرنا چاہے تو اُس کے لئے "حرفے چند" کی تینوں جلدوں کا مطالعہ ناگزیر بن جاتا ہے۔ "حرفے چند" عالی کا وہ تاریخ ساز کارنامہ ہے جس نے محض عالی ہی کو نہیں بلکہ ہر اُس تصنیف کو آفاقیت سے ہمکنار کیا ہے جو عالی کی تحریروں اور مقدمات کا موضوع بنی۔ اُن مطبوعات کے غیر معمولی ہونے میں ہرگز کوئی کلام نہیں جن کو جمیل الدین عالی نے اپنی عالمانہ اور محققانہ معیارات پر کمال خوبی سے پرکھا ہے۔

عالی نے اپنی تبصرہ نگاری میں مصنف کے تعارف یا اُس کی صلاحیتوں کی جانب نشاندہی کرتے وقت

زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے بلکہ وہ محاسن کے ساتھ نقائص پر بھی بہ زبانِ قلم بات کرتے ہیں۔ اور دورانِ تبصرہ عالی نے ہمیشہ تصنیف و مصنف کے عہد اور عہد میں رونما ہونے والی تحریکات، انقلابات، سانحات اور واقعات اِن تمام عناصر کو بطورِ خاص ملحوظ رکھا ہے۔ وہ اِن تمام اجزاء کا اثر مصنف اور اُس کی تحریر میں تلاش کرتے ہیں اور ایسا کرتے کرتے وہ اکثر قاری کا رشتہ قدیم تاریخ اور ماضی کی روایت سے بڑی دلچسپی سے جوڑ دیتے ہیں۔ تنقید و تبصرہ کا یہ وہ طرز ہے جس کی داغ بیل بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے ڈالی اور عالی نے اِس سلسلے کو قابلِ ستائش انداز سے آگے بڑھایا۔

"حرفے چند" کا ہر مضمون، مضمون میں شامل ہر جملہ اور ہر جملے کا ایک ایک لفظ عالی کی تحقیقی، نظریاتی اور فکری دانش جوئی کا بے مثال ترجمان ہے۔ جمیل الدین عالی کی اِن اعلیٰ اوصاف سے مزین تحریروں کی عظمت و بلندی پر باوزن رائے وہی دے سکتا ہے جو بذاتِ خود "حرفے چند" کو ایک ایک قطرے کی شکل میں اپنی روح میں اتار لے کیونکہ یہ محض عالمانہ اور فلسفیانہ نہج کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ملی و قومی تشخص اور معاشرتی روایات کی بے لوث پاسداری کا امتزاج بھی ہے۔ یہی نہیں اگر "حرفے چند" کے حوالے سے ہم عالی کے سینے پر کامیابی کا ایک اور تمغہ دیکھنا چاہتے ہیں تو یقیناً اِن مقدمات اور تبصروں کے بارے میں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ تحریریں انجمن سے شائع ہونے والی ہر کتاب اور چار دہائیوں پر محیط علمی تاریخ کے تحفظ کی ضامن ہیں۔

اظہاریہ نگاری

ادب کی تشریح و توضیح کرنا یقیناً کارِ سہل ہے مگر لفظ "ادب" کی ایک جامع اور مکمل تعریف آج تک ممکن نہ ہو سکی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دائرۂ ادب میں بلحاظِ اصناف جس قدر وسعت آتی جا رہی ہے اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو واقعی آسان الفاظ میں اِس کی تعریف کر دینا خاصا مشکل ہے۔ بظاہر یہ کتنی عام سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ادب کی بنیادی طور پر دو اصناف ہیں (۱) شاعری (۲) نثر

لیکن ادب کی رنگا رنگی اور ہمہ گیری کا درست اندازہ تب ہی ہوگا جب اِن بنیادی اصناف سے مستخرج ذیلی اصناف کا جائزہ لیا جائے اور اگر یہ جائزہ محض سرسری اور سطحی طرز سے بھی لیا جائے تب بھی اِس وسیع و عریض بحرِ ادب کا دوسرا کنارہ نظروں سے اوجھل ہی رہے گا۔ وسعت و کشادگی کے علاوہ اِس کی گہرائی بھی

تا حال نامعلوم ہے۔ صرف معاملاتِ نثر ہی کو لیا جائے تو اردو ادب میں اِس کا آغاز داستان گوئی سے ہوا۔ پھر جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا، حالات بدلتے گئے اور وقت کی رفتار نا قابلِ یقین حد تک تیزی اختیار کر گئی ویسے ویسے ہر شعبہ ہائے زندگی کی طرح میدان ادب میں تبدیلی و تغیر واقع ہوئے اور نئے نئے موضوعات کا اضافہ ہونے لگا۔ داستان گوئی سے لے کر سفر نامے، خاکہ نگاری، سوانح عمری، مکتوب نگاری، مزاح نگاری، انشائیہ نویسی، ناول، افسانے، ڈرامے غرض ایسی کون سی صنف ہے جہاں ہمارے ادباء نے اپنے تخلیقی و تحقیقی کارنامے نہ پیش کیے ہوں۔ اور آج دامنِ اُردو ادب اِن انمول لعل و جواہر سے اِس قدر مالا مال ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب کے ساتھ اُردو زبان کے ادب کو بھی بلا تذبذب صفِ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے۔

وہ تمام ضمنی اصناف جن کا ذکر آ چکا ہے اُن سے قطع نظر اُردو کی ابھی دو اصناف ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں حلقۂ ادباء ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ اِن کو ادب میں مقام دیا جائے یا نہیں اور اگر دیا جائے تو یہ مقام کس درجے پر ہو۔ یہ ذکر ہے تنقید اور اظہاریہ نویسی کا، یہاں تنقید فی الحال احاطۂ موضوع سے باہر ہے۔ البتہ اظہاریہ نویسی یا کالم نگاری کے حوالے سے صورتحال یہ ہے کہ نہ صحافی اسے صحافت تسلیم کرتے ہیں اور نہ ادیب اسے ادب مانتے ہیں۔ حالانکہ اِس صنف کے نمائندوں میں وہ افراد بھی شامل ہیں جنہوں نے ادبِ عالیہ کو جنم دیا لیکن جب چلتے پھرتے کالم نگاروں نے اِس منفرد صنف کی مخصوص فضا اور تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر نام نہاد سیاست، سطحی احساسات اور بے بنیاد افکار سے اپنی کھوکھلی تحریروں کو بھر دیا تو پھر لامحالہ ایک ایسی صورت پیدا ہوتی ہے جہاں کالم نویسوں کو نہ دنیائے ادب تسلیم کرتی ہے نہ دنیائے صحافت قبول کرتی ہے۔ البتہ اگر اظہاریہ نویسی کی فہرست میں انتظار حسین، ابن انشاء، جمیل الدین عالی، عطاالحق قاسمی اور نصر اللہ خان کے نام نہ شامل ہوتے تو یہ صنف بہت پہلے اپنی موت آپ مر چکی ہوتی۔ اِن اشخاص نے صرف کالم نگاری کو ہی حلقۂ ادب میں متعارف نہیں کروایا بلکہ اس کی ساکھ کو ہمیشہ اپنے مضبوط بازوؤں سے سہارا دیتے رہے اور بالآخر انہی کی جدوجہد قلم نے اِس صنف کو اُردو ادب میں ایک جداگانہ مقام پر فائز کر دیا جہاں تک جمیل الدین عالی کا تعلق ہے وہ اپنی اِن تحریروں کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ کالم نہیں بلکہ "اظہاریہ" ہیں یقیناً اُن کے ذہن میں اِن دونوں کے مابین ضرور کوئی نہ کوئی خطِ امتیاز ضرور ہوگا جس کا ادراک بآسانی ممکن نہیں۔

عالؔی کے سلسلہ نثر کی ابتداء خاکہ نگاری سے ہوئی۔ سفرنامہ، حرفے چند اور پھر اظہاریہ نویسی اسی سلسلہ نگارشات کی کڑیاں ہیں۔ انہوں نے اظہاریہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۷ء میں کیا اور آج تک بغیر کسی ٹھہراؤ کے یہ سفر اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے۔ جمیل الدین عالؔی روزنامہ "جنگ" میں "نقار خانے میں" کے عنوان سے اظہاریے لکھ رہے ہیں اور اب اِن کالموں کے انتخابات تین مجموعوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) صدا کر چلے
(۲) دعا کر چلے
(۳) وفا کر چلے

اُردو زبان میں نوعیت کے اعتبار سے یہ کتابیں بلاشبہ انفرادی تحریروں کا مجموعہ ہیں۔ یہاں ہماری ملاقات ایک ایسے عالؔی سے ہوتی ہے جن کی ذات کا حساس مفکر مسلسل حب الوطنی اور قوم پرستی کو اپنا مقصد و وظیفہ حیات بنائے ہوئے ہے۔ عالؔی کی ذات کا یہ رُخ جذباتیت اور تعقل پسندی کے اشتراک سے مکمل ہوا ہے۔ یہ عالؔی کے وہ بلند اوصاف ہیں جنہوں نے گردابِ زمانہ میں قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو کئی بار فکری سہارا دیا ہے۔

پاکستان کا تعلق تیسری دنیا کے اُن ممالک سے ہے جہاں سیاسی اتار چڑھاؤ، معاشی عدم استحکام، اقتصادی بد حالی اور ناخواندگی کے مسائل نے معاشرہ کو کبھی صحیح طور پنپنے نہیں دیا۔ یہ وہ موضوعات تھے جن پر تمام تر سنجیدگی، شعور، فہم و ادراک اور دیانت داری سے قلم اُٹھانا نہایت ہمت و حوصلے کا کام تھا۔ اِن مسائل پر کچھ تحریر کرنے کا مطلب محض یہ نہیں کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے رسمی گفتگو کا فرض ادا کیا جائے بلکہ یہ اِس خطے کی وہ پچاس سالہ تاریخ ہے جس سے آگہی و شناسائی ہر پاکستانی کے لئے اہم ہے اور یوں بھی ہمارا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جس کا رشتہ حال و مستقبل سے مضبوط ہو نہ ہو البتہ ماضی سے بڑا مضبوط رہا ہے۔

اظہاریہ نویسی کے اعتبار سے عالؔی کی عصری آگہی اور سماج کے نظریاتی پہلوؤں کا مطالعہ نہایت معلومات افزا ہے۔ معاشرتی مسائل پر مشتمل فکری مباحث اور کتابیں ہمارے ہاں بہت کم تعداد میں دکھائی دیتے ہیں ایسی تحریریں تو نہ ہونے کے برابر ہیں جن کو پڑھنے کے بعد دماغ میں خیالات و افکار کے سوتے

پھوٹتے ہیں۔ فی زمانہ اِس نفسا نفسی کے عالم نے مصنف کی نفسیات پر عجیب وغریب اثرات مرتب کئے ہیں۔ مصنف وناشرین نے تصنیف واشاعت کو صرف کاروباری نقطۂ نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ کوئی بھی شخص کسی ایسے موضوع پر کچھ کہنے کے لئے تیار نہیں جسے عوام کے بڑے حلقے میں پذیرائی نہ ملے۔ اجتماعی مفادات، معاشرتی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اب صرف سطحی اور غیر معیاری شاعری پر زورِ قلم صرف ہو رہا ہے یا پھر معمولی درجے کے چند افسانے اور ناول لکھ کر وقتی شہرت حاصل کی جارہی ہے۔ ہمارا سماجی المیہ یہ ہے کہ کروڑوں کی آبادی کا بڑا حصّہ ناخواندہ ہے اور جسے عالمی سطح پر ہونے والی سیاست، اقتصادیات، معاشیات، اور دیگر شعبہ جات سے کوئی دلچسپی نہیں یہ ناعاقبت اندیش اور بے خبر طبقہ وہ شاعری اور فکشن تو پڑھ سکتا ہے جو سستی بھی ہے اور بے کارِ محض بھی مگر اُن کے ذہن سنجیدہ اور عمیق شعبہ علوم کے متحمل نہیں ہو سکتے اِس لئے وطن میں موجود خال خال مصلحت بیسیوں نے وطن کے طویل المعیاد مفادات کے تحت جو کچھ لکھا وہ نہ زیادہ خریدا جا سکتا ہے اور نہ پڑھا جا سکتا ہے لہٰذا ہمارے عوام کی بھاری اکثریت کو اُن پہلوؤں سے کوئی ذہنی لگاؤ نہیں جن کا ترقی وتعمیر معاشرہ میں بڑا کردار ہے۔

جمیل الدین عالؔی نے معاشرے کے تمام ڈھکے چھپے، تلخ اور ناقابلِ قبول حقائق کو ایک صداقت پسند انسان کی طرح تسلیم کیا ہے۔ وہ اِس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اُن کا تعلق ایک ایسے خطۂ زمین سے ہے جہاں کے کھیتوں میں فصل نہیں بھوک اُگا کرتی ہے۔ جہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کے مستقبل میں معاشی سکھ نہیں بلکہ بے روزگاری ہے، جہاں صحت وتعلیم ایک طرف، زندگی کی بنیادی ضروریات بھی ہر ایک کو میسّر نہیں۔ عالؔی کے اظہاریوں میں اُن کا طرزِ تفکر ایک ایسے باشعور اور دور اندیش محبِ وطن کا ہے جس نے خود بھی سرکار کے ہاتھوں بے روزگاری اور تنگ دستی کا ذائقہ چکھا ہے۔ عالؔی نے اِس دوران متعدد گفتنی وناگفتنی واقعات کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا۔ تمام تر برائیوں، نامساعد حالات اور اِن کے اثرات کو دِل، ذہن، اور روح کے ایک ایک تار میں اترتا محسوس کیا ہے۔ علاقائی اور لسانی عصبیت کا وہ طوفان جس نے خطّے میں اُردو کو بحیثیت سرکاری زبان کبھی رائج نہ ہونے دیا اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فسادات نے ہر حقیقت آگاہ اور وطن پرست انسان کے دِل کو خون کے آنسو رُلایا عالؔی خود بھی اِس آگ میں جلے بلکہ جلنے پر مجبور کیے گئے۔ نہ عالؔی پیغمبر خدا ہیں اور نہ یہ معجزات کا دور، ورنہ شاید آگ اُن کے لئے گلزار بنتی۔ مگر جمیل الدین عالؔی کا باطن ایک تسلسل سے سُلگ

رہا ہے۔ ملک و معاشرے میں چلنے والے کالی آندھیوں کے جھکڑ اور ناخوشگوار ہواؤں کے تھپیڑے وجود کی خاکستر کو بھڑکتے شعلوں میں تبدیل کر دیتے ہیں اور جب عاؔلی کے مشاہدات اور تخلیقی صلاحیت یکجا ہو کر اِن تیز شعلوں کی آنچ پر پگھلتے ہیں تو پھر وہ تحریریں جنم لیتی ہیں جن کے ایک ایک لفظ سے عاؔلی کے سوزِ دروں کا احساس ہوتا ہے۔

ہر صاحبِ قلب و نظر کے لئے عاؔلی کے اظہاریے ایک انمول اور بیش بہا اثاثہ ہیں۔ اِن مجموعوں میں غور طلب اشارے ہیں امکانات سے بحث ہے۔ وہ محض مسائل پر گفتگو نہیں کرتے بلکہ ان مسائل کے حل کی سمت بھی متعین کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جمیل الدین عاؔلی کے کالم پڑھ کر ذہن منتشر نہیں ہوتا بلکہ خیالات کی رو ایک روشن راستے پر پرُ امید منزل پر گامزن ہو جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب عاؔلی کے مطالعے میں وسعت آئی اور حالات و تجربات نے نظریہ زندگی کے چند گوشوں میں تبدیلی پیدا کی تو عاؔلی کے ذوقِ آگہی نے "مستقبلیات" کے حوالے سے اُنہیں ایک اور راہ دکھائی یہ مضمون جو پاکستان میں ابھی تک نامانوس اور غیر معروف ہے اب عاؔلی کی تحریروں کا جزوِ لازم بن چکا ہے۔ انہوں نے "مستقبلیات" کی کچھ تعلیم جنیوا میں اپنے ایک سفر کے دوران لی جو انہوں نے ۱۹۷۸ء میں کیا۔ عاؔلی نے افرادِ معاشرہ کی اجتماعی نفسیات کے تحت پروان چڑھنے والے چند تصوّرات کو یکسر بدل کر نئے امکانات پیش کئے ہیں اپنے اِس رویے کا اظہار انہوں نے مختلف تحریروں میں کیا ہے جن کی یکساں نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کئی اظہاریوں کو ایک عنوان کے تحت یکجا کر دیا ہے۔ "کامیابی کا مفہوم"، "روشن امکانات"، "ثقافتی دیوارِ چین"، ادبی افق" وغیرہ میں عاؔلی نے جو گفتگو کی ہے اُس نے ہر خاص و عام میں مروجہ تصوّرات کی بنیادوں میں زلزلہ پیدا کیا ہے۔ جمیل الدین عاؔلی کے پیش کردہ امکانات کو سمجھنے کے لئے عام ذہنی سطح ناکافی ہے۔

"پاکستانیت" عاؔلی کی شان ہے۔ ذہن کی زمین سے پھوٹنے والے افکار و نظریات کے تمام برگ و بار اور آتشِ قلب سے نکلنے والے احساسات و جذبات کے شرار، اِن سب کا محرّک صرف پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کے لئے بات شروع کرتے ہیں اور پاکستان پر گفتگو ختم کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والا بلا تامّل یہ رائے دے سکتا ہے کہ تمام حکومتی معاملات اور سرکاری پالیسیوں سے قطع نظر اگر کوئی موضوع عاؔلی پر حاوی ہے تو وہ ہے "پاکستان"۔ بظاہر معمولی نظر آنے والے مسائل کو جب وہ پاکستانی معاشرے کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو

تمام دلائل اور منطق سے ثابت کر دیتے ہیں کہ ایک معمولی مسئلے کی تباہ کاریاں وطن پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مثلاً عالی نے "جہیز کا مسئلہ" کے موضوع پر جو اظہاریے تحریر کیے اُن سے یہ سچائی عیاں ہے کہ جہیز کی لعنت ایک ایسی دیمک کی طرح ہے جو معاشرے کی اساس کو مسلسل کھوکھلا کر رہی ہے۔ "مستقبلیات" چونکہ عالی کا مضمون رہا ہے لہذا تمام مباحث اور نکات کے پیش نظر اپنے اظہاریوں کے توسط سے قاری اور عوام کو امیدوں کی روشن کرن دکھاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ انتہائی دشوار صورتحال کے باوجود وہ حیرت انگیز طور پر مسائل کا حل پیش کر دیتے ہیں۔ عالی کے اظہاریوں کے مجموعے "صدا کر چلے" پر تبصرہ کرتے ہوئے محمود ریاض لکھتے ہیں:

"عالی صاحب کو پاکستان کے مستقبل میں بڑے عظیم روشن امکانات نظر آتے ہیں اور وہ بڑی تحقیق اور محنت کے ساتھ انہیں اجاگر کرتے ہیں۔ یہ محض جذباتی حب الوطنی کے راگ نہیں، ٹھوس اعداد وشمار اور واضح اقتصادی امکانات کا معاملہ ہے۔ یہ ان کا ایک مستقل موضوع ہے۔ اِس کا کسی مخصوص حکومت کے " کارناموں" یا کوتاہیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ کسی حکومت کی پالیسیوں، کارناموں یا کوششوں پر نہیں، اپنے ملک پاکستان کی بنیادی قوتوں اور امکانات پر لکھتے ہیں اور ساتھ ہی موجودہ پسماندگی اور اس کے اسباب کی طرف بھی واضح اشارے کرتے ہیں۔" (۵)

پاکستانی عوام کا وہ وسیع حلقہ جو بیرونِ ملک زندگی گزارنے پر مجبور ہے، عالی کے کالم اُن لوگوں اور پاکستان کے درمیان ایک مستقل رابطے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ عالی کی اظہاریہ نویسی کے باعث وطن سے ایک جذباتی اور روحانی تعلق قائم کرنے میں تارکین وطن کو بڑی سہولت ہے، کیونکہ عالی کا نام زبان پر آتے ہی ذہن کے افق پر ایک ایسے قوم پرست اور وطن کی مجموعی فضا کے ترجمان شخص کا تصور ابھرتا ہے جو اُنہیں ملکی حالات سے باخبر رکھنے کا باوثوق ذریعہ بھی ہے۔ عالی نے اظہاریہ نویسی کے سفر کا آغاز ۱۹۹۷ء میں کیا اُس وقت سے لے کر آج تک عالی نے جو کچھ لکھا اُس کی مدد سے پاکستان کی چھتیس سالہ سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشی تاریخ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ قوموں کی زندگی میں ادباء، مفکرین، فلسفیوں اور علماء نے انقلاب آفریں کردار ادا کیے ہیں۔ انہوں نے اپنے لازوال اور عہد ساز کارناموں کے ذریعے طبقہ عوام میں بیداری کی وہ

روح پھونکی کہ پھر یہ قومیں رفتہ رفتہ دنیا پر چھاتی چلی گئیں۔ لکھنے والوں کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے جن کی تحریروں کی کاٹ تلوار کی ضرب سے کہیں بڑھ کر کاری ہوتی ہے اِن میں موجود عقلیت، حقیقت اور جذباتیت کی آمیزش اُن معاشروں کو جنم دیتی ہے جو ہر خطہء ارض پر حکمرانی کی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتی ہے۔ مسلمان قوم کی خوش نصیبی تھی کہ اِس میں وہ ہستیاں پیدا ہوئیں جنہوں نے مسلمانوں کو بذریعہ علوم وفنون اور آگہی کے آفاقی اصولوں سے روشناس کرایا۔ ایسے لوگ بھی تاریخ میں نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی قلمی کاوشوں سے معاشرے کی سدھار اور اصلاح کا کام لیا۔ اُن کی تحریروں میں مقصدیت کی وہ واضح جھلک موجود ہے جس کے تحت وہ امتِ مسلمہ میں بلند اور صاف دیکھنے کے خواہاں تھے۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں اگر ایسے ناموں کی فہرست مرتب کی جائے جن کی تصانیف کا منشا و مقصد قوم کا مستقبل روشن رہا تو اُن میں عالی کا نام ضرور شامل ہوگا۔ مگر یہ ہماری بدنصیبی رہی کہ ہر بے لوث اور پرُ خلوص پیغام دینے والے کے سلسلے میں وصول یابی میں ہمیشہ کوتاہی ہم سے ہوئی۔ عالی کے اظہاریہ نویسی کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش رہا۔ وہ گزشتہ تیس چالیس دہائیوں سے پیغامِ بیداری دے رہے ہیں مستقل روشن امکانات اور تابناک مستقبل کی راہیں دکھارہے ہیں مگر ان پر عمل کرنا تو درکنار شاید ہماری قوم کو نظریں تک ڈالنا گوارا نہیں۔ عالی کی کالم نویسی کی اہمیت اور قوم کی اصلیت پر زاہدہ حنا نے بڑی سچی بات کہی:

"دشتِ مستقبل کا غزال بن کر عالی صاحب اپنے کالموں میں جس مستقبل بینی اور مستقبل شناسی پر اصرار کرتے رہے، افسوس کے ہمارے یہاں کسی نے ان باتوں پر کان ہی نہیں دھرا۔ ہمارے حکمراں، ہماری نوکر شاہی اور اقتدار میں شامل دیگر ادارے بھی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں اور ملک کو درپیش مسائل کو پرانے طریقوں سے حل کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں۔ ملک کو آج ایک صنعتی انقلاب کی ضرورت ہے لیکن اقتدار پر جاگیردار، اشرافیہ اور نوکر شاہی کا قبضہ ہے بدلی ہوئی دنیا کا اگر ہمیں ادراک ہوتا تو ہم جدید دور کی جمہوریت سے ہم آہنگ نظام قائم کر چکے ہوتے۔"(۶) زاہدہ حنا کے لہجے میں موجودہ حالات سے تشکیل پانے والے حقائق کی تلخی گھلی ہوئی ہے۔ عالی جیسے زمانہ شناس انسان کو بھی یقیناً اِن صداقتوں اور سچائیوں کا پورا شعور ہوگا۔ اُن کا قلم حقیقتوں کا سامنا کئے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ مگر پھر بھی وہ برابر لکھے جارہے ہیں اُن کی تحریروں میں امید ورجا کا واضح عنصر شامل ہے۔ عالی کے دماغ میں گردش کرنے والا کوئی بھی خیال جب لفظ

کے مادّی پیکر میں ڈھلتا ہے تو اُس میں سے یقین کی حرارت نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا یقین جس کی بنیاد پر وہ بلا رکاوٹ لکھ رہے ہیں۔ اُنہیں اپنے قاری پر یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن میں وہ اُس راز کو ضرور پالے گا جس میں قوم کا روشن مستقبل پوشیدہ ہے۔ اِس اعتبار کے ساتھ کہ عوام اُن کے ولی جذبات کو ایک مقام پر آ کے ضرور محسوس کریں گے وہ یہ دُعا بھی کرتے ہیں کہ ع دے اور انہیں دِل جو نہ دے مجھ کو زباں اور عالی کی ثابت قدمی پر محمود ریاض یوں خامہ فرما ہیں:

"وہ جراءت انگیز طور پر ایک ایسے اظہاریہ نویس ثابت ہوتے ہیں جو آسان زبان میں مشکل سے مشکل افکار عام کر کے اپنے قاری کو آہستہ آہستہ گہری سنجیدہ فکر کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ فکر پاکستانیت اور پاکستانیت کے راستے پوری انسانیت کی خدمت کرے گی، اس کا جواب وقت دے نہ دے یہ پورا عمل ہی ایک عظیم کارِ خیر کی شکل اختیار کر چکا ہے۔" (۷)

عالی کی کالم نگاری کا بلاشبہ اُردو میں ایک مستند مقام ہے۔ اِس سلسلے میں منظرِ عام پر آنے والی تین کتابوں میں موضوعات کا تنوع رنگا رنگی، ہمہ گیری اور آفاقیت سے کسی کو انکار نہیں۔ عالی کی اِس قلمی سعی و جستجو کے حوالے سے جتنا لکھا جائے میری نظر میں بہت کم ہے۔ کیونکہ وہ اِس خزینۂ معلومات میں ایک انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ وہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار ہیں جن کی تحریروں میں جداگانہ طرزِ احساس، انسانی شعور، تاریخی حقائق، ماضی کی بازگشت، سماجی نفسیات غرض تمام پہلو ایک دائمی اور فکری رجحان سازی کے ساتھ یکجا ہیں۔ وقت کی تیز رفتاری کا اُنہیں پورا شعور ہے۔ عصری تقاضوں کو اور مستقبل کے امکانات کو وہ محض ایک پاکستانی معاشرے کے تحت دیکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ادیب مخصوص فضا، ملک اور سماج سے ماوراء ہو کر خدمت انجام دیتا ہے۔ مگر عالی کا اصرار ہے کہ وہ صرف پاکستانی ہیں۔ اُن کی تمام سوچوں، خیالات اور جذبات کا واحد منبع و مرکز پاکستان ہے۔ عالی کی ذات میں چھپے پاکستانی سے اگر ملاقات مقصود ہو تو اُن کے اظہاریوں پر مبنی مجموعوں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ عبدالعزیز ساحر نے جمیل الدین عالی کی اظہاریہ نویسی کو اُن کی شخصیت کا بھرپور اظہاریہ کہا ہے۔ ساحر نے عالی کی تحریر میں موجود اپنے وطن اور اُس کے تمام زمینی حقائق و عناصر سے دل بستگی کے احساس اور جذباتی فضا کا عکس تلاش کیا ہے۔ عالی کی کالم نویسی اور اُن کی شخصیت کے مابین جو ربط ہے اُسے ساحر نے یوں بیان کیا ہے:

"اظہاریوں میں موضوعاتی تنوع عالی کی فکر کا مشاہداتی حوالہ ہی نہیں، احساس کی لاشعوری قوت کا تخلیقی کنایہ بھی ہے۔ یہ وجدان کے اس مخفی تموج سے عبارت ہے جو روح کے تاروں سے مرتعش ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ہر اظہاریہ دستاویزی حیثیت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ یہ اپنے باطن میں اس نقطے کا محور قرار پاتا ہے جس سے انسانی زندگی اپنے ہونے کا احساس پاتی ہے اور یہ مقام ہے جہاں ....اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا، کا صوتی عکس کیفیتِ چشم سے آشنا ہوجاتا ہے۔ "(۸)

چونکہ عالی کے اظہاریوں میں اُن کی ذات کے ایک ایک گوشے کی مکمل ترجمانی ہے اِس لئے اِن کے مطالعے کے بعد جو حقیقت سب سے نمایاں ہے وہ یہ کہ عالی کو پاکستان سے اِس طرح محبت ہے جیسے معصوم بچے کو اپنی ماں سے یا پھر ایک جذباتی عاشق کو اپنی محبوبہ سے۔ لہٰذا جب وہ وطن کے مناظر اور فضا کے قریب ہوں تو اُس سے محض اُسی کی باتیں کرتے ہیں اور ہمہ وقت اپنی گہری محبت کا اظہار کرنے میں الفاظ کے خزینے لٹاتے ہیں۔ مگر جب یہی عالی وطن سے دور ہوں تو اِس کے ہجر و فراق میں تڑپتے دِکھائی دیتے ہیں۔ عالی اپنا یہ انداز نثر یا شاعری میں کہیں اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیتے۔ اور یہی وہ ادائے خاص ہے جس نے عالی کو اپنے ہم عصروں میں منفرد اور ممتاز بنا دیا۔

عالی کی نثری خصوصیات: ایک جائزہ

شاعری کی نسبت نثر لکھنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بلاشبہ شاعری فنِ مرصع سازی کی مانند ہے۔ الفاظ کی ترتیب و قاعدہ بندی میں بال برابر کوتاہی عمدہ سے عمدہ کلام میں ایسی کمزوریاں پیدا کر دیتی ہے جن سے اکثر سارا لطف جاتا رہتا ہے۔ مگر کسی وسیع الکلام شاعر کے ہاں اگر یہ صورتحال شاذ ہو تو اِس سے مقام و درجات پر آنچ نہیں آتی۔ البتہ نثر جسے عام طور پر بات کرنے کا سیدھا سادہ انداز سمجھا جاتا ہے اگر الفاظ کی ترتیب، انتخاب اور استعمال میں لاپروائی اختیار کی جائے تو یہ بھی نہایت روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ ادباء و مصنفین کی خام خیالی یہ بھی ہے کہ جب تک عبارت میں رنگینی، لفاظی اور فصاحت و بلاغت کی آمیزش نہ کی جائے اُس میں دلکشی اور جاذبیت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ تحریر قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے جس میں لکھاری اپنا تمام زورِ قلم عبارت آرائی میں صرف نہ کر سکے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے یا کم از کم اب ایسا نہیں رہا۔ وہ نثری نگارشات، جن میں دلچسپ تراکیب، محاورات اور پیچیدہ لفاظی مروج تھی اب محض وہ تاریخی

اور کلاسیکی ادب کا حصہ ہیں۔ ایسی نثر اُردو ادب کی مخصوص صنف داستان تک محدود ہو کر رہ گئی۔ سر سیّد احمد خان اور اُن کے رفقائے کار نے عرصہ دراز قبل ادب اور دیگر علمی و تحقیقی کتابوں میں دشوار طرزِ تحریر اور نا قابل فہم اندازِ گفتگو کے تمام تصورات کو مسمار کر دیا تھا۔ اِس کی جگہ انہوں نے سہل، سادہ اور رواں عبارت کی روایت ڈالی جس کا اہلِ دانش و بیش او راصحابِ عقل و شعور نے کشادہ قلبی سے خیر مقدم کیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے حلقہ علم و ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ادب میں صرف حظ و لطافت پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ اِس میں افادیت اور زندگی کے ناگزیر حقائق کی ترجمانی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہو گیا تھا۔

فی زمانہ وقت و حالات کے تقاضے ماضی سے زیادہ سخت ہیں مگر آج بھی کچھ ایسے نثر نگار مل جاتے ہیں جو موضوع کا لحاظ کئے بغیر ماضی کی قدیم ڈگر پر چلتے دِکھائی دیں گے۔ تنقید، تبصرہ، تجزیہ یا تحقیق غرض ہر جگہ اُن کے پاس اپنی انفرادیت منوانے کا ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ یہ کہ نثر میں بھی زیادہ سے زیادہ انوکھی اور نامانوس تراکیب اور دشوار الفاظ سے مرتب جملوں کا استعمال ہوتا کہ قاری ایک صفحہ پڑھنے کے بعد ہی مصنف کی اعلیٰ علمیت اور اُس کے پاس موجود ذخیرۂ الفاظ سے مرعوب ہو جائے۔ مگر قاری زیادہ دیر تک اِس کیفیت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ مزید چند صفحات کا بار اُٹھا کر کتاب بند کر دیگا۔ ادب کے قاری میں یہ بار اُٹھانے کی صلاحیت ذرا افزوں ہوتی ہے لیکن مصنف کا یہ طرزِ تحریر اُن افکار و خیالات کے ابلاغ میں حارج ہے جو کتاب کا اصل مضمون ہے۔ جب ابلاغ ہی نہ ہوا تو مصنف یقیناً اپنے ایک بڑے اہم مقصد میں ناکام ہو گیا۔

سادگی و بے تکلفی میں اپنا حسن ہے، کشش بھی ہے اور دلآویزی بھی۔ نثر میں اجزائے سادگی و سلاست کا اہتمام کرنے والے نثر نگار آج دنیائے علم و ادب پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ بالخصوص تنقید و تبصرہ نویسی اور مقالات میں اِس کا شعوری احترام روا رکھا جاتا ہے۔ انہی اشخاص کی فہرست میں جمیل الدین عالیؔ کا نام بھی موجود ہے۔ عالیؔ نے کبھی اِس امر کی کوشش نہیں کی کہ اپنی تمام توانائی کو صرف کر کے ایسی ادق تحریریں تخلیق کیں جائیں جو اعلیٰ ادب کے شایانِ شان ہو۔ یہ توانائی وہاں استعمال ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں عالیؔ اپنے دِل کی کوئی بات یا پیغام عوام اور قاری تک باآسانی بلا واسطہ پہنچا دینے کی خواہش رکھتے ہوں۔

بحیثیت نثر نگار عالیؔ کی سب سے نمایاں خوبی ہی یہی ہے کہ انہوں نے غزل اور دوہے کا شاعر ہونے کے باوصف اپنی نثر کو پُر تکلفی اور دقت پسندی کی ملاوٹ سے پاک رکھا۔ ورنہ عموماً دیکھا یہ جاتا ہے کہ شاعر

جب نثر لکھے تو اجزائے سخن کی رنگ آمیزی شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیکن عالی کے ہاں صورتحال بالکل برعکس ہے۔ عالی کی شخصیت ہمہ رنگ جہات سے آراستہ ہے اور ہر جہت کے اظہار کے لئے انہوں نے علاحدہ راہ منتخب کی۔ دو بنیادی راستے شاعری اور نثر کے ہیں۔ شاعری میں بھی اُن کا جداگانہ طرزِ سخن عالی کی شناخت بن چکا ہے اور اب نثر میں بھی یہی صورت ہے۔ کسی بھی تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ خود پکار پکار کر اپنے لکھنے والے کا نام بتائے۔ عالی کی نثر اُن کی پہچان ہے۔ یہ نکتہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ عالی نے معاملاتِ نثر میں اُس اسلوبِ تحریر سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے جسے مشکل گوئی یا دشوار پسندی کہا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری سے کالم نویسی تک کا ایک طویل سفر جمیل الدین عالی نے ہر نوع کے عصری نشیب و فراز کے شانہ بشانہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اُن کی ذات میں مخفی ایک تجزیہ پسند اور دانش ور درویش کو بے معنی تصنع اور بناوٹ سے کوئی علاقہ نہیں۔ عالی کے انتہائی درویشانہ اور فقیرانہ طرزِ حیات کا پرتو اُن کی نثری نگارشات میں بھی موجود ہے۔ شعبہ ءنفسیات میں فرائڈ کے پیش کردہ نظریات کی توضیح و تشریح نے اب اِس علم کو کافی آسان بنا دیا ہے۔ ماہرین نفسیات کسی بھی شخص کے مزاج کے مختلف پہلوؤں کی درست تفہیم کے لئے اب اُن تحریروں سے مدد حاصل کرتے ہیں جو اُس نے جدا جدا زمانوں میں لکھیں۔ عالی کی نثر کے مطالعے کے بعد بلا تردد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر سادگی پسند شخصیت کے مالک ہیں، اس کے علاوہ ایک انتہائی بے باک، نڈر اور جراتمند انسان ہیں۔ شوخی، ظرافت، لطافت اور لاأبالی پن عالی کی طبعیت کا خاص حصہ ہیں۔ یہ تمام وہ اوصاف ہیں جنہوں نے عالی کی تحریر میں اپنا عکس جمایا۔ سادہ اور رواں تحریریں عالی کی تبصرہ نگاری یعنی "حرفِ چند" کے تینوں مجموعوں میں نظر آتی ہیں۔ یہی انداز بے باکی اور جراتمندی جیسی خصوصیات کی آمیزش کے ساتھ اظہاریہ نویسی میں عیاں ہے۔ اور اگر اِن دو منفرد رنگ ایک تیسرے رنگ یعنی شوخی و ظرافت میں شامل ہو جائیں تو اُن کے سفرنامے کا اسلوبِ خاص مشکل ہوتا ہے۔

عالی کی تحریریں علم کا ایک ایسا رواں دواں سمندر ہیں جو ہر ذی شعور و فہم کو غوطہ زنی کی دعوت دیتے ہیں۔ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اِس سمندر کی اتاہ گہرائیوں میں پوشیدہ خزانوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور دامن بھر بھر کے باہر آتے ہیں۔ عالی کی تحریروں میں یہ دعوت ہر خاص و عام کے لئے ہے۔ ہر شخص کو خزینہ ءمعلومات کی طلب ہے کوئی بھی اِس بحرِ علوم کی سیر کے بعد تہی دست و دامن نہیں رہتا مگر عالی کے،

سرمائے کبھی خالی ہوتے نہیں دیکھے گئے بلکہ یہ عہد بہ عہد بڑھتے جارہے ہیں۔ دراصل جمیل الدین عالؔی کی نثری نگارشات ہر شاخ علم سے مزین ہیں۔ یہ گوناگوں کیفیت "حرفے چند" اور "اظہاریہ نویسی" کے ضمن میں زیادہ دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں انہوں نے ادب، مذہب، تاریخ، عمرانیات، اقتصادیات، لسانیات اور سیاسیات جیسے موضوعات ومباحث پر اپنی علمی وتحقیقی صلاحیتوں کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ عالؔی نے ایک ہی موضوع پر بقدرِ معلومات اتنی تحریریں لکھیں کہ جب اِن نگارشات کو کتابی شکل دینے کا وقت آیا تو ہر موضوع پر مختلف تحریروں کو یکجا کرنے پر کتاب میں پورے پورے ابواب تیار ہوگئے اور قاری کے لئے اُس کے طبعی رجحان کے مطابق آسان صورت بھی پیدا ہوگئی۔ یہ عالؔی کا اپنی آنے والی نسلوں پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے تجربات، مشاہدات اور مطالعے کی بنیاد پر جو واقفیت حاصل کی اُسے محض اپنی ملکیت نہ بنائے رکھا بلکہ اُسے آنے والے دور کے لئے محفوظ کردیا۔

جمیل الدین عالؔی کی نثری تحریروں کو خواہ کسی بھی صورت میں دیکھ لیں، یہ ماضی، حال اور مستقبل کا بہترین امتزاج نظر آتی ہیں۔ درحقیقت شناس انسان ہونے کے ناطے وہ حال میں زندہ رہنے کے قائل ہیں مگر ماضی کی روایات اور قدیم تاریخی ورثوں کو انہوں نے اپنی تحریروں میں کبھی نظرانداز نہیں کیا اور مستقبل کے اندیشوں پر بھی اُن کی دوررس نگاہیں گئی ہیں۔ عالؔی نے سفرناموں میں ماضی کو ایک مطلق سچائی اور قابل فخر اثاثے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور اس ماضی کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی تحریروں میں دیئے گئے پیغامات کو اُس روشن قندیل کا پیکر دیا ہے جسے ہاتھ میں تھام کر عالؔی کی قوم مستقبل کی شاہراہوں پر اعتماد سے قدم رکھ سکتی ہے اور اپنے لئے کامیاب منزل کا تعین کرسکتی ہے۔ خاکہ نگاری، سفرنامے، مقدمہ نویسی اور اظہاریے، عالؔی کی یہ تمام تحریریں ہر ایک کے لئے وہ رہنما اصول ہیں جنہیں اختیار کر کے اِس معاشرے کا ہر فرد اپنی ذات میں ایک خاص وضعِ پاکستانیت کو ابھرتا محسوس کریگا۔ وہ پاکستانیت جو صرف عالؔی کی وصفِ خاص ہے۔ جو عالؔی کی سوچوں کا مرکز بھی ہے اور وظیفہءحیات بھی۔ گویا عالؔی کی ذات کی ایک نہایت اہم اور نمایاں خوبی کو اپنے اندر پیدا کرنا ممکن ہے۔ اس طرح عالؔی کے دیئے گئے پیغامات کی صدا ہمیں اپنے دِل کی دھڑکنوں سے کہیں زیادہ صاف سنائی دے گی۔ لہٰذا عالؔی سے روحانی اور ذہنی قربت حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ اُن کی نثر ہے۔

حواشی

(۱): جمیل الدین عالی کی نثر نگاری: عبدالعزیز ساحر: ص۸۳۔۸۴

(۲): حرفے چند، جمیل الدین عالی: ڈاکٹر ریاض الحسن کی کتاب "اردو ادب میں جمالیات" پر دیباچہ ص:۵

(۳): مشفق خواجہ: عالی کی کتاب حرفے چند پر دیباچہ

(۴): مشفق خواجہ: عالی کی کتاب حرفے چند پر دیباچہ

(۵): محمود ریاض کا "صدا کر چلے" پر تبصرہ: دنیائے ادب، عالی نمبر ۲۰۰۱ء: ص۴۵ے

(۶): ارمضان عالی: اگست ۱۹۹۸ء۔ دشتِ مستقبل کا غزال از زاہدہ حنا ص:۴۱۲

(۷): محمود ریاض کا "صدا کر چلے" پر تبصرہ: دنیائے ادب: عالی نمبر ۲۰۰۱ء: ص۴۶ے

(۸): جمیل الدین عالی کی نثر نگاری: عبدالعزیز ساحر: ص۲۶)

سماجی و علمی خدمات

انجمن ترقی اردو پاکستان

جمیل الدین عالی مولوی عبدالحق کے صحیح جانشین ثابت ہوئے انجمن ترقی اردو کی جو بنیاد مولوی صاحب حیدرآباد دکن سے دہلی اور پھر کراچی لے کر آئے تھے اس کو عالی نے آج عالی شان ادارے میں تبدیل کر دیا ہے انجمن کی عمارت کا نقشہ بن چکا ہے ہر ماہ انجمن سے کتابیں چھپ رہی ہیں۔ لائبریری میں ہزاروں کتابیں ہیں جس سے طلبہ وطالبات استفادہ کر رہے ہیں۔

عالی کا عظیم کارنامہ اردو آرٹس اور اردو سائنس کالج کی وسعت ہے۔ ان کا قیام تو مولوی عبدالحق کے زمانے میں ہو گیا تھا مگر مولوی صاحب کے انتقال (۱۶، اگست ۱۹۶۱ء) کے بعد عالی نے انہیں سنبھالا مولوی صاحب اسے یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے۔ ان کی زندگی میں تو یہ کام نہیں ہو سکا۔ اللہ کا شکر ہے عالی کی ان تھک کوششوں سے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا ہے۔ اور وفاقی حکومت کے اعلان کے بعد وفاقی اردو یونیورسٹی برائے سائنس، آرٹس اور ٹکنالوجی قائم ہو گئی ہے۔

تاریخ انجمن ترقی اردو

"انجمن ترقی اُردو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ادبی شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے پہلے صدر ٹامس آرنلڈ اور سیکریٹری کے لئے علامہ شبلی نعمانی کو منتخب کیا گیا۔ نائب صدور کے لئے منشی ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی کو چنا گیا۔ دو سال بعد ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نعمانی نے استعفیٰ دیدیا۔ ان کی جگہ ۱۹۰۵ء ہی میں حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو نامزد کر دیا گیا۔" (۱)

"شیروانی صاحب کو میر ولایت حسین سے بڑی مدد ملی۔ کیونکہ میر ولایت حسین علی گڑھ میں درس وتدریس سے وابستہ تھے مگر ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام سنبھالنے کے لئے بھی مشہور تھے۔ انہوں نے "انجمن القرض" بنائی اور اس کے تحت اسٹیشنری کی ایک دکان قائم کی جس میں درسی کتب کے علاوہ طلبہ کی ضروریات (کاغذ، پنسل، قلم، دوات وغیرہ) کی تمام چیزیں مل جاتی تھیں۔ اس کا منافع "انجمن القرض" کو ملتا تھا۔ اس ہی دکان پر کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کی مطبوعات فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد میں میر ولایت حسین نے کتابیں چھپوانے کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا" (۲)

"اس اقدام سے انجمن کو بڑا اطمینان ہوا اور نئی نئی کتابیں اور ترجمے سامنے آنے لگے۔ اسطرح انگریزی ادب کو اردو میں ترجمہ کرنے سے اردو ادب میں اور وسعت پیدا ہونے لگی۔ شروع کے پانچ سالوں میں پانچ کتابیں انجمن نے شائع کیں۔ جن میں نپولین کی سوانح عمری پانچ جلدوں میں شائع کی۔

عملی کام سیروانی صاحب (مرحوم) کے مذاق کے مطابق تھا۔ کام کی وسعت میں اضافہ تو ہوگیا مگر سرمایہ کی کمی ہوگئی۔ سرمایہ جمع کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ رئیس حبیب گنج اس معاملے میں کورے تھے۔ آخر ۱۹۰۹ء میں وہ سیکریٹری کے عہدے سے دست بردار ہوگئے" (۳)

"رئیس حبیب گنج کی جگہ عزیز مرزا تشریف لائے۔ یہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اردو کے بہت اچھے ادیب تھے۔ کالی داس کے ناٹک "وکرم اروسی" کا اردو ترجمہ ان کی ادبی یادگار ہے۔ انہوں نے اصلاحات علمیہ کے بنیادی کام پر خاص توجہ دی۔ تعلیمی کانفرنس کا وہ اجلاس جس میں مولوی مرزا عزیز مرزا کو منتخب کیا گیا رنگون میں ہوا تھا۔

رنگون کے ایک تاجر حاجی احمد ملا داؤد صاحب نے وعدہ کیا اصطلاحات کے ترجمے کے لئے تین ہزار روپے دیں گے۔ (۴)

"معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عزیز مرزا اس کام کو بڑے پیمانے پر کرنا چاہتے تھے مرزا صاحب بہت قابل آدمی تھے۔ اس لئے مسلمان انہیں سیاست میں لانا چاہتے تھے۔ مسلم لیگ کا ابتدائی صدر دفتر جب لکھنؤ میں قائم کیا گیا تو اس نئی تنظیم کے لئے مولوی عزیز مرزا کو نامزد کیا گیا لیکن دوسرے سال ہی ان کا انتقال ہوگیا۔" (۵)

"۱۹۱۲ء میں برطانوی دور کا دوسرا اور آخری دربار دہلی میں منعقد ہوا جس میں پہلی مرتبہ ایک فرنگی بادشاہ

ہندوستان آیا اور اس کی تاجپوشی کی گئی۔ اس موقع پر علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس بھی دہلی میں منعقد کیا گیا۔ کانفرنس کے منتظم اعلیٰ صاحبزادہ آفتاب احمد خان تھے۔ انجمن کے سیکریٹری صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے انجمن ترقی اردو کے صدر کے لئے مولوی عبدالحق کا نام تجویز کیا جسے حاضرین جلسہ نے منظور کرلیا۔ مولوی صاحب علی گڑھ کالج کے لائق و فائق طالب علم کی حیثیت سے پہلے ہی شہرت یافتہ تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے انتخاب کو داد دینی چاہئے کہ انہوں نے ایسی شخصیت (مولوی عبدالحق) کا نام تجویز کیا جس نے انجمن ترقی اردو کے لئے اپنی زندگی وقف کردی اور یہ ان ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج اس انجمن کے تحت چلنے والے تعلیمی اداروں میں ہزاروں طلبہ و طالبات زیورِ تعلیم سے آراستہ ہورہے ہیں"۔ (۶)

"انجمن ترقی اردو سے ہر ماہ تقریباً ایک کتاب کا اجراء ہورہا ہے۔ پھر "قومی زبان ماہنامہ" اور اردو "سہ ماہی" بڑی پاکستانی زبان اردو کی خدمت کررہے ہیں۔

جس وقت مولوی عبدالحق کے سپرد یہ شعبہ کیا گیا تھا شعبہ ترقی اردو کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد (حیدرآباد دکن) منتقل ہوا۔ تو مولوی عبدالحق کو ایک پرانا صندوق ملا جو اسقدر بوسیدہ تھا کہ اسے رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ اس میں ایک رجسٹر چند پرانے اور غیر مرتب مسودات ایک قلم و دوات تھے اس مختصر سامان کے ساتھ ہندوستان جیسے ملک میں کسی علمی کام کے لئے کھڑا ہونا۔ مولوی عبدالحق صاحب ہی کی ہمت تھی۔ (۷)

"مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا۔ "میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بارگراں کو اپنے ذمے لیا۔ کیونکہ جس قدر یہ کام ضروری ہے۔ اسی قدر مشکل بھی ہے اردو زبان میں علوم وفنون لانے کے لئے ایسے اصحاب کی ضرورت ہے جو علوم مشرق و مغرب دونوں میں ماہر ہوں اور ایسے لوگ ہماری قوم میں شاذ و نادر ہیں۔" (۸) اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان انگریزوں سے نفرت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی اور اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔ اسلئے مسلمان انگریزی زبان نہیں سیکھتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں نے انگریزی زبان سیکھی اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔"

"اور دوسرا مرحلہ سرمایہ فراہم کرنے کا ہے کیونکہ جب تک ہزاروں نہیں لاکھوں کا سرمایہ نہ ہو اس قدر وسیع اور اہم کام خاطر خواہ طریقے پر کرنا ناممکن ہے تاہم چند مہینوں کی اپنی بساط بھر کوششوں کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس شعبہ کا کام استقلال اور ہمدردی سے چلایا جائے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور کچھ تعجب نہیں کہ چند سالوں میں کانفرنس کا یہ شعبہ سب سے زیادہ مفید اور کامیاب ثابت ہو۔" (۹)

"۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے شعبہ ترقی اردو کی بنیاد ڈالی گئی تھی انجمن ترقی اردو ۱۹۲۴ء میں ایک مستقل ادارہ بن چکی تھی اور اس کے علمی کاموں میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا۔ اب اردو لغت کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا تو مولوی عبدالحق اور زیادہ مصروف ہوگئے۔" (۱۰)

"گاندھی جی نے ایک نیا لسانی مرکز قائم کیا اور اپریل ۱۹۳۶ء میں اس سلسلے میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس کا دعوت نامہ مولوی عبدالحق صاحب کو بھی ملا۔ عبدالحق صاحب نے شرکت کی۔ انہیں یہ پورا پورا اندازہ ہو گیا کہ کانگریس والے نہ صرف اردو زبان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ بلکہ اردو رسم الخط کو بھی گوارہ نہیں کرتے۔" (۱۱)

"اس جلسے کی کاروائی کے بعد مولوی صاحب کو بڑی تشویش ہوئی۔ انہوں نے ایک خاص کانفرنس علی گڑھ میں اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بلائی جس کا موضوع تھا "اردو کے حفظ و امان و بقاء کی تجاویز" اس کانفرنس کے اختتام پر یہ طے پایا کہ اس تحریک کا محور انجمن ترقی اردو کو بنایا جائے اور اس کا صدر دفتر اورنگ آباد سے "دلی" منتقل کر دیا جائے۔

۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم فسادات میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر حملہ ہوا۔ اور انجمن کا سارا ریکارڈ تہس نہس ہو گیا۔ کتب خانہ خاص پر بھارتی حکومت نے قبضہ کر لیا۔ انجمن کا تقریباً تین لاکھ روپیہ جو امپیریل بنک حیدر آباد میں امانتاً رکھا تھا۔ وہیں روک دیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں مولوی صاحب نے تقریباً ۴۷ ہزار روپیہ اپنی تمام زندگی کی کمائی انجمن کو دے چکے تھے اور کچھ ذاتی روپیہ جمع ہوا تھا وہ بھی حیدر آباد میں رہ گیا۔

اسی بے سروسامانی کے عالم میں مولوی عبدالحق صاحب ۱۹۴۸ء میں کراچی پہنچ گئے"۔ (۱۲)

حالات اب یکسر بدل گئے تھے متحدہ ہندوستان میں اردو کو ہندی سے مقابلہ تھا۔ اگر تقسیم نہ ہوتی تو ہندوستان میں اردو زبان کو کیا درجہ دیا جاتا مولوی صاحب اس کی اس حیثیت کے لئے لڑ رہے تھے ہندوستان میں اردو کو رابطہ کی زبان یا قومی زبان قرار دلوانا دیوانے کے خواب سے کم نہ تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد جو مملکت وجود میں آئی تھی منطقی طور پر اس کی قومی زبان بھی اردو کو ہونا تھا۔ اور رابطے کی زبان تھی۔ عملاً تو اردو رابطے کی زبان تھی اور ہے مگر اس کو قومی زبان قرار دلوانا مولوی صاحب کا مقصد بن گیا۔ بظاہر یہ بہت آسان بڑا فطری اور منطقی کام تھا۔ مگر نو مولود مملکت میں مفادات اور مراعات یافتہ طبقات نے اپنے مفادات کی خاطر اس آسان کام کو دشوار ترین بنا دیا۔ یوں مولوی صاحب کے لئے اردو کا نفاذ ایک بار پھر بھاری پتھر بن گیا۔

"ہندوستان میں انجمن کی بربادی کا مولوی صاحب کو بڑا صدمہ تھا اور پھر ان کی صحت بھی خراب ہو گئی۔ مگر اپنی ہمت سے کراچی میں انجمن ترقی اردو کو از سرِ نو منظم کیا۔ اور زیادہ لگن اور محنت سے کام شروع کر دیا۔ نئی کتابیں اور معیاری مجلے پھر شائع ہونے لگے۔ مثلاً اردو سہ ماہی اجراء ۱۹۲۱ء میں ہوا شروع سے ہی سہ ماہی ہے۔ پہلا شمارہ جنوری تا مارچ، اپریل تا جون جولائی تا ستمبر، اکتوبر تا دسمبر (اورنگ آباد حیدر آباد دکن میں بابائے اردو کے ہاتھوں اجراء ہوا)۔ "قومی زبان" ماہانہ بڑی پابندی سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔

دو کتب خانے عام اور خاص قائم کئے گئے۔ اردو ٹائپ اور لیتھو کا مطبع بن گیا۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت نے "ترقی اردو بورڈ" قائم کیا اور اس کے لئے سب سے اہم کام یہ تفویض کیا گیا کہ زبان اردو کی ایک جامع لغت جدید اصولِ تحقیق کے مطابق تیار کرے۔ مولوی عبدالحق اس کے صدر مدیر بنائے گئے۔ اس ہی زمانے میں مرحوم نے "اردو یونیورسٹی" کی پرانی تجویز کو تازہ کیا۔ اور اہل ملک کو بار بار اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلایا۔ اور اس کی تائید و تبلیغ کے ارادے سے لاہور میں ۹ ۱۹۵۹ء میں ایک بڑی اردو کانفرنس منعقد کی جس کی صدارت مولوی عبدالحق صاحب نے فرمائی۔ (۱۳)

اردو آرٹس اور اردو سائنس کا پس منظر دراصل دلی کالج سے شروع ہوتا ہے۔ "دلی کالج" کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل میں آیا لیکن اس کی بنیاد اس سے بھی بہت پہلے ۱۷۹۲ء میں پڑ چکی تھی۔ دراصل ۱۷۹۲ء میں نظام الملک آصف جاہ کے صاحبزادے غازی الدین حیدر نے خوبصورت عمارت میں ایک مدرسہ قائم کیا جو مدرسہ غازی الدین حیدر کے نام سے مشہور ہوا۔ قیاس ہے کہ اس مدرسہ میں اس عہد کی مروجہ تعلیم ہی دی جاتی ہوگی بعد میں جب انگریزی علوم کا چرچہ عام ہونے لگا۔ اس ہی مدرسہ غازی الدین حیدر کی اینگلو عربک اسکول میں تبدیل کر دیا گیا اور پھر یہ اسکول ترقی کر کے "دہلی کالج" کہلانے لگا اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل وعقد کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو جدید تعلیم ان ہی کی زبان میں دی جائے۔ اس مقصد کے لئے برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۲۵ء میں ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم منظور کی اور ۱۸۲۵ء میں اس کالج کا افتتاح ہوا۔ اس کالج کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور ذریعہ تعلیم بھی السنہ مشرقی تھی دوسرے یہ کہ تعلیم کے فروغ کی وجہ سے وظیفے بھی دیئے جاتے تھے اور تیسرے یہ کہ سنسکرت اور عربی زبانوں کے فروغ کے لئے ان زبانوں میں تراجم کے لئے بڑی امداد دی جاتی تھی۔ (۱۴)

اگرچہ کالج کے قیام کے دس سال بعد ہی ۷، مارچ ۱۹۳۵ء کو "لارڈ ولیم بنٹنگ نے یہ طے کر دیا کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہلِ ہند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے اب تعلیم پر رقم خرچ کی جائے گی اور انگریزی زبان کے ذریعہ سے انگریزی ادب کی اشاعت پر خرچ کی جائے گی۔

گورنر جنرل کے اس فیصلے سے دیسی زبان میں تعلیم کے معاملہ کو سخت صدمہ پہنچا۔ بہت سے مدارس بند ہو گئے ملک میں عام بے چینی پیدا ہوئی یہاں تک کہ "لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ہو کر آئے اور انہوں نے مدرسوں کی سابقہ امداد بحال کر دی۔ اس پر آشوب دور میں بھی دلی کالج نے اپنی روایت کو قائم رکھا اور تعلیم وہ بھی مغربی علم کی تعلیم اردو زبان میں جاری رکھی۔ (۱۵)

انجمن کی پچاس سالہ تاریخ ہاشمی صاحب کی تالیف ہے اس میں انجمن کا پورا حال، انجمن کی تاریخ، مولوی عبدالحق صاحب کی خدمات اور مطبوعات کا پورا حال لکھا ہے مگر شہزاد منظر مرحوم انجمن کی تاریخ ایسی نہ لکھ سکے جیسی جمیل الدین عالی چاہتے تھے۔ بہر حال انہوں نے محنت ضرور کی تھی۔ اب عالی کا اردہ ہے کہ اس پر نظر ثانی کر کے چھپوا دیں گے۔

عالی کا تعلق دہلی سے ہے۔ لہذا جب انجمن دہلی میں آ گئی ۔ تو عالی نے اس کی لائبریری میں آنریری کام کیا۔ کیونکہ ان کی خاندانی روایت یہ تھی کہ شطرنج اور گنجفہ سکھانے کے ساتھ ساتھ یہ الگ طرہ امتیاز تھا کہ کسی کتب خانے میں کام کیا ہو پبلک کتب خانے تو کم ہوتے تھے۔ ایک بارڈنگ لائبریری تھی۔ بہت بڑی سرکاری لائبریری تھی لیکن اس زمانے میں علماؤ فضلاء کے ذاتی کتب خانے خاصے اچھے ہوتے تھے۔ خود عالی کی ننھیال والے مکان کے برابر منشی ذکا اللہ کا مکان تھا۔ ان کا کتب خانہ اوپر والی منزل میں تھا۔ عالی کے گھر کی چھت اس سے ملتی تھی۔ اس گھر میں منشی ذکا اللہ کی بہو رہتی تھیں۔

عالی اپنی چھت پر چڑھ کر منشی ذکا اللہ کے کتب خانے میں چلے جاتے اور وہاں چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ انہیں بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق رہا ہے ان کے اپنے گھر میں بھی بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ انجمن ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں دہلی آ گئی تھی۔ عالی اس وقت میٹرک میں تھے۔ جب سیکنڈ ائیر میں آئے تو کیفی صاحب نے پنڈت جی سے متعارف کرایا۔ انجمن میں عالی کے پھوپھی زاد بھائی سید ہاشمی فرید آبادی جو فرید آباد سے آئے تھے۔ وہ مولوی صاحب کے یہاں ملازم تھے۔ معاون اور شریک کار تھے۔ انہوں نے شاہد صاحب سے متعارف کرایا۔

کیفی صاحب نے کہا اس لڑکے (عالی) کو آپ ایک سیمسٹر کے لئے لائبریری میں رکھ لیں۔ (سیمسٹر ۳ مہینے کا ہوتا تھا)۔ انجمن کی اس وقت کی لائبریری اب کتب خانہ خاص کہلاتی ہے۔

دہلی میں ڈاکٹر انصاری کی نئی کوٹھی دریا گنج میں بنی تھی۔ اسمیں نچلی منزل بہت بڑی تھی۔ وہ انہوں نے لائبریری کے لئے مولوی عبدالحق کو دیدی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد سے انجمن کو دہلی میں منتقل کیا تھا۔ انہیں ایسی ہی بڑی جگہ کی ضرورت بھی تھی۔ اس تہہ خانے میں پورا کتب خانہ سما گیا۔ کیونکہ یہ جگہ بہت بڑی تھی۔ یہاں عالی کی آنکھیں کھلیں کہ ہزاروں کتابیں کیا ہوتی ہیں پھر ان کی ترتیب و کیٹلاگ کیسے ہوتے ہیں؟

شدید گرمی میں ڈھائی تین مہینے اس کتب خانے میں کام کیا۔ ان کا ملازم ساتھ جاتا تھا۔ جو پنکھا جھلتا رہتا تھا۔ لائبریرین اور دوسرے ملازمین الگ بیٹھے رہتے تھے۔ بلکہ اگر زیادہ گرمی ہوتی تھی تو وہ انجمن آتے بھی نہیں تھے۔ مولوی عبدالحق کے پاس پنڈت جی بیٹھے رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی آ کر پوچھتے رہتے کہ تو نے آج کیا لکھا ہے؟ یا کیا کر رہا ہے؟ دہلی میں انجمن سے بس اتنی وابستگی رہی یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔

عالی جب ۱۹۳۹ء میں میٹرک میں تھے۔ اس وقت انجمن کی سلور جوبلی کے موقع پر مشاعرہ میں عالی شریک ہوئے تھے۔ جب کراچی میں انجمن کا قیام ہوا تو ابن انشا، انجمن میں اکثر جایا کرتے تھے بلکہ مولوی عبدالحق صاحب کا ہاتھ بھی بٹایا کرتے تھے۔ عالی مصروفیت کی وجہ سے کم ہی جایا کرتے تھے۔ ایک کڑے وقت میں جس کے متعلق مولوی عبدالحق نے "انجمن کا المیہ" میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ "انجمن ترقی اردو" کے دفتر کا پانی بند کر دیا گیا، ان کا ٹیلی فون کاٹ دیا گیا بجلی کاٹ دی جاتی تھی۔ اس وقت تک اردو آرٹس کالج قائم ہو چکا تھا۔ اردو کالج کے چند اساتذہ

مولوی صاحب کی مخالفت کرر ہے تھے۔ انہیں پریشان کرر ہے تھےاوران کی مخالفت میں جگہ جگہ پوسٹر لگا دیئے تھے۔

یہ ۱۹۵۶ء کا زمانہ تھا۔ ابنِ انشاء عالی کو مولوی عبدالحق کے پاس لے گئے۔ مولوی صاحب اس وقت بہت پریشان تھے۔ عالی اس وقت انکم ٹیکس آفیسر تھے عالی کام کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے اور طاقت بھی۔ جب مولوی صاحب نے عالی کو سارا قصہ سنایا تو انہیں جوش آ گیا انہوں نے کہا کہ میں سب کو ٹھنڈا کر دونگا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔" اس کے بعد عالی نے اپنے انسپکٹروں اور کلرکوں کو پوسٹر دیئے انہوں نے آرام باغ اور برنس روڈ پر جہاں جہاں مولوی صاحب کی مخالفت میں پوسٹر لگے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ موافقت میں پوسٹر لگا دیئے۔ یہ کام راتوں رات ہو گیا۔ اس ہی طرح کے حالات میں ایک سال گزر گیا۔ اس دوران رائٹرز گلڈ کی بنیاد پڑ گئی۔ اس کی صدارت مولوی عبدالحق نے کی تھی افتتاحی اجلاس میں ایوب خان تشریف لائے تھے۔ قدرت اللہ شہاب صاحب نے بھی کافی کام کیا سیکریٹری سے مل کر ابنِ انشاء نے گلڈ کے لئے بھی بہت کام کیا۔ عالی انجمن کی خاطر اردو آرٹس کالج کے اساتذہ سے لڑتے رہے اور ان کی تحریکات کا منہ توڑ جواب دیتے رہے۔ کالج والے اساتذہ بھی ہار مان گئے۔

عالی شعروشاعری میں مصروف ہو گئے۔ ویسے بھی تحقیقی کام اور مخطوطات سے عالی کو دلچسپی بھی نہ تھی۔ بہرحال ابنِ انشاء مولوی عبدالحق کے بہت قریب رہتے تھے۔ اور بہت کام کیا کرتے تھے۔ بلکہ مولوی صاحب تو انہیں پروجیکٹ دیا کرتے تھے۔ ابنِ انشاء پر مولوی صاحب کو بہت اعتماد تھا۔

فضلی صاحب، رازی اور ممتاز صاحب سب نے انجمن کو خیرباد کہہ دیا وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ کچھ اور لوگوں کے نام بھی تھے جو "انجمن کا المیہ" میں لکھے ہیں۔

عالی نے ابنِ انشاء کو شہاب صاحب سے متعارف کرایا کیونکہ اس وقت ابنِ انشاء کی ملازمت کا مسئلہ تھا۔ عالی نے ابنِ انشاء سے کہا" تمہاری میری دوستی ہے میں تم سے کہہ سکتا ہوں لیکن شہاب صاحب سے نہیں کہہ سکتا۔ اب تم اردو کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کو شہاب صاحب سے ملواؤ کہ ایوب خان سے کہہ کر اردو کو قومی زبان منوانے کے لئے احکامات جاری کرا دیں۔"

حالانکہ شہاب صاحب انجمن کے سلسلے میں کبھی مولوی عبدالحق سے نہیں ملے تھے مگر ابنِ انشاء کے کہنے پر شہاب صاحب نے ایوب خان سے مولوی صاحب کو ملوا دیا۔ ایوب خان نے عبدالحق صاحب کی بات غور سے سنی انجمن کے مسائل کے سلسلے میں ایک انکوائری کمیٹی بٹھائی۔ اس نے رپورٹ پیش کی کہ نظماء نے انہیں بہت ستایا ہے۔ انجمن کے پاس روپیہ نہیں ہے اردو آرٹس کالج کی حالت بہت خراب ہے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں ایوب خان نے فوراً مارشل لاء" قانون" بنا دیا اور انجمن کا دستور توڑ دیا۔ پرنسپل کو برطرف کر دیا۔ مولوی صاحب کو صدر بنا دیا۔

چیف کمشنر کراچی کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مقرر کیا اور انہیں ہدایت کر دی کہ انجمن کو پیسے دلوائیں از سرِ نو تنظیم

کریں۔اس ہی دوران عالی صاحب ایوان صدر پہنچ گئے۔

ورکنگ کمیٹی میں عالی اور ریاض الحسن کو نامزد کیا۔مولوی صاحب پریشان تھے۔کیونکہ حالات ویسے ہی تھے پیسوں کا بھی انتظام نہیں ہوا تھا اور ابھی تک دستور بھی نہیں بنا تھا۔فیلو شپ آٹھ مہینے میں آئی۔

عالی نے ایوب خان سے ملاقات کی تو انہوں نے کہا تم نے چارج نہیں لیا ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔عالی کو ایوانِ صدر میں آئے ہوئے دس،بارہ دن ہی ہوئے تھے کہ چیف کمشنر کراچی نے انجمن کے معاملے میں میٹنگ کے دوران بیس ہزار روپے دلوانے کا اعلان کیا انہوں نے کہا۔"ابھی تو میں دلوادیتا ہوں بعد میں دیکھیں گے۔"

ایوب خان نے دستور بنانے کے لئے چیف منسٹر کو مقرر کیا تھا پھر عالی صاحب سے بھی کہا کہ دو مہینے میں انجمن کا دستور بنائیں۔چیف منسٹر کی خصوصی توجہ سے دستور کا خاکہ تو بن گیا تھا۔اس دوران مولوی عبدالحق بیمار ہو گئے انہیں کینسر تھا۔جسے وہ چھپاتے تھے۔جب عالی کو پتہ چلا کہ مولوی صاحب شدید علیل ہیں تو وہ یونیسکو سے آگئے وہ وہاں فیلو شپ پر گئے تھے لیکن دو مہینے پہلے ہی لوٹ آئے۔۱۶،اگست ۱۹۶۱ء کو مولوی عبدالحق کا انتقال ہو گیا۔۱۹۶۰ء میں مولوی عبدالحق صاحب آنکھ بنوانے کے سلسلے میں زیرِ علاج رہے۔۱۹۶۱ء کی گرمیوں میں آنتوں کی پرانی شکایت نے زور پکڑ لیا پھر سرطانِ جگر نے آگھیرا آخر کار ۱۶،اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں وفات پائی اس وقت ان کی عمر ۹۲ سال چند ماہ تھی۔(۱۷)

اردو آرٹس کالج کے قریب شاردا مندر ہے اس میں گاندھی جی کے ہاتھ کا لگایا ہوا ایک درخت اب تک موجود ہے۔یہیں انجمن کا دفتر تھا۔پیر الٰہی بخش صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب کو شہاب الدین راشدی اور بڑے راشدی صاحب کے کہنے سے یہ جگہ تلاش کر کے مولوی صاحب کو دی تھی یہ جگہ بہت بڑی ہے اور پنجرہ پور ٹرسٹ کی ملکیت مانی جاتی تھی جو اس وقت تک محکمہ اوقاف بن گیا تھا۔ان لوگوں کے خط آتے رہتے تھے کہ آپ لوگ کرایہ دید یجئے پنجرہ پورٹ وفاقی محکمہ اوقاف میں شامل تھا۔محکمہ اوقاف کا مرکزی دفتر لاہور میں تھا ویسے صوبائی محکمہ اوقاف کے دفاتر ہر صوبے میں قائم ہو چکے تھے۔

انجمن کے پاس پیسے نہ تھے اتنی بڑی جگہ کا کرایہ کہاں سے دیتے بلکہ ٹرسٹ کی طرف سے یہ خطوط بھی آئے کہ اگر آپ کرایہ دیدیں تو ہم بلڈنگ کی مرمت کرادیں گے۔یہ بات عالی صاحب سمجھ رہے تھے کہ اگر ہم نے کرایہ نہ دیا تو کسی نہ کسی دن یہ بلڈنگ ہمیں خالی کرنی پڑے گی۔لہذا عالی صاحب نے سوچا کہ اگر مولوی عبدالحق صاحب کو بجائے قبرستان کے یہیں انجمن کے دفتر میں دفنادیں تو یہ بلڈنگ ہمیشہ کے لئے انجمن کی ہو جائے گی۔

واقعہ تدفین:۔

۱۷،اگست ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔صدر تھانہ کمشنر کراچی آغا حمید تھے۔اس روز وہ اپنے اہلِ خانہ کو لے کر کلفٹن گئے ہوئے تھے عالی نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے رات کو میت کو روک لیا اور انجمن ہی میں رکھ کر چند طلبہ لیڈر

زگی ڈیوٹی لگادی کہ وہ میت کے قریب پہرہ دیں۔ پنکھا جھلیں کیونکہ موسم گرم تھا۔ ان لیڈروں میں علی مختار رضوی بہت چاق و چوبند اور محنتی لیڈر رہتے یوں تو سب ہی بڑے جی دار تھے۔ کچھ لوگ میت کے قریب پنکھا جھلتے رہے اور چند لڑکوں نے انجمن کے صحن میں مولوی صاحب کی قبر رات کے اندھیرے میں کھود لی۔

صبح ۱۱ بجے عالؔی نے میٹرو پولیٹن کے وائس چیئر مین خان بہادر حبیب اللہ خان کو بلوایا۔ اور ان سے کہا کہ آپ ۱۰،۱۰ گز کے دو پول لے کر آیئے ان پر جنازہ اٹھائینگے تاکہ بہت سے لوگ کندھا دے سکیں۔ شہر میں گھمائیں گے۔ آپ اپنی فیکٹری کے لوگوں کو بلالیں۔ میں طلبہ کو بلا لیتا ہوں۔ وہ اس کام کے لئے تیار ہو گئے اور پھر وہ وائس چیئر مین بھی تھے۔

عالؔی اور سب لوگ مولوی صاحب کا جنازہ بندر روڈ پر لے کر چلے لیکن گھوم کر جب دوبارہ کالج کی طرف مڑے تو D.I.G کھڑا تھا۔ اس نے ٹوکا آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں کونسے قبرستان میں جائنگے، عالؔی نے کہا۔ کالج کی طرف سے ہوتے ہوئے ہم آگے چلے جائنگے۔ اس وقت تک ہزاروں آدمی جمع ہو چکے تھے عالؔی نے اشارہ کر دیا اور جنازہ انجمن کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ پولیس والوں نے روکنا چاہا D.I.G صاحب نے S.P صاحب کو فون کر دیا۔ کہ "فوراً آیئے کچھ کیجئے۔" S.P صاحب میاں بشیر بہت سخت آدمی تھے۔ دس بیس ہزار کے مجمع سے گزر کر کالج تک پہنچتے پہنچتے انہیں دیر لگ گئی اتنی دیر میں مولوی صاحب کو دفنایا جا چکا تھا۔ میاں بشیر صاحب نے عالؔی سے کہا "یہ آپ کیا کر رہے ہیں عالؔی صاحب نے کہا" ان کو یہاں دفن کر رہے ہیں کیونکہ یہیں ان کی عمر گزری ہے۔" S.P صاحب نے کہا "یہ قبرستان نہیں ہے اس کی آپ کو اجازت لینی پڑے گی۔ ہر جگہ دفن نہیں کر سکتے یہ تو ایسا ہے جیسے آپ نے گھر میں دفن کر دیا۔" عالؔی نے کہا اب تو یہ ہو رہا ہے میاں بشیر صاحب نے کہا" پھر میں گرفتاری کھول دونگا" عالؔی صاحب نے کہا۔" کھول دیجئے "اس وقت علی مختار رضوی اور سب لوگ سینہ تان کر آگے کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی تمام لڑکوں نے صفیں بنالیں کہ ہمیں گرفتار کر لیں عالؔی نے کہا گرفتار کرنا شروع کر دیں۔ میاں بشیر صاحب نے عالؔی صاحب سے کہا" آپ مارے جائنگے "اس وقت عالؔی صاحب ایوانِ صدر میں تھے یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے۔ میاں بشیر صاحب نے کہا۔" میں صدر ایوب خان سے شکایت کر دونگا۔

صدر صاحب کا تعزیتی بیان عالؔی صاحب نے خود چھپوایا تھا اور عالؔی نے انہیں بتایا کہ ایوب خان مولوی صاحب کے علی گڑھ کے شاگرد ہیں۔ اس پر میاں بشیر صاحب بڑے پشیمان ہوئے اور قدرت اللہ شہاب صاحب کو فون کرنا چاہا۔ وہ اس وقت کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔ آغا حمید صاحب ہاکس بے گئے ہوئے تھے وہاں کوئی فون نہیں تھا۔ جب وہ شام کو گھر آئے تو انہوں نے عالؔی کو بلوایا اور پوچھا کہ یہ کیا حرکت کی ہے عالؔی نے کہا۔ "جی اس لئے یہ حرکت کی ہے" کہ دیکھیں مولوی صاحب کو کون باہر نکالتا ہے۔ اب تو یہ بلڈنگ ہماری ہو گی۔ اس دوران ہی آغا حمید صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا اور عالؔی کے ساتھ جی اے مدنی صاحب آغا حمید صاحب کی جگہ آگئے۔ مگر وہ بھی کیا کر سکتے تھے لیکن انہوں نے کہا میں اسے منظور تو نہیں کر سکتا بس تم نے دفن کر دیا۔ مطلب یہ کہ کوئی دشمنی نہیں چلی اور آغا صاحب بھی پھر ہنس کر رہ گئے۔ کچھ دن بیان بازی بھی

عالی کرتے رہے۔ آغا حمید صاحب کیونکہ مولوی صاحب کے جنازے میں شریک نہ تھے۔ انہوں نے کہا مجھے اطلاع نہیں تھی کیونکہ اس روز ہا کس بے گئے ہوئے تھے اور ہم انہیں تدفین کے وقت کی اطلاع نہ دے سکے تھے۔ انہوں نے کہا میں آتا اگر مجھے خبر ہو جاتی۔

ایوب خان جب کوئٹہ سے آئے تو عالی نے ان سے کہا۔" آپ مولوی صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنے چلئے۔ صدر صاحب کو لے کر عالی جب مولوی صاحب کی قبر پر پہنچے تو ہزاروں آدمی جمع ہو چکے تھے۔ خوب تصاویر کھینچی گئیں۔ یہاں سے فرصت پا کر عالی صدر ایوب خان کو اوپر لائبریری میں لے گئے۔ مارشل لاء والوں نے یہاں تالے ڈال رکھے تھے۔ کتب خانہ خاص بھی مارشل لاء والوں نے بند کر دیا تھا۔ ایوب خان نے کہا بھئی کھولو تالا۔ لائبریری کو کیسے بند کر رکھا ہے۔ کتب خانہ خاص بھی کھول دیا گیا اس کے بعد سے یہ بلڈنگ انجمن کے پاس ہے۔ کبھی کبھی خط آتا ہے۔ کہ کرایہ دیں تو یہ لوگ جواب دیدیتے ہیں کہ مولوی صاحب سے لیں۔

ایوب خان نے ڈھائی ہزار روپے دیئے تھے اس سے مولوی صاحب کی قبر پکی کرادی گئی تھی۔ اب جس کا جی چاہے توڑے پھوڑے اسکو۔ یا مولوی صاحب کو نکالے گا تب کہیں جاکے انجمن پر اور کالج پر قبضہ کرے گا۔ یہ بڑے تاریخی واقعات قوانین شکنی کے ہیں۔ (۱۸)

انجمن ترقی اُردو اور جمیل الدین عالی کی خدمات

کوئی تحریک ہو یا ادارے کا قیام اسے فعال بنانے کے لئے صرف عہدے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی شخص کا وہ جذبہ ہوتا ہے جو خود اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے اور اس کا تعلق فرد کی اپنی ذات اور روح سے ہوتا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی ادارے یا تحریک کے روحِ رواں کے انتقال کے بعد یا تو یہ ادارہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے یا اگر ادارہ قائم بھی رہا تو بے مقصد ہو جاتا ہے جس کا ہونا نہ ہونا برابر رہتا ہے۔ ۱۶، اگست ۱۹۶۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کے بارے میں بھی لوگوں نے سوچا کہ:

ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

واقعی مولوی عبدالحق اپنی ذات میں ایک انجمن ہی تو تھے۔ جتنی محنت اور لگن سے وہ کام میں منہمک رہتے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب ضرورت تھی کہ مولوی صاحب کے بعد جو شخص اس منصب پر فائز ہو۔ وہ اتنا ہی محنتی، فعال اور بے غرض ہو۔ ہوا یہ کہ ان کی جگہ پر فائز ہونے والا شخص ان سے دو قدم آگے محنتی اور فعال نکلا"۔ (۱۹)

وہ شخصیت ہیں" جمیل الدین عالی "شروع شروع میں ان کا ارادہ انجمن کے عملی کاموں میں حصہ لینے کا نہ تھا۔ کبھی کبھی مولوی صاحب کو سلام کرنے چلے جایا کرتے تھے۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ وہ یہ کہ عالی کے پھوپھی زاد بھائی نواب منظور یار جنگ حیدرآباد دکن میں مولوی عبدالحق صاحب کے بڑے اچھے دوست تھے۔ اختر حسین اور سید ہاشمی فرید آبادی

سے خصوصی روابط رہ چکے تھے۔ایک زمانے میں مولوی عبدالحق بہت پریشان تھے۔ جب گورنمنٹ کی طرف سے انجمن کی گرانٹ روک دی گئی تھی۔تو ابنِ انشاء عالی کو مولوی عبدالحق کے پاس لے گئے۔(۲۰)

عالی صاحب اس زمانے میں ایوانِ صدر میں تعینات تھے ان کے اثر ورسوخ سے گرانٹ بحال ہوئی اور انجمن کے ارباب حل وعقد نے ان کو منتظمہ کا رکن نامزد کیا۔اس کے بعد دوڈھائی سال تک عالی منتظمہ انجمن میں نامزد رہے اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے قائم کردہ اردو آرٹس کالج اور اردو سائنس کالج کا معتمد اعزازی رہے اور اب یہ کالج ۱۹۷۳ء میں قومیا لئے گئے مگر قومیانے سے قبل تک ان کالجوں کے کرتا دھرتا رہے اور ان کالجوں کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔عالی آج بھی انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی ہیں۔

لاء کالج میں بھی اردو کو ایل ایل ایم کا ذریعہ تدریس بنانے کے لئے عالی نے بڑی جدوجہد کی تھی۔(۲۰)

۱۹۶۲ء میں مارشل لاء کا زمانہ تھا ایک سرکاری حکم کے تحت انجمن کی نئی انتظامیہ تشکیل دی گئی۔اس کے صدر اختر حسین رائے پوری اور معتمد اعزازی جمیل الدین عالی بنائے گئے۔مولوی صاحب ایسے لوگوں سے بہت گھبراتے تھے۔(۲۱)

"ان کی زندگی کے آخری دنوں میں دوریٹائرڈ اعلیٰ افسروں کو جو شاعر بھی تھے انجمن کا معتمد بنانے کی تجویز زیرِ غور آئی تو مولوی عبدالحق نے فرمایا" پھر انجمن کا نام "بیت الغزل" رکھنا پڑے گا۔کیونکہ مشاعرہ گاہ کے لئے یہ نام موزوں ہے" ۔(۲۲)

میں سمجھتی ہوں کہ جب کوئی ذمہ داری کسی کو سونپی جائے یا خود کسی کام کو کرنے کا بیڑا اٹھا لے تو اس وقت ہی انسان کی صلاحیتوں کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔

کچھ ہی عرصہ میں اندازہ ہوگیا کہ اختر حسین (مرحوم) صرف بیوروکریٹ نہیں تھے اور عالی صرف شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں اعلیٰ درجہ کے منتظم ہیں جب ہم ابتداء سے عالی صاحب کی خدمات کا اندازہ لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے عالی نے اور لوگوں کو ساتھ لیکر انجمن ترقی اردو کو ہی فعال ادارہ نہیں بنایا بلکہ عبدالحق صاحب کو بھی زندہ رکھا ہے(۲۳)

وہ اس طرح کہ انجمن ترقی اردو سے شائع ہونے والی کتاب پر حرفے چند مولوی عبدالحق خود کتاب پڑھ کر لکھتے تھے تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ کتاب کس معیار کی ہے۔اس سے اردو ادب میں کیا اضافہ ہوگا اور قاری اس کتاب سے کیا استفادہ کرسکتا ہے۔یہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد اس ذمہ داری کا بیڑا جمیل الدین عالی نے اٹھالیا۔عبدالحق جیسے دیوقامت انشاءپرداز کی روایت کو قائم رکھنا ایک چیلنج تھا۔عالی نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے اور اب عالی نے جس محنت، لگن اور جانفشانی سے یہ حرفے چند لکھے ہیں۔وہ مصنف کے لئے سرمایہ حیات ہے اور اردو ادب میں یہ حرفے چند بے بہا اضافہ ہیں عالی جی مغل ہیں مگر کام "سید" کی طرح کرتے ہیں۔عالی کی نیک نیتی اور صاف گوئی کی بدولت جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔اسے پایہ تکمیل پہنچانے میں سازگار حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔انجمن اور اردو کالج

سے اس وقت وابستہ ہوئے جب دونوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ عالی نے کہا اختر حسین رائے پوری مرحوم کی ایک خوبی یہ تھی وہ کم گو تھے ۔ مگر اپنا کام بڑی لگن اور خاموشی سے کرتے تھے ۔ ان کی سرپرستی میں ان اداروں کو نئی زندگی ملی ۔

عالی ڈاکٹر عبدالحق کے ایسے ابتدائی رفیق کار بنے کہ ان کے انتقال کے بعد بھی اپنی بنکاری کی مصروفیات، ادبی مشاغل، اور صحافتی تحریروں اور سفرناموں کے باوجود انجمن کے روزمرہ کے امور اور مالی وانتظامی معاملات سے بھی کبھی غافل نہ رہے ۔ اور آج انجمن جس قدر فعال ہے ۔ وہ عالی ہی کی ان تھک محنت اور ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہے ۔" (۲۴)

گذشتہ برسوں میں "انجمن ترقی اردو" کو فعال بنانے کے ساتھ ساتھ اردو آرٹ کالج کو ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ بنانے اور اردو سائنس کالج" قائم کرنے میں عالی نے جدوجہد کی ہے اسکی تفصیل اگلے اوراق میں ہے ۔ علمی وادبی کاموں کی جو روایت ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ڈالی تھی ۔ جمیل الدین عالی نے اسے نہ صرف مکمل کیا بلکہ اسے موجودہ تقاضوں کے مطابق آگے بھی بڑھایا ہے ۔ عالی مولوی عبدالحق کے صحیح جانشین ثابت ہوئے ہیں ۔" انجمن ترقی اردو" کی شائع شدہ کتابوں کے دیباچوں کے تین مجموعے "حرف چند" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں ۔ یہ وہ دیباچے ہیں جن میں جمیل الدین عالی کی فلسفیانہ اور دانشوارانہ سوچ بھرپور انداز میں سامنے آئی ہے ۔ (۲۵)

آرٹس اردو کالج کا قیام :-

"اردو کالج کے سلسلے میں حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ نے بڑا کام کیا ۔ جامعہ عثمانیہ غیر منقسم ہندوستان میں ماڈل کا درجہ رکھتی تھی ۔ پاکستان بننے کے بعد کئی کالج کھلے لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اردو کالج اور پھر اردو یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنایا ۔ اردو کالج میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستانی بچوں کی مادری زبان اردو ہے اور جن علاقوں کی مادری زبان اردو نہیں بھی ہے ۔ مگر وہاں بھی یہ زبان آسانی سے سمجھی جاتی ہے کیونکہ پاکستان میں اردو رابطے کی زبان ہے اور اب تو اردو کو سرکاری زبان مان لیا گیا ہے ۔ اپنی زبان میں تعلیم کے کسی بھی مضمون کے عنوان کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے ۔ لیکن کسی دوسری زبان میں حاصل کی ہوئی تعلیم آدھی رہ جاتی ہے ۔

بعض طلبہ میٹرک کے بعد کورس کو انگریزی زبان میں دیکھ کر پریشان ہوجاتے ہیں ۔ ایک تو انگریزی کی کتابیں مہنگی ہوتی ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں عام طور پر اردو بولی جاتی ہے ۔ اس لئے طلبہ کو کورس کی تکمیل کے لئے ٹیوشن کا سہارا لینا پڑتا ہے" ۔ (۲۶)

"اردو کالج ایک مثال ہے ۔ اس طرح کے کالج پاکستان میں زیادہ کھلنے چاہئیں ۔ تاکہ سب کو اندازہ ہو کہ اردو زبان میں فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی ہر شعبہ تعلیم میں تعلیمی عمل جاری رکھنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ (۲۷)

اردو سائنس کالج :-

"بالآخر بے سروسامانی کے باوجود جون ۱۹۵۲ء میں سائنس سال اوّل میں داخلہ شروع کیا گیا ۔ اس وقت طلبہ کے

لئے کرسیاں اور اساتذہ کے لئے کرسیاں تک نہ تھیں۔ مگر طلبہ میں ایک جوش اور جذبہ تھا کہ اردو کے فروغ اور اپنے مستقبل کے لئے اردو کے فروغ اور اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں جو کشش ہے اس بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ پھر اس کالج کی فیس بھی تمام کالجوں سے کم رکھی گئی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ اس سے استفادہ کرسکیں۔

ابتداء میں طبیعیات اور کیمیا کی تدریس شروع کی گئی۔ پھر آہستہ آہستہ تمام سائنسی مضامین پڑھانے کے لئے اساتذہ کا انتظام کرلیا گیا۔

شعبہ تجارت (کامرس)

انٹر کامرس، بی کام کی کلاسیں پہلے ہی شروع کی جاچکی تھیں جنہیں شام کی شفٹ میں رکھا گیا تھا۔ اب ایم کام کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں۔

شعبہ قانون:

قانون کا شعبہ بھی شام کی شفٹ میں رکھا گیا ہے۔ اس سے آفس میں کام کرنے والوں کو بڑی آسانیاں ہوگئی ہیں۔

دونوں کالجوں (آرٹس اور سائنس) کا رزلٹ گورنمنٹ کالجوں سے اچھا آتا تھا۔ اب یہ کالج گورنمنٹ نے لے لئے ہیں پھر معیارِ تعلیم کے لحاظ سے بہتر کالجوں میں شمار ہوتے ہیں۔ (۲۸)

وزیرِ اعظم کی تشریف آوری:

اردو آرٹس کالج ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے قائدِ ملت جناب لیاقت علی خان وزیرِ اعظم پاکستان کو کالج کے دورے کی دعوت دی۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان کالج تشریف لائے۔ اساتذہ کو پڑھاتے دیکھا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ان کے ساتھ، بیگم رعنا لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، (گورنر پنجاب) خواجہ شہاب الدین، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نیز دیگر عمائدین بھی ساتھ تھے۔ (۲۹)

"۷، اگست ۱۹۴۹ء کو سندھ کے وزیرِ اعلیٰ یوسف عبداللہ ہارون اور شعیب قریشی نے کالج کا معائنہ کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کا استقبال کیا۔ انجمن کے مختلف شعبے کتب خانہ اور نادر مخطوطات کا معائنہ کرایا۔

۳۱، اگست ۱۹۴۹ء کو صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ خان عبدالقیوم خان اردو کالج کے معائنہ کے لئے تشریف لائے اور بہت مطمئن ہوکر گئے۔

اردو کالج کی مالی حالت درست کرنے کے لئے اور مستقبل کے پروگرام پر عمل درآمد کرنے کا مرحلہ زیرِ غور تھا۔ سردار عبدالرب نشتر، کالج کے پرنسپل میجر آفتاب حسن، آغا محمد اشرف اور سید ابوالخیر کشفی وغیرہ نے یہ تجویز پیش کی کہ "ہفتہ طلبہ" منایا جائے اس میں آمدنی کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔" (۳۰)

"ہفتہ طلبہ میں مذاکروں، مباحثوں اور دوسرے پروگراموں کے علاوہ مشاعرہ بھی شامل تھا۔ مشاعرے کی

صدارت جناب زیڈ اے بخاری نے کی شریک مشاعرہ مولانا ماہر القادری، حفیظ ہوشیار پوری، شاعر لکھنوی جمیل الدین عالی ، اقبال صفی پوری، حکیم تاج محمد خیال، اور فاروق محشر بدایونی تھے۔

رقم کی فراہمی کے لئے پرنسپل صاحب نے ۵، ۵ لڑکوں کی ٹولیاں بنادیں۔ کہ جو ٹولی زیادہ پیسے جمع کرے گی اس کا نام (HONOURS BOARD) پر لکھا جائے گا۔ اور انہیں انعامات بھی دیئے جائنگے۔" (۳۱)

لوگوں کے دماغ میں وہ بات تھی کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے سر سید احمد خان نے کس طرح دردر جا کر چندہ وصول کیا۔ یہی کام اردو کالج کے لئے کرنا ہوگا۔ واقعی طلبہ نے جس جوش وخروش اور جذبہ کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیا وہ قابلِ تحسین تھا۔ ان طلبہ کے نام جنہوں نے سب سے زیادہ رقوم جمع کرائیں۔

(۱) افتخار الاحد (۲) ممنون احمد مرغوب (۳) سید فخرِ عالم (۴) داؤد محمد اختر (۵) عمر بخش سیون

دوسری جانب گورنمنٹ نے گرانٹ میں ستر ہزار کی کمی کر دی جس کے مختلف اخباروں نے اداریئے لکھے۔ ڈان، ٹائمز آف کراچی۔ پاکستان ٹائمز (لاہور) امروز (لاہور) جنگ کراچی، انجام (کراچی قابلِ ذکر ہیں۔ (۲)

خواتین کے لئے اردو کالج کا قیام:

۱۹۵۵ء میں کچھ " کو " ایجوکیشن کالجوں نے طالبات کو کالج چھوڑ دینے کے نوٹس جاری کر دیئے جب کہ طالبات کے لئے کالجوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر مولوی عبدالحق کو خواتین کالج قائم کرنے کا خیال آیا۔ اور انہوں نے ۱۶، جون ۱۹۵۵ء کو کراچی کی معزز خواتین کا جلسہ طلب کیا اور یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا۔ تمام خواتین نے اس سلسلے میں بھر پور تعاون کا یقین دلایا۔

انجمن ترقی اردو کی مجلسِ منتظمہ کے جلسے میں بیگم محمد شریف (صدر انجمن ترقی اردو خواتین شاخ) نے ایک قرارداد میں خواتین کالج کی ضرورت کو پیش کیا۔ یہ قرارداد فوراً منظور کی گئی۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے ۱۹۵۵ء کے وسط میں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں اردو خواتین کالج قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

۲۶ جون ۱۹۵۵ء کے منعقدہ جلسہ میں شریک خواتین۔

(۱) بیگم محمد شریف (۲) بیگم عبدالحفیظ (۳) بیگم سروری عرفان اللہ (۴) بیگم ارجمند بانو قزلباش

(۵) بیگم ایل۔ آر خان (۶) بیگم نصیر احمد قریشی (۷) بیگم قدسید احمد (۸) بیگم درّانی

(۹) بیگم سید حسن فراز (۱۰) بیگم شوکت علی خان (۱۱) بیگم خورشید بشیر (۱۲) بیگم حامد النساء

(۱۳) بیگم اسمٰعیل صدیقی

مضامین پڑھانے کے لئے بہت سے لائق اساتذہ کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔" (۳۲)

"بہت جلد اس کالج میں سائنس اور کامرس کلاسز کا اعلان کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی اردو (خواتین شاخ) پاکستان کا سالانہ جلسہ بابائے اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں اردو خواتین کالج کا نظم ونسق چلانے کے لئے بیگم ایم۔ این خان، بیگم عرفان اللہ، بیگم حسن فیروز، بیگم این۔ آر خاتون اور بیگم بلقیس درانی پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی قائم کی گئی۔ اس دور کے وزیر مہاجرین سردار امیر اعظم نے ایک عمارت خواتین کالج کو الاٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ طے پایا کہ متوقع عمارت کے حصول کے بعد کالج کو انجمن کی عمارت سے منتقل کر دیا جائے گا۔

اس دوران انجمن ترقی اردو میں بعض ایسے ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے خواتین اردو کالج بنانے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ ۱۹۵۵ء سے بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو کو پاکستان کی قومی زبان منظور کرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ (۳۲)

"کالج کی عمارت کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے ایک اسکیم بنائی جس کے تحت ایک، پانچ اور دس روپے والے ٹکٹ چھاپے گئے۔ اختر حسین صاحب کہتے تھے کہ "ایک آدمی سے =/100 روپے لینے کی بجائے 100 آدمیوں سے ایک ایک روپیہ حاصل کریں۔ (۳۳)

اُس سے اندازہ ہو جائے گا کہ اردو بولنے والے کتنے ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ اردو کالج کے لئے ان لوگوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جن کی مادری زبان اردو نہ تھی۔ لیکن وہ اردو زبان کی اہمیت سے واقف تھے۔

اردو کالج کو گورنمنٹ کی طرف سے ایک لاکھ روپے ملتے تھے۔ لیکن بعد میں اختر حسین صاحب۔ اور جمیل الدین عالی صاحب کی کوششوں سے اس میں ایک لاکھ تیس ہزار کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ صدر انجمن کی اپیل پر عوام نے بھی ۲۵ ہزار روپے بطور عطیہ دیئے۔

شعبہ قانون:

اردو آرٹس اور اردو سائنس کالج میں کامرس کے علاوہ اردو میں "قانون" کی تعلیم کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ جو جمیل الدین عالی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ جسٹس وحید الدین نے "بزمِ قانون" کا اجراء کیا۔ اس بزم کے زیر اہتمام ایک علمی جریدہ "القانون" جاری ہوا۔ اس موقع پر انجمن ترقی اُردو کے صدر جناب اختر حسین صاحب نے اپنے پیغام میں کہا کہ "ہماری زندگی میں تعلیمی محاذ پر اُردو کالج جو اہم کارنامے انجام دے رہا ہے۔ "القانون" کا اجراء اس کا ثبوت ہے۔" (۳۴)

"اردو ایک عرصہ تک متحدہ ہندوستان کی قانونی زبان رہی ہے۔ اور اب بھی پاکستان کے بیشتر حصوں میں عدالتی معاملات میں اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ (۳۵)

"قانونی موضوعات پر اردو میں کتابیں موجود ہیں۔

اسی دوران شعبہ تجارت نے "مجلّہ تجارت" اور شعبہ سائنس نے "مجلّہ سائنس" شائع کیا۔ (۳۶)

صدر ایوب خان نے اردو کالج میں ذاتی دلچسپی لی اور اختر حسین صاحب اور جمیل الدین عالی کی کوشش کے نتیجہ میں جنرل ایوب خان نے پانچ لاکھ روپے کی خصوصی امداد دی جس سے کالج کے تمام سابقہ خساروں کا مداوا ہو گیا۔

اقامتی اردو کالج کے قیام اور اس کی نئی عمارت کے لئے امداد کی جو مہم شروع کی گئی تھی۔ اس کے سلسلے میں ۵ مارچ ۱۹۶۶ء کو کمشنر کراچی جناب سیّد دربار علی شاہ بلدیہ کراچی نے ایک لاکھ روپے کا چیک صدر انجمن ترقی اردو کو پیش کیا۔ اقامتی کالج کے لئے کے۔ڈی۔اے کی گورننگ باڈی نے ۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو گلشن اقبال اسکیم ۲۴ میں بیس ایکٹر زمین رعایتی قیمت پر دینے کا فیصلہ کیا جسے انجمن نے بخوشی قبول کرلیا۔ یہ زمین ۱۲ روپے کے بجائے صرف چار روپے فی مربع گز کے حساب سے دی گئی۔ اس کے علاوہ کھیل کود کیلئے کھلی ہوئی جگہ دس ایکٹر دو روپے فی مربع گز کے حساب سے دی گئی۔ (۳۷)"

کالج کے احاطے میں مسجد کی جگہ مفت دی گئی اس طرح بیس ایکٹر زمین کی اصل قیمت گیارہ لاکھ اکسٹھ ہزار چھ سو روپے تھی۔ (۳۸)

"لیکن یہ زمین انجمن کو صرف دو لاکھ نوے ہزار چار سو روپے میں دی گئی۔ مزید سہولت کے لئے دس سالہ قسطوں میں ادا کرنے اور سود نہ دینے کا بھی اعلان کیا گیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۶۷ء کو صدر ایوب خان نے اقامتی کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔"
(۳۹)

"اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مشہور ماہر تعمیرات جناب پٹیل کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اور ان سے کالج کا نقشہ بنوایا گیا۔ اس کے بعد ایک ذیلی کمیٹی ترتیب دی گئی، جس میں صدر انجمن جناب اختر حسین، جناب نذیر احمد، جناب ممتاز حسن، بلدیہ کراچی کے وائس چیر مین اور اردو کالج کے پرنسپل جناب کرنل عطاء الرحیم (کنونیر) شامل تھے۔

کالج کے بڑھتے ہوئے اخراجات میں ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کالج کے اساتذہ کو تنخواہیں نہ دی جاسکیں۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اختر حسین صاحب اور جمیل الدین عالی سخت پریشان تھے۔ امداد کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی عید الفطر میں چند دن باقی رہ گئے تھے۔ لہذا اختر حسین صاحب اور جمیل الدین عالی نے اپنی ذاتی جائیداد گروی رکھ کر اردو کالج کے اساتذہ کو تنخواہیں دیں اور دوسرے عملے کا بھی حساب بے باق کیا گیا۔" (۴۰)

"ان ہی دنوں ایک ثقافتی وفد چین کے دورے پر روانہ ہوا۔ ان میں جمیل الدین عالی بھی شریک تھے جو۔ این۔ لائی نے اس وفد کو کچھ تحائف دینے کی پیشکش کی تو جمیل الدین عالی صاحب نے کہا "اگر آپ کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو سائنس لیباٹری کا سامان عنایت فرما دیجئے۔ چنانچہ عوامی جمہوریہ چین کی طرف سے اردو سائنس کالج کو لیباٹری کا سامان مل گیا۔

اردو کالج کراچی کے گنجان علاقے میں ہے اسلئے اس میں توسیع کی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا ۱۹۶۱ء میں حاصل کی گئی زمین (یونیورسٹی روڈ) پر تین لاکھ کے سرمائے سے سائنس بلاک تعمیر کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ کرنل عطاء الرحیم خرابی صحت کی

وجہ سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ جمیل الدین عالی کو کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔

یکم جون ۱۹۶۸ء میں پروفیسر اکرام الرحمٰن کو سینئر وائس پرنسپل مقرر کیا گیا۔ جنوری ۱۹۶۹ء میں انہیں قائم مقام پرنسپل بنا دیا گیا۔ اگست ۱۹۶۹ء سائنس بلاک تیار ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں کالج پوری طرح مکمل ہوا تو اکتوبر ۱۹۶۹ء میں سائنس بلاک اس میں شفٹ ہو گیا۔ پروفیسر اکرام الرحمٰن کو بھی نئی عمارت میں تعینات کر دیا گیا۔"(۴۱)

"۱۹۷۳ء میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کو قومیانے کی حکومتی پالیسی نے سندھ پرائیویٹ کالجز آرڈیننس ۱۹۷۳ء کے اجراء اردو کالج کے لئے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے کیونکہ تمام اخراجات کو منتظر پر ڈال دیا گیا تھا۔

۸، دسمبر ۱۹۷۳ء کو مجلس عاملہ انجمن ترقی اردو نے ان مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک اجلاس بلایا۔ جس میں معتمد اعزازی جمیل الدین عالی نے کہا" جہاں تک اردو کالج چلانے والے ادارے یعنی انجمن کا تعلق ہے۔ وہ ملک میں بڑھتی ہوئی گرانی کے پیشِ نظر اساتذہ کے ساتھ تنخواہوں کے معاملے میں کسی طرح کی ناانصافی روا نہیں رکھ سکتی۔ لیکن سب کو معلوم ہے کہ اس نیک کام میں مالی مشکلات رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ کالج کی آمدنی کے صرف دو ذرائع ہیں طلبہ کی فیس اور گرانٹ طلبہ کی فیس بڑھانے میں سو دشواریاں ہیں اور گرانٹ کا بڑھنا بھی آسان نہیں۔ تیسرا راستہ یہ ہے کہ ملک کے مخیّر حضرات سے بطور چندہ کچھ رقم حاصل کی جائے لیکن ایسے حضرات کم ہیں۔ کیونکہ وہ خود اپنے ٹرسٹ کے تحت تعلیمی ادارے چلاتے ہیں۔ یا ان پر عطیات کا بوجھ بہت زیادہ ہے اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر آخری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ حکومت سے گرانٹ میں معقول اضافہ کرایا جائے۔ لیکن اس دور میں اردو کالج سے حکومت کا رویہ ہمدردانہ نہ تھا۔(۴۲)

"اس کے باوجود عالی صاحب نے کہا۔" حکومت سے رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں "لہٰذا ایک درخواست دی گئی۔ کہ اردو کالج ذاتی یا جماعتی مفاد کے لئے قائم نہیں کیا گیا۔ کالج کی انتظامیہ بھی رضا کارانہ طور پر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے"۔(۴۳)

"منتظمہ کے اراکین مالدار طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ لہٰذا اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کس طرح کیا جائے۔ تعلیم کے اخراجات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں تدریس کے دوران استعمال ہونے والا سامان اور آلات بھی مہنگے ہو گئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ حکومت ہمیں فوری طور پر روپیہ فراہم کرے ہم کالج کو اپنی بہترین کوششوں سے چلا رہے ہیں لیکن اگر روپیہ نہ ملا۔ فیس میں اضافہ کی صورت پیدا نہ ہوئی تو کالج حکومت کی تحویل میں دینے پر غور ہوگا۔ اگر ہماری ان تجاویز پر حکومت غور نہیں کرتی۔ تو ہمارے لئے کالج کا انتظام چلانا بہت مشکل ہو جائے گا۔

ان دنوں ۶، ۵ جنوری سے اردو کالج کی تالہ بندی کی خبر گرم تھی لیکن انجمن ترقی اُردو کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ مالی دباؤ سے کالج حکومت کے سپرد کیا جا سکتا ہے مگر تالہ بندی کبھی نہیں کریں گے"۔(۴۴)

"چنانچہ معتمد اعزازی جمیل الدین عالی صاحب نے اخبارات کے ذریعہ اس افواہ کی تردید کی اجلاس کے فیصلہ کے مطابق انجمن کی طرف حکومت کے نام ایک مراسلہ ارسال کیا گیا۔ جس میں آرڈیننس کے بارے میں منتظمہ کی بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا۔

انجمن نے نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر اپنے احتجاج اور بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے اردو کالج کے نئے عہدے داروں میں سے نمائندے منتخب کر کے ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کراچی کو بھیج دیا ہے۔ جن نمائندوں کو منتخب کیا گیا۔ ان میں صدر جناب اختر حسین، جناب جسٹس انعام اللہ، جناب نذیر احمد اور جناب پیر حسام الدین راشدی بطور مربی جناب عبدالخالق رزاق شامل تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس امر پر زور دیا کہ اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ نیز سائنسی آلات کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے پیشِ نظر کالج کی آمدنی بڑھانے کی غرض سے اگر حکومت نے سرکاری گرانٹ میں خاطر خواہ اضافہ نہ کیا تو ہمیں فیس میں اضافے کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت میں کالج کو حکومت کے حوالے کر کے ہمیں اس کے انتظام سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ دوسری صورتِ حال پر عمل ہوا اور اردو کالج کو یکم ستمبر ۱۹۷۳ء کو وفاقی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ (۴۵)

"اس کے بعد محکمہ تعلیم نے حکومتِ سندھ کے فیصلہ کے مطابق نومبر ۱۹۷۴ء میں اردو کالج کو تقسیم کر کے فنون، تجارت اور قانون پر مشتمل گورنمنٹ اردو کالج بنا دیا گیا۔ اور اردو کالج (شعبہ سائنس) کو "گورنمنٹ اردو سائنس کالج" کے نام سے باضابطہ علیحدہ کالج بنا دیا گیا۔ اس کے پہلے پرنسپل پروفیسر محمد اکرام الرحمٰن مقرر کیے گئے۔" (۴۶)

حوالے وحواشی

(۱) قومی زبان اگست ۱۹۹۶ (ڈاکٹر خلیق انجم) ص ۱۱

(۲) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی ص ۱۸، ۱۹

(۳) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی ص ۱۸، ۱۹

(۴) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی ص ۱۸، ۱۹

(۵) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو سید ہاشمی فرید آبادی ص ۱۹

(۶) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو سید ہاشمی فرید آبادی ص ۲۰

(۷) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۲۰

(۸) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۲۰

(۹) پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۲۱

(۱۰) قومی زبان اگست ۱۹۹۶ء (مولوی عبدالحق) ہاشمی فرید آبادی ص ۵

(۱۱) قومی زبان اگست ۱۹۹۶ء (مولوی عبدالحق) ہاشمی فرید آبادی ص

(۱۲) قومی زبان اگست ۱۹۹۶ء ص

(۱۳) قومی زبان بابائے اردو نمبر ۱۹۹۶ء ص ۶

(۱۴) مرحوم دہلی کالج مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو ص ۱۰، ۲۳

(۱۵) مرحوم دھلی کالج مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو ص ۲۴، ۳۱

(۱۶) انٹرویو جمیل الدین عالی ۱۹۔۱۱۔۹۸ کیسٹ نمبر ایک ازراقمہ

(۱۷) قومی زبان بابائے اردو نمبر ۱۹۹۶ء ص

(۱۸) انٹرویو جمیل الدین عالی ازراقمہ ۱۹۔۱۱۔۹۸ صفحہ نمبر ۴۵ کیسٹ نمبر ایک

(۱۹) چہار سو راولپنڈی ص ۴۳

(۲۰) انٹرویو جمیل الدین عالی کیسٹ نمبر ایک ص ۱۵ اسلام آباد ازراقمہ

(۲۱) چہار سو راولپنڈی ص ۴۳

(۲۲) حرفے چند جلد سوم جمیل الدین عالی مشفق خواجہ ص ۲۳

(۲۳) حرفے چند جلد سوم جمیل الدین عالی مشفق خواجہ ص ۲۳

(۲۴) حرفے چند جلد سوم جمیل الدین عالی مشفق خواجہ ص ۲۳

رائٹرز گلڈ

اللہ تعالیٰ نے جمیل الدین عالی کی جس مٹی سے تعمیر کی ہے اس میں نہ جانے کیا کیا جواہرات پوشیدہ ہیں۔ اضطرابی طبیعت نے انہیں کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ تعلیم کا میدان ہو یا ملازمت کا شعبہ سب اپنی جگہ بڑی حد تک مکمل رہے، اور ان میں فلاح و نفع رسانی کا عنصر نمایاں ہے جب کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تن، من، دھن سے لگ جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شاعرانہ نازک مزاجی (غزلیں، دوہے، گیت، ملی نغمات) بھی ان کے کاموں میں آڑے نہ آئے۔ یہی نہیں بلکہ نثر نگاری، کالم نگاری، سفر نامے، خطوط نویسی و مضمون نگاری بیشتر اعلیٰ درجے کی تحریریں ہیں۔

پاکستان بنتے ہی ادھر آئے تو ایک بڑی انجمن عمال حکومت پاکستان کی تشکیل میں سرگرم رہے۔ اس میں ۱۹۴۸ء سے کام شروع کیا اس کے بعد (مقابلے کے امتحان ۱۹۵۵ء میں کامیابی کے بعد) انکم ٹیکس میں ملازمت شروع کی تو ایک " آفیسرز ایسوسی ایشن " بنا ڈالی۔ جس کے تحت گارڈن میں بننے والے گورنمنٹ کوارٹرز سے افسران کا کوٹہ مخصوص کرالیا۔ افسران کو مزید یونین بنانے کا حق نہیں ہوتا مگر انہوں نے ایسوسی ایشن کے نام اجتماعی نمائندگی منوالی۔ PECHS کی اسکیم کے لئے راتوں کو سائیکل پر جا کر بھی کام کی نگرانی کرتے 1948 میں ہی اس کے صدر سے اس سوسائٹی کے چھوٹے ملازمین کے لئے چھوٹے پلاٹ نکلوائے۔ جبکہ بڑے افسروں کے لیے تو یوں بھی ہزاروں مراعات میسر تھیں۔ انہیں تو بڑے پلاٹ ملتے ہی تھے کہاں، یہ سب جھمیلے اور پھر ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے رائٹرز گلڈ کا قیام اور وہ بھی مارشل لاء کے زمانے میں مگر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ عالی نے ادبی تخلیقات اور تحقیق و تنقید پر ادبی انعامات دلوانے کے لئے بھی جد و جہد کی جن میں آدم جی ادبی انعام (۱۹۶۰ء) داؤد ادبی انعام (۱۹۶۲ء) نیشنل بینک ادبی انعام (۱۹۶۳ء) حبیب بینک ادبی انعام (۱۹۶۴ء) یونائیٹڈ بینک ادبی انعام (۱۹۶۵ء) گلڈ کا ادبی انعام ۱۹۶۶ء ہیں۔ وہ ان سب کے بانی، معتمد اعزازی رہے۔ ضوابط میں اپنے اوپر انعام کو تاعمر ممنوع کرلیا تھا کہ ابتدا میں ہی ان کا بھرم قائم ہو جائے۔ ایسا ہماری ادبی تاریخ میں نہ پہلے ہوا نہ بعد میں۔ یہ انعامات ۷۶، تک ادیبوں کو دیئے جاتے رہے۔

رائٹرز گلڈ کا قیام:-

پاکستان بننے کے چند سال بعد ہی کچھ ایسے سیاسی حالات ہوئے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو سیاسی جماعت قرار دیا گیا تھا یعنی عملاً اس پر پابندی لگ گئی بہت سے سرکاری ملازمین، اراکین اس سے علیحدہ ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے پابندی کے بعد بھی وابستگی جاری رکھی تھی ۱۹۵۳ء میں اُس وقت کے جنرل سیکرٹری احمد ندیم قاسمی صاحب نے لاہور میں ادیبوں کا ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو توڑ دینے کا اعلان کر دیا۔ اُسی زمانے سے کچھ ادیب و شاعر سلیم احمد وغیرہ کے گھر بیٹھ کر باتیں کرتے تھے کہ کوئی ادبی انجمن بنانی چاہیے تاکہ اس خلاء کو پورا کیا جا سکے لیکن سلیم احمد اس مزاج کے آدمی نہ تھے چنانچہ ان کے گھر کی محفلوں میں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی لیکن جہانگیر روڈ کے چائے خانے میں عالؔی اور دوسرے ادیب انہی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

مزاجاً بھی عالؔی ہمیشہ فلاح و بہبود کے کاموں سے دل چسپی لیتے رہے ہیں عالؔی ۱۹۴۸ء میں ہی "انجمن عمال پاکستان" کے بانی اور نائب معتمدین میں سے ایک تھے۔ جب محکمہ انکم ٹیکس میں آئے تو افسروں کو ٹریڈ یونین بنانا ممنوع تھا مگر انہوں نے "ایسوسی ایشن" کے نام پر وہاں ٹریڈ یونین بنائی تاکہ ملازم افسران کی فلاح و بہبود کے کام جاری رہیں اسی طرح پی ای سی ایچ ایس کی تشکیل میں بھی اُن کا اہم حصہ رہا تھا۔ وہاں بھی مقصد سرکاری ملازمین کی فلاح و بہبود تھا۔ اس لئے جب ادیبوں کی فلاح و بہبود کے مسئلے نے زور پکڑا تو عالؔی کیلئے یہ (ایک زیادہ حساس معاملہ بن گیا۔ وہ اگرچہ اس وقت جونیئر تھے مگر شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت کے حامل ہو چکے تھے۔ یوں بھی ادیبوں اور شاعروں کی فلاح و بہبود اُنھیں دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ عزیز تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے سیاسی حالات دِگرگوں تھے حکومتیں مہینوں میں بدل رہی تھیں، سیاسی استحکام نام کو نہ تھا اور اسی عدم استحکام کے سبب ملک میں مارشل لاء لگ گیا۔ یہ بیک وقت ایک غلط اور نا گزیر اقدام سمجھا گیا۔ ملک میں مختلف حلقوں کی طرف سے اس مارشل لاء کا خیر مقدم بھی کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اس کا خیر مقدم کیا۔ (بعد کے حالات اور ایک مجموعی تبصرہ و تنقید علیحدہ مسئلہ ہے) یہ بات اس وقت کی ہو رہی ہے مارشل لاء کے بعد بعض فوائد بھی نظر آنے لگے تھے مثلاً اسمگلنگ رُک گئی تھی چور بازاری بھی چند مہینوں کے لئے تو بہتر ہو ہی گئی تھی۔ مہنگائی ختم ہو گئی کروڑوں روپے کا سونا جو اسمگلروں نے سمندر میں بہا دیا تھا حکومت کے ہاتھ لگا۔ پہلا مارشل لاء تھا ایک دہشت بھی طاری ہو رہی تھی۔ اُس صورت حال میں ادیبوں اور خصوصاً ان ادیبوں کو جو لبرل تھے، یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مصیبت میں نہ پھنس جائیں مارشل لاء آزادانہ اظہار خیال اور لبرل نقطہ نظر کو برداشت نہیں کر سکتا اس لئے ایسے ادیبوں پر نزلہ گرنا متوقع تھا۔ ایم۔ ایچ عسکری (ابن سعید) کے گھر ایک دن دوپہر برج پارٹی تھی اتوار کا دن، جاڑے کا موسم تھا۔ وہاں موجود ایم۔ ایچ۔ عسکری، عباس احمد عباسی، ابن الحسن اور قرۃ العین حیدر نے یہ طے کیا کہ ادیبوں کی ایک ایسی طاقت ور انجمن بنائی جائے جس پر مارشل لاء کا کوئی وار ممکن نہ ہو اور ادیبوں کی فلاح و بہبود کیلئے بھی کچھ کیا جا سکے۔ یہ بھی طے ہوا

کہ حکومت کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے ادیبوں کو خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دستِ تعاون دراز کرنا چاہئے۔
شاید مارشل لاءحکومت کا خیال بھی یہ تھا کہ وہ انقلاب لارہی ہے اور نیا دور آرہا ہے اگر ادیب بھی اس نئے دور کی حمایت کریں تو حمایت بھی حاصل کرسکیں گے۔ اِدھر شوکت صدیقی، جمیل الدّین عالیؔ سے ملے۔ وہ اس لئے پریشان تھے کہ " خدا کی بستی" میں اشتراکی خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ ممتاز حسین بھی بائیں بازو کے آدمی تھے وہ بھی پریشان تھے فیض صاحب تاشقند کی پہلی کانفرنس میں شرکت کر کے آئے تو گرفتار ہو گئے اور بھی کچھ لوگ جیل میں تھے اس لئے بائیں بازو کے ادیبوں کی آخری اُمید بھی عالیؔ اور شہاب صاحب تھے اور اس لئے سب لوگ ان کے گرد اکھٹا ہونے لگے۔

بالآخر ایک دن وہ ڈرامائی مرحلہ بھی آ گیا۔ جب گلڈ کی تنظیم ممکن ہوسکی۔ کراچی میں مقیم چند قابل ذکر ادیبوں نے طے کیا کہ مارشل لاء کے تحت اعلانیہ طور سے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات کی جا رہی ہیں (اس وقت ان کا بڑا غلغلہ تھا) اس لئے کیوں نہ ایک ایسی تنظیم بنائی جائے کہ اگر ادیبوں کی اصلاح کے نام پر ادب پر سنسر شپ لگائی جائے تو یہ تنظیم ان کے دفاع کر سکے اور ادیبوں کے دوسرے بہت سے جائز مطالبات کیلئے بھی آواز بلند کر سکے۔ چنانچہ ایک وفد ترتیب دیا گیا۔ جن میں قرۃ العین حیدر، جمیل الدّین عالیؔ، غلام عباس، ابن الحسن، ابن سعید۔ (ایم۔اے۔عسکری) اور عباس احمد عباسی شامل تھے۔ یہ سب لوگ قدرت اللہ شہاب صاحب کے پاس پہنچے۔ جمیل الدّین عالیؔ نے شہاب صاحب کو بتایا کہ ہم لوگ آپ سے مشورہ کرنے آئے ہیں نئی زندگی کیلئے حکومت کے بلند بانگ دعوے جاری ہیں۔ کیا ان میں ادیبوں کی بہبود کیلئے بھی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی عالیؔ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اگر اس قسم کا کوئی قدم اُٹھایا جائے تو بابائے اُردو مولوی عبدالحق بھی اس کا ساتھ دیں گے کیونکہ یہ بات ان کے گوش گزار کر دی گئی ہے۔

شہاب صاحب نے سوچا یہ نامور لوگ، جو ادب میں اپنا اپنا اعلیٰ مقام رکھتے ہیں مجھ سے کیا مشورہ کرنے آئے ہیں کیا یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مارشل لاء کی حکومت کا اس تجویز پر کیا ردِعمل ہوگا؟ بہر حال شہاب صاحب کا ذاتی خیال تھا کہ یہ تجویز قابل غور ہوسکتی ہے لیکن شہاب صاحب نے کہا وہ نئے حکمرانوں کے مزاج سے زیادہ واقف نہیں ہیں نہ جانے کس وقت مارشل لاء کا کوئی قانون ادب اور ادیب کی آزادی کو سنسر شپ کی زنجیروں میں جکڑ دے مشرق کے کئی ایسے فوجی اقدامات اور واقعات مشہور تھے اور شہاب صاحب اسی خطرے کے پیش نظر ادیبوں کی فلاحی سرگرمیوں کی حمایت کر رہے تھے کہ اگر کوئی ایسا وقت بھی آ جائے اور ادیبوں پر پابندیاں عائد بھی کر دی جائیں تو ادیبوں کو اس پر منظم ہو جانا چاہئے پھر کسی پلیٹ فارم سے اُن کے بچاؤ کیلئے آواز اُٹھائی جا سکے۔ کچھ بحث ومباحثہ کے بعد طے یہ پایا کہ پاکستان کی سب زبانوں کے ادیبوں کا کنونشن بلایا جائے اور اُس میں ادیبوں کی فلاح وبہبود کیلئے کیے جانے والے اقدامات کا لائحہ عمل متعین کیا جائے۔ عالیؔ نے اس واقعے کے چالیس سال بعد بھی یہ بات دہرائی ہے کہ ہم نے ایوب خان سے تعاون کے بارے میں ایک صفحے پر مشتمل ایک اعلان شائع کیا تھا جو چار دسمبر کا اعلان کہلاتا ہے اور اس اعلان پر مذکورہ سبھی لوگوں کے دستخط تھے۔ یہ اعلان نامہ اگلے

دنوں میں تمام اخبارات اور پھر کئی جرائد میں چھپا تھا گلڈ کے ریکارڈ پر اور " ہم قلم " سالگرہ نمبر ۱۹۶۱ میں بھی۔
عینی سے عالی کی ملاقات دراصل گلڈ ہی کے سلسلے میں ہوئی ورنہ دونوں کے درمیان زیادہ راہ ورسم نہ تھی۔
عالی نے اپنی شادی کے زمانے میں عینی کو بلند شہر میں دیکھا تھا یہاں ہم اپنے کزن انجنیئر حیدر صاحب (علی گڑھ) کے ہاں ٹھہرے تھے کراچی میں وہ عالی کے پڑوس میں ہی گارڈن روڈ پر رہتی تھیں۔ آتے جاتے نظر پڑتی تھی۔ بس یہاں تک شناسائی تھی کہیں کہیں مل لیتیں اب گلڈ کی وجہ سے بڑھتے بڑھتے یہ شناسائی گہری ہوتی گئی اور عالی نے عینی کو بہن بنالیا۔ عینی بڑی تنک مزاج خاتون تھیں۔ ضمیر الدین احمد کو جو ان دنوں "ڈان" سے وابستہ تھے خود عسکری صاحب نے نامزد کیا اور احباب کی اجازت سے فون پر اطلاع دی کہ اس نوعیت کا اعلان نامہ تیار کیا گیا ہے۔ کیا آپ اس کی حمایت کریں گے؟ وہ گویا اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے میں تیار ہوں بلکہ سمجھو کہ میں نے دستخط کر دیئے اور وہ اس رویئے پر قائم رہے۔ مگر اعلان نامہ اس طرح ریکارڈر میں چھپ گیا کہ وہ اس پر دستخط نہیں کر سکے دوسرے روز غلام عباس نے بھی اس اعلان پر دستخط کر دیئے۔ انہوں نے یہ ضرور پوچھا کہ آپ لوگ مجھے کیوں شریک کر رہے ہیں۔ عالی نے کہا کراچی میں آپ سب سے سینئر افسانہ نگار ہیں۔ عینی اور عالی ۴، دسمبر کے اعلان کا مسودہ لے کر شہاب صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے بغیر کسی تردد کے دستخط کر دیئے۔ ابن الحسن اس وقت فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے میں کام کر رہے تھے کموڈور مقبول صاحب فوج میں کمانڈر تھے اور انہوں نے ابن الحسن کو سرکاری اجازت کے بغیر دستخط کرنے پر ڈانٹا تھا یہ صرف وقت آٹھ لوگ تھے جو گلڈ کے اولین بانیوں میں شامل تھے۔ اس سے یہ شبہ یقین میں بدل جاتا ہے کہ گلڈ کے قیام میں درپردہ حکومت کا ہاتھ تھا۔ بیشتر لوگ مثلاً مرزا حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، مس مسرت تیموری، اور شان الحق حقی وغیرہ بھی سرکاری ملازمت میں تھے یہ بات بھی لوگوں کے شبہات کو تقویت دیتی تھی۔ شوکت صدیقی صاحب ٹائمز آف کراچی میں سلہری صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے۔
عالی نے ان سے بھی گلڈ کے قیام کی بات کی تھی اور وہ بھی تیار ہو گئے دراصل شوکت صدیقی اور ممتاز حسین وغیرہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے آئے اور شوکت صدیقی کے بقول یہ کمیونسٹ لیڈر حسین تاج تھے جنہوں نے مخصوص حالات کے تحت پارٹی کے ادیبوں کو اپنے بقاء کے لئے تعاون کی اجازت دی تھی انہیں مبینہ طور پر گورنر نواب کالاباغ کے مظالم سے ہلاک کیا گیا کہ انھوں نے جیل میں رسی حاصل کر کے خودکشی کر لی تھی۔ اور ان کی موت آج تک معمہ بنی ہوئی ہے۔
بہر حال ان لوگوں کی وجہ سے قدامت پسند اور کئی سرکاری حلقوں میں گلڈ پر یہ الزام لگا کہ اس نے کمیونسٹوں کو پناہ دے رکھی ہے یہ بڑی دلچسپ اور عجیب بات ہے کہ گلڈ پر بیک وقت دو الزام عائد ہوئے۔ ایک یہ کہ سرکار دربار کا ادارہ ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کمیونسٹوں کی پناہ گاہ ہے۔ بات یہ تھی کہ عالی شہاب کی پالیسی کے مطابق ہر قسم کے اور ہر عقیدے کے لوگ شامل کر لئے گئے تھے۔ سرکاری افسران بھی اور کمیونسٹ پارٹی کے لوگ بھی مگر یہ دونوں متضاد الزام دراصل گلڈ کے حق میں جاتے تھے اور اس سے ثابت ہوتا تھا کہ گلڈ میں ہر فکر اور ادبی مسلک کے لوگ شامل تھے اور اس کے دروازے کسی کیلئے بند نہ

تھے ۔ گلڈ کے مرکزی اور صوبائی انتخابات میں بھی کبھی مکاتب فکر کے ادیب منتخب ہو کر آتے رہے ۔ جب گلڈ قائم ہوا تو اس کا اپنا کوئی دفتر نہ تھا اعلان نامہ اور کنونشن کے انعقاد سے قیام تک جمیل الدین عالی کے گھر D-52 گارڈن کا پتہ خط و کتابت کیلئے دیا جاتا تھا اور یہیں سب نشستیں بھی ہوتی تھیں ۔ (عالی اس وقت انکم ٹیکس افسر تھے) گلڈ کے قیام کا اعلان ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ادبی حلقوں میں ایک شور مچ گیا کہ یہ آٹھ افراد کنونشن بلانے کیلئے کیوں خدائی فوجدار بن گئے ۔ کسی کو شبہ تھا کہ کنونشن بلانے کا اعلان مارشل لاء حکومت کے اشارے پہ کیا گیا ہے ۔ تا کہ سب ادیبوں کو ایک جگہ جمع کر کے مارشل لاء حکومت کے حوالے کر دیا جائے ۔ اور پھر یہ اُس کی صوابدید پر ہے کہ وہ اُسے کس طرح استعمال کرے اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی تھی کہ اس اعلان پر قدرت اللہ شہاب کے دستخط تھے اور وہ اس وقت صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان کے سیکریٹری تھے ۔ (گو کہ وہ پچھلے پانچ سال سے ہی ایوانِ صدر میں ہر صدر کے سیکریٹری چلے آرہے تھے) شہاب صاحب بھی معاملات کی اس نزاکت کو سمجھ رہے تھے ۔ اس لئے ابتداء میں انہوں نے سوچا کہ وہ اپنے آپ کو گلڈ سے الگ رکھیں ۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ ایوانِ صدر اُس وقت تمام ملکی و قومی امور کا مرکز نگاہ تھا ۔ اور چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے فیصلے وہیں ہو رہے تھے ۔ ادیبوں سے متعلق امور بھی وہیں زیرِ بحث آئے اور ادیب کی حیثیت سے نہ کہ سرکاری حیثیت میں شہاب صاحب کو اس میں ملوث ہونا تھا ۔ جب اُنھیں ملوث ہی ہونا تھا تو انہوں نے طے کیا کہ وہ مستعدی اور ہمدردی کے ساتھ ادب اور ادیبوں کے معاملات کیلئے کمر بستہ ہو جائیں لیکن بعض لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہو گئے تھے وہ ہمیشہ برقرار رہے ۔

عین اس وقت کنونشن سے پہلے شمیم احمد صاحب نے ریڈیو پاکستان کے دفتر میں بعض مقامی ادیبوں کا ایک جلسہ بلایا ۔ جس میں اسی قسم کے سوالات اُٹھائے گئے تھے آخر یہی پوچھا جاتا رہا (اتفاق سے گلڈ کے سب سے زیادہ مخالفین کراچی میں پیدا ہوئے) ۔

بعض اخبارات ۔ نے بھی اس محاذ آرائی میں حصہ لیا لاہور کا " نوائے وقت " ان میں پیش پیش تھا ۔ اعتراضات کا مرکز یہی تھا کہ مذکورہ آٹھ آدمی ہی کیوں ؟ اور آٹھ آدمیوں کا جواب یہ ہوتا کہ کیا ہم گھر گھر جاتے اب جبکہ بات آگے بڑھی ہے تو آیئے سب مل کر کام کریں ۔ یہی جذبہ تھا جس کے تحت عالی شاہد احمد دہلوی کو کھینچ کر گلڈ میں لے آئے وہ عالی کو دہلی سے جانتے تھے ان کی قدر افزائی کرتے تھے عالی نے جا کر ان سے کہا " آپ کنونشن میں آیئے " کہنے لگے میں کس حیثیت میں آؤں " اس وقت گلڈ کی کوئی ہیئت متعین نہیں ہوئی تھی ۔ کوئی عہدہ دار نہ تھا ۔ شہاب صاحب بھی ایک کارکن کی حیثیت سے کام کرتے تھے ۔ حیثیت سب کی برابر تھی ۔ عالی نے باقی افراد سے کہا شاہد احمد دہلوی سب سے بڑے ہیں ۔ ان سے کہا آپ استقبالیہ کمیٹی کے صدر بن جایئے ۔ وہ اس پیش کش پر راضی ہو گئے ۔ اس زمانے میں " ساقی " نکالا کرتے تھے اس میں کوئی چیز چھپ چکی تھی جس پر ارباب حل و عقد کو اعتراض ہوا منسٹر والوں نے ان پر سختی کرنا چاہی وہ پہلے بھی منٹو کیس کی وجہ سے لاہور

ہائی کورٹ تک گھسیٹے جا چکے تھے کیونکہ وہ "ساقی" میں منٹو کو چھاپتے تھے تو مدیران جرائد کے نقطہ نظر سے سوچ رہے تھے ادب و ادیب کی سرپرستی بھی عزیز تھی اور اپنا ذاتی تحفظ بھی چاہتے تھے اسلئے گلڈ میں شمولیت کیلئے فوراً ہی تیار ہو گئے۔ گلڈ کا اپنا کوئی دفتر نہ تھا۔ عالی کا گھر دفتر تھا۔ کوئی عہدےدار نہ تھا اب عالی کنوینر سیکریٹری تھے اور شاہد احمد دہلوی صدر مجلس استقبالیہ اِتفاق یہ تھا کہ گلڈ کے اولین کارکنوں میں سبھی سرکاری ملازمین تھے یہاں تک کہ شہاب صاحب صدر و چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سکریٹری تھے اس لئے مارشل لاء کے ہاتھ بک جانے کا تاثر گہرا ہوتا رہتا تھا لیکن سرکاری ملازم ادیبوں کی وجہ سے ایک مسئلہ اور پیدا ہو رہا تھا۔ ان کی سرکاری مصروفیت ادبی سرگرمیوں میں آڑے آ رہی تھی۔ مثلاً شہاب صاحب اعلان دسمبر پر دستخط کرتے ہی پنڈی چلے گئے عسکری صاحب نیوی میں تھے اور ہر وقت وردی پوش رہتے تھے۔ یوں بھی وہ رجسٹر کھولنے اور دفتری ریکارڈر رکھنے کو کلرکی سمجھتے تھے۔ یعنی فون کر کے پیش رفت معلوم کر لیتیں کہ ان کی اپنی سرکاری مصروفیات تھیں۔ ایسے میں عباس احمد عباسی کام آئے وہ دہلی میں عالی کے ہم جماعت رہے تھے اُس وقت بے روزگار تھے اور عالی کے گھر میں ہی رہ رہے تھے۔ عالی اُنھیں اپنے دفتر ہی لے آتے تھے دفتر میں عالی کو ایک چھوٹا سا کمرہ ملا ہوا تھا۔ ایک سٹینو Steno میسر تھا اُسی کمرے میں ایک طرف عباسی صاحب کو بٹھا دیا گیا اور گلڈ کا قیام شروع ہو گیا۔ خط وکتابت کا کام عالی کا سٹینو خوب کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے کام بڑھتا گیا لیکن شکوک وشبہات بھی بڑھتے گئے یہ بات کسی طرح لوگوں کے ذہن سے نہیں نکل رہی تھی کہ مارشل لاء حکومت ادیبوں کو استعمال کرنا چاہتی ہے۔ دھیرے دھیرے ممبران کی تعداد بڑھنے لگی جمیل جالبی بھی ساتھ آ گئے مشرقی پاکستان سے بھی لوگ آنے لگے اور کنونیشن کے بارے میں استفسارات ہونے لگے، عالی کا کہنا ہے کہ میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کے ہماری نیت تمام زبانوں کے ادیبوں کو مدعو کرنے کی تھی۔ ہم قومی انداز میں سوچتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور بنگالی ادیبوں کا اُردو ادیبوں سے تعارف ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے واقف ہوں ان کے رویّوں کو سمجھیں اور ان کے نقطہ نظر سے آگاہی حاصل کریں۔ یوں قومیت کا مانوس تصور اُبھر کر سامنے آئے۔ گلڈ کے قیام سے قبل اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے چند ہی ادیبوں کو یہ لوگ جانتے تھے۔ مثلاً اُردو والے پنجابی ادیب، صوفی غلام مصطفےٰ، احمد راہی، استاد دامن سے واقف تھے کیونکہ وہ اُردو میں بھی لکھتے تھے بنگالی کے کوی جسیم الدّین بہت مشہور آدمی تھے اُردو والے ان سے واقف تھے۔ کیونکہ اُن کا نام بہت بڑا تھا اور انکے کچھ ترجے بھی ہو چکے گلڈ کے ابتدائی کارکنوں نے ۲۰،۲۰ روپے زرِ امانت جمع کیا تھا۔ یعنی گلڈ کی کل جمع پونجی =/140 روپے تھی۔ جب شاہد احمد دہلوی کو صدارت کی پیش کش کی گئی تو اُنھوں نے بھی =/۲۰ روپے دیئے۔ اس طرح کل =/۱۸۰ روپے ہو گئے تھے بعد میں کچھ پیسہ مشرقی پاکستان کے ادیبوں نے جمع کیا ۲ یا ۳ سو روپے خود عالی نے دیئے کچھ اور لوگوں سے بھی امداد کی رقوم حاصل کی گئیں۔ مثلاً عالی کے دوست اقبال نعیم پاشا وکیل ہیں ان سے گلڈ کیلئے ایک ہزار روپیہ کی رقم حاصل کی گئی ایکسلسیر Excelsier ہوٹل کے مالک اُن دنوں جمال ہوا کرتے تھے یہ صاحب عالی کے دوست اطہر کے دوست تھے۔ شملہ میں

انکے دوست محمد اطہر کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ اطہر عالی کے ایسے دوست تھے کہ عالی نے اپنی پہلی کتاب اُن کے نام معنون کی ہے بہر حال ان جمال سے ایکسلسیر میں ایک کمرہ کرائے پر حاصل کیا گیا۔ اس میں فون اور آپریٹر کی سہولت بھی میسر تھی۔ یوں گلڈ کو ایک دفتر میسر آ گیا جس میں عباس احمد عباسی کو بٹھا دیا گیا تھا جو پہلے ہی سے آفس سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے اور مشرقی پاکستان کے ادیبوں سے رابطے میں مصروف تھے۔

اب عالی نے پروفیسر محمد حسن عسکری کو کنونیشن میں لانا چاہا۔ عسکری صاحب نے کہا کہ تم ادیب لڑتے بھڑتے بہت ہو مجھے یہ ماحول پسند نہیں کنونشن میں تو نہ آؤں گا البتہ کنونیشن کے خلاف کچھ نہ لکھوں گا۔ وہ ساقی میں جھلکیاں لکھا کرتے تھے اور اس میں ہر موضوع پر لکھا کرتے تھے مگر عسکری صاحب نے اپنے وعدے کا پاس کیا اور کنونیشن یا گلڈ کے خلاف کچھ نہ لکھا۔ سلیم احمد نے شروع میں گلڈ کے قیام کے تصور سے اختلاف کیا تھا۔ مگر اُنہیں احساس تھا کہ ادیبوں کیلئے کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہئے۔ اسلئے گلڈ کے معاملات پر وہ خاموش تھے۔ البتہ ان کے چھوٹے بھائی شمیم احمد نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق گلڈ کے خلاف محاذ کھولا تھا۔ اسے ادیبوں کی ٹریڈ یونین قرار دیا تھا اور اسکی کارکردگی پر بھی اعتراضات کیے تھے بعض اور حلقوں کی طرف سے بھی اعتراضات شروع ہو گئے (بعد میں شمیم احمد گلڈ کے ماہنامے "ہم قلم" میں ملازم ہو گئے) دوسری طرف گلڈ کے ممبران میں اضافہ ہونے لگا لوگ آہستہ آہستہ شامل ہوتے جاتے تھے اور کارواں بنتا جاتا تھا۔ کنونشن کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئی تھیں۔ طے یہ ہوا کہ کنونشن کیلئے ہر صوبے میں چند آدمیوں کو ذمہ دار مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ پنجاب کیلئے شہاب صاحب کا نام تجویز کیا گیا کہ وہ سرکاری طور پر پنجاب آتے جاتے رہتے تھے۔ اسلئے ان پر مصارف بھی نہ آئے مگر بیرسٹر اعجاز بٹالوی اور اشفاق احمد کو ان کی معاونت پر ساتھ لگا دیا گیا۔

مشرقی پاکستان شہاب صاحب اور عینی خود گئے کہ مندوبین کے انتخابات کرالو اور کنونیشن کیلئے نمائندگان بھیجو۔ بنگال کے بائیں بازو کے ادیب ان دنوں بہت زیادہ پریشان تھے (وہ پہلے ہی بڑے عذابوں میں گرفتار رہ چکے تھے) منیر چودھری ڈرامہ نویس، ناقد پروفیسر بھی تھے اور اچھے مقرر بھی انہوں نے کنونشن کیلئے بڑی فضاء ہموار کی۔ ذی۔ ایف۔ پی کے ماہر مصور جلال الدین صاحب نے یقین دلایا تھا کہ بنگال کے لوگ خود اچھی خاصی رقم جمع کر لیں گے اور کنونیشن کیلئے کرایہ وغیرہ خود فراہم کر سکیں گے۔ مگر چند دن بعد بنگال سے خط آنا شروع ہو گئے کہ پیسے بھیجئے دوسری طرف ہر (مشرقی اور مغربی) پاکستان کے ادیب کی خواہش تھی کہ کنونشن میں بلایا جائے۔ بنگلہ اکیڈمی کے صدر بابائے بنگلہ ڈاکٹر محمد شہید اللہ صاحب تھے جنہیں مشرقی پاکستان کا مولوی عبدالحق سمجھئے احسن اشک اور کوی جسیم الدین بھی اکیڈمی میں کام کرتے تھے۔ بہر حال ڈاکٹر شہید اللہ کے پاس جب وہ کراچی آئے ہوئے تھے خود گئے اور اُنھیں مجوزہ کنونشن صورت حال سے آگاہ کیا تو ڈاکٹر شہید اللہ نے ڈھاکہ میں مقامی ادیبوں کا ایک گروپ بنایا اور اسے بنگلہ اکیڈمی کے کریڈٹ قرض پر P.I.A کے ذریعہ کراچی بھجوا دیا یوں اہل مشرقی پاکستان سے مصارف کا مسئلہ اس وقت تو طے ہو گیا مگر اکادمی یہ قرض ادا نہ کر سکی۔ دو

تین برس کے قضیئے کے بعد گلڈ ہی کو ادا کرنا پڑا۔ بعض ادیبوں مثلاً مصطفیٰ زیدی نے اس کنونشن کو بھی مشاعرہ سمجھا وہ ان دنوں
پنجاب میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ سول سروس کا ٹھاٹ بھی تھا انہوں نے لکھا کہ مجھے فرسٹ کلاس کا کرایہ دیا جائے اعلیٰ جگہ پر قیام
ہو۔ اہلیہ ساتھ ہونگی وغیرہ وغیرہ مگر ان شرائط پر مصطفیٰ زیدی یا کسی کو بھی سرے سے کنونشن میں بلایا ہی نہیں جا سکتا تھا دراصل
بہت سے لوگوں کو نہیں بلایا گیا تھا کیونکہ کنونیشن کا فنڈ، ان کی مطلوبہ کلاس اور مصارف برداشت نہیں کر سکتا تھا سب کو انٹر کلاس
دی تھی۔ لاہور میں بعض لوگوں کی طرف سے بے جا مخالفت کا خوف بھی تھا اسی لئے بیرسٹر اعجاز بٹالوی اور اشفاق احمد کی
طرف سے ان کو مدعو نہ کیا گیا کراچی کے مندوبین کی فہرست شاہد احمد دہلوی صاحب کے مشورے سے مرتب کی تھی یہاں اس
لحاظ سے اعتراض کم کم ہوا بین اعجاز بٹالوی اور اشفاق احمد بہت سے ادیبوں کو لے بھی آئے۔ مگر مولانا صلاح الدین نے
گلڈ کی سخت مخالفت کی تھی اُن کا کہنا تھا کہ پیغمبروں نے گلڈ کبھی نہیں بنائی ہم شعروادب کے پیغمبران کیوں گلڈ بنائیں بعد میں
انہوں نے حلقہ ارباب ذوق میں خطبہ بھی دیا تھا اور وہاں بھی گلڈ کی مخالفت کی۔ مولانا کے علاوہ بھی چند قابل ذکر لوگ
کنونیشن میں نہ آسکے۔ کیونکہ اعجاز بٹالوی اور اشفاق احمد کے پاس بھی کوئی دفتر نہ تھا عملہ نہ تھا اور وہ ہر ایک کے پاس جا کر
دعوت اور روایتی خوشامد نہیں کر سکتے تھے البتہ مشرقی پاکستان سے تمام ہی اہم لوگ کنونشن میں آئے تھے

عالی اُس زمانے میں پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کے فعال رکن منتظم تھے نوکری کی اپنی مصروفیات تھیں دفتر کا
کاروبار کالج کے امور اسی لئے گلڈ کا کام رات ہی میں ہوتا تھا کام کی زیادتی کے باعث اُنھوں نے یونیورسٹی کے چند طالب
علموں، سحر انصاری، نسیم درانی اور انور حسن صدیقی وغیرہ کو ورکر کے طور پر ساتھ لے لیا تھا۔ ممتاز حسین اور شوکت صدیقی سے
اُنھوں نے باقاعدہ معاہدہ کیا کہ وہ گلڈ میں انکے ایماء پر پیش ہونے والی بعض قراردادوں کو منظور کرالیں گے۔

عالی کا خیال تھا کہ گلڈ بن جائے تو گلڈ کیلئے یا تو حکومت رقم فراہم کرے یا مقامی لوگ چندہ دیں اُن کا یہ بھی خیال تھا
کہ گلڈ کو ایک ٹریڈ یونین کی طرح کام کرنا چاہئے۔ جہاں نظریاتی اختلاف کو پسِ پشت ڈال کر مشترکہ مفادات کیلئے کوشش
کریں۔ عالی کا خیال تھا کہ ایسی کوششوں کے نتیجے میں ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع ملے گا۔ وہ ایک
دوسرے کو سمجھیں گے سندھی، پنجابی، پشتو، بنگالی اور اُردو کے ادیب ساتھ مل بیٹھیں گے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی
ہم آہنگی کا ماحول پیدا ہوگا۔ عالی کہتے ہیں کہ اس ساری جدوجہد میں یہ بھی سوچتا تھا کہ گلڈ کتنا ہی کامیاب ہو میری قربانی
ہو جائے گی میں مارشل لاء کا ایجنٹ کہلایا جاؤں گا یا شہاب کا چمچہ لگوں گا۔ لیکن قدم آگے اٹھا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا تھا۔

اور واقعہ بھی یہ تھا کہ لوگ پسِ پشت ایسی ہی باتیں کہہ رہے تھے لیکن عالی کو ایک اطمینان تھا یہ کہ بہر حال وہ پوری
نیک نیتی کے ساتھ ایک اچھا کام کر رہے ہیں۔ اُن کی سرگرمی اور لگن کو دیکھ کر شوکت صدیقی شہاب صاحب، ممتاز حسین اور
جیل سے ہی فیض صاحب بھی گلڈ کے قیام میں دلچسپی لینے لگے۔ کنونشن کیلئے شاہد احمد دہلوی کا خطبہ عالی نے لکھا اسکی نوک پلک
شاہد احمد دہلوی نے درست کی اور اسے آٹھ بانیوں کی کمیٹی سے منظور کرایا۔ ادیبوں کو متحد کرنا بڑا مشکل کام ہے یہ رہ مے

رولاں صاحب کے الفاظ میں مینڈکوں کو تولنے کے مترادف ہے۔

بہت جلد کنونشن کے انعقاد کی فضا ہموار ہوگئی تھی۔ قیامِ مندوبین کیلئے Excelesior ہوٹل کا انتخاب ہوا وہاں ایک دفتر بھی قائم کر دیا گیا۔ شمیم احمد کو پارٹ ٹائم ملازم رکھا گیا اور وہ اس دفتر میں لگا دیئے گئے (اس وقت انہوں نے ایم اے نہیں کیا تھا) مہتمم دفتر عباس احمد عباسی مقرر ہوئے جو بڑے ذہین اور کام کے آدمی تھے مگر انتہائی لا اُبالی اور غیر ذمہ دار بہرحال کنونیشن بلانے والے اولین آٹھ دستخط کنندگان میں شامل تھے۔ کنونیشن کیلئے ۲۹، ۳۰، ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں اور یہ کنونیشن پارسی کمیونٹی کے مرکز واقع کراچی میں منعقد ہوا۔ اس میں کل ۲۱۲ ادیبوں نے شرکت کی جن میں ۶۰ مشرقی پاکستان کے تھے اور باقی مغربی پاکستان کے ۲۱۲ مندوبین جی اے ہال کراچی میں جمع ہوئے۔ پروفیسر مرزا سعید دہلوی نے افتتاحی تقریر کی۔ اس جلسے کی صدارت کوی جسیم الدین نے کی، خطبہ استقبالیہ شاہد احمد دہلوی نے پڑھا انہوں نے شبہات و شکایات کے حوالے سے آٹھ کنوینرز کا گروپ ختم کرنے کا اعلان بھی کیا اور کہا کہ آئندہ کارروائی تمام مندوبین کی رائے کی روشنی میں کی جائے گی اور وہ چاہیں تو کنونیشن کو اسی وقت ختم کر سکتے ہیں سب سکتے میں آگئے پھر حفیظ جالندھری کی پیش کردہ تجویز کے نتیجے میں متفقہ طور پر جمیل الدین عالی کو اسٹیج سیکریٹری نامزد کیا گیا اور طے ہوا کہ کارروائی آگے چلے گی۔ سہ پہر میں دوسری نشست ہوئی جس میں صرف مندوبین شریک ہوئے اس اجلاس کا صدر مولانا حامد علی خان کو بنایا گیا ایک اسٹیرنگ کمیٹی منتخب ہوئی اور اس میں ۹، ۹ ادیبوں پر مشتمل گروپ بذریعہ انتخاب تشکیل دیئے گئے جن کے ذمہ مخصوص فرائض تھے پہلا گروہ " اِدارۂ مصنفین پاکستان" کے قیام اور اُسکے دستور کی تشکیل سے متعلق تھا۔ دوسرا گروپ ادیبوں کی فلاح و بہبود اور تحفظ حقوق قلم کاراں کیلئے بنایا گیا۔ تیسرے گروپ کے ذمہ پاکستانی ادیبوں کے داخلی اور خارجی مسائل کا مطالعہ اور اُنکے حل کیلئے سفارشات مرتب کرنا تھا۔ چوتھی کمیٹی کا کام کاپی رائٹ کے قانون اور مصنف و ناشر کے درمیان روابط کا تعین کرنا تھا پانچویں کمیٹی ادیبوں کیلئے ایک دارالاشاعت کے قیام کے امکانات اور عملی اقدامات کیلئے بنائی گئی تھی۔ چھٹی کمیٹی کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ قومی اور علاقائی زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور ان کے درمیان تبادلہ کیلئے کام کرے۔ ساتویں کمیٹی کے ذمہ متفرق امور اور کمیٹیوں کے درمیان روابط کو رکھنا تھا۔

اس اجلاس میں ۲۸۹۶ قراردادیں پیش ہوئی تھیں جو مختلف مندوبین نے پیش کیں تھیں اور ملک کے مختلف ادیبوں نے ڈاک کے ذریعے بھیجی تھیں وہ ان سات کمیٹیوں کے سپرد کر دی گئیں۔ کمیٹیوں کی کارروائی رات گئے تک جاری رہی۔

۳۰ جنوری سہ پہر کو اسٹیرنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں ان کمیٹیوں کی منظور شدہ تجاویز پیش کی گئیں اور ان پر بحث و مباحثہ کے بعد کچھ ترامیم بھی کی گئیں۔ چند ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں جن کا کام جاری رہا۔ ۳۱ جنوری کو پہلی نشست صبح کے وقت ہوئی۔ جس میں صرف مندوبین شریک ہوئے بنگلہ مندوب پروفیسر کوی بیگم یوسف جمال حسین صدر منتخب ہوئیں اور دو ہزار قراردادیں سخت مباحثے کے بعد سات ذیلی کمیٹیوں اور ایک منتخب اسٹیئرنگ کمیٹی میں زیر غور آ کر منظور و

مسترد ہوئیں۔منظور شدہ قراردادیں اور دستور کا مسودہ مندوبین کے اجلاس میں پیش ہوا جس پر کھل کر بحث و مباحثہ ہوا پھر اسکے بعد منظور شدہ تازہ دستور کی رو سے شام ساڑھے تین بجے ۳۱، جنوری ۱۹۵۹ء تا ۲۸، اپریل ۱۹۶۰ء کیلئے مرکزی مجلسِ عاملہ کے عبوری انتخابات ہوئے عبوری اس لئے کہ ابھی رکنیت سازی عام ہونی تھی اور بقول عالی مندوبین (ابھی تک حالات کو پوری طرح نہیں سمجھ رہے تھے باہمی مشاورت اور عبوری انتخابات کے نتیجے میں مندرجہ ذیل اہل قلم منتخب ہوئے۔ دستور میں یہ طے ہوا تھا کہ ان عبوری انتخابات کے بعد ایک عام اجلاس میں دو سالہ میقات کے لیے انتخاب کیا جائے گا۔

مرکزی عہدیداران

سیکریٹری جنرل۔ قدرت اللہ شہاب

اعزازی خازن۔ عبدالعزیز خالد

سیکریٹری جمیل الدین عالی نامزد کئے گئے۔ بہت بعد میں دستور میں ترمیم کر گئے اعزازی ایگزیکٹو سکریٹری کا عہدہ نکالا گیا مجلسِ منتظمہ انہیں اس عہدے پر مقرر کرتی رہی۔ وہ ۱۹۶۳ء میں قدرت اللہ شہاب کے ہالینڈ جانے کے بعد قائمقام سیکریٹری جنرل ہوئے ازاں بعد ۱۹۶۷ء میں سیکریٹری کا جنرل منتخب ہوئے۔

حلقہ کراچی

اراکین

جمیل الدین عالی۔شاہد احمد دہلوی۔شوکت صدیقی۔غلام عباس۔قراۃ العین حیدر

علاقائی معتمد

ابنِ سعید (چند ہفتوں بعد جی۔ ایچ۔ کیو کے عمومی حکم سے مستعفی ہوئے حکم یہ تھا کہ کوئی حاضر ملازمت فوجی گلڈ کا رکن نہیں ہوگا۔)

طفیل احمد جمالی

حلقہ مغربی پاکستان

اراکین منتظمہ

احمد راہی، اعجاز بٹالوی، امیر حمزہ شنواری، سید فارغ بخاری، سید وقار عظیم، شیخ ایاز، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حاجرہ مسرور، اشفاق احمد

حلقہ مشرقی پاکستان

ابوالحسن، ابراہیم خان، ڈاکٹر عبدالحئی، سجاد حسین، سید عبداللہ، بیگم شمس النہار محمود، عبدالقادر، عسکر بن شیخ غلام مصطفیٰ

جب انتخابات کا مرحلہ آیا تھا تو چند سینئر ادیبوں نے یہ تجویز رکھی کہ شہاب صاحب کو گلڈ کا پہلا سیکریٹری جنرل بلا مقابلہ منتخب کرلیا جائے۔ شہاب صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے سوچا اور کہا بھی کہ میری سرکاری پوزیشن کی وجہ سے گلڈ پر بے بنیاد شکوک و شبہات اور الزامات کی دھند چھائی رہے گی لیکن اُنکی اس بات کو عذرِ لنگ سمجھا گیا اور کسی کسی نے کسر نفسی بھی جانا۔ ایک محفل میں کوی جسیم الدین نے اپنی بنگالی انداز میں اُردو میں آخری فیصلہ اس طرح سُنا دیا۔

"اے بھائی اب تم ہم سے بھاگنا چاہیگا بھی بھاگ نہیں سکے گا گلڈ نیا بچہ ہے اُسکی سواری کیلئے ایک گھوڑا درکار ہے تم پریذیڈنٹ ہاؤس میں پلا ہوا اچھا سرکاری درباری گھوڑا ہے تم ہمارے بہت سارے کام کر سکتے ہو ہم تم کو بالکل نہیں چھوڑے گا" شہاب صاحب کا کہنا ہے کہ گھوڑے کا لفظ میں نے فقط اپنی عزت بڑھانے کی خاطر استعمال کیا ہے۔ کوی جسیم الدین نے دراصل کسی اور چوپائے کا نام لیا تھا۔

سیکریٹری جنرل منتخب ہونے سے پہلے کنونشن کی طرف سے بعد شہاب صاحب کی ڈیوٹی یہ لگی تھی کہ وہ صدر ایوب کو کنونشن کے آخری اجلاس میں ضرور لائیں اُنہوں نے صدر کے ملٹری سیکریٹری کرنل (بعد میں بریگیڈیر) نوازش علی سے اس کا ذکر کیا۔ نوازش علی نے بہت بُرا سا منہ بنا کر نفی میں زور سے سر ہلایا اور کہا۔

"صدر اس قدر مصروف ہیں کہ اس قسم کی ٹٹ پونجیا تقریبات میں جانے کا ہرگز وقت نہیں نکل سکتا۔" اس زمانے کی نوکر شاہی کے تصور میں ادیب نام کی کوئی قابلِ قدر جنس عالم وجود میں موجود ہی نہ تھی۔ نہ کہ یہ مارشل لاء ہوا اور ان کا کنونشن بھی ہوا اور صدرِ مملکت کو مدعو کیا جا رہا ہو یہ کسی سول ملٹری بیوروکریٹ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ "بریگیڈیئر نوازش علی سے مایوس ہو کر میں سیدھا صدر ایوب کے پاس گیا اور درخواست اُنکی خدمت میں پیش کی۔ کس قدر تامل کے بعد انہوں نے پوچھا" کیا میرا وہاں جانا ضروری ہے؟" "جی نہیں سر" میں نے جواب دیا "ضروری تو بالکل نہیں البتہ مناسب ہے" چند مزید سوال و جواب کے بعد ایوب خان نے کنونشن میں جانا منظور کرلیا اور ٹیلی فون پر بریگیڈیئر نوازش علی کو حکم دیا کہ اُنکی مصروفیات میں ۳۱ جنوری کو شام ۴ بجے سے دو گھنٹے کا وقت کنونشن کیلئے مختص کر دیا جائے۔

نوازش علی اور شہاب صاحب کا آمنا سامنا ہوا تو بریگیڈیئر صاحب کا منہ غصہ میں پھول کر کپا ہو چکا تھا۔ ایک ناراضگی تو یہی تھی کہ صدر ایوب خان کو کنونشن میں جانے کیلئے تیار کرلیا اور پھر بقول اُنکے کہ ایسی ٹٹ پونجیا تقریب میں ہم دو گھنٹے بیٹھ کر کیا کرینگے۔ شہاب صاحب نے کہا" جو کھیاں ہم ماریں گے وہی تم بھی مارتے رہنا" لیکن وہ بدستور ناراض ہو رہا تھا پلٹ کر پوچھا سیکورٹی کا کیا بندوبست ہوگا۔ "شہاب صاحب نے نہایت نرمی سے کہا" میرا درد سر نہیں ہے سیکورٹی والوں سے پوچھو"۔ اس ہی لمحے شہاب صاحب نے یہ بھی بتا دیا کہ صدر صاحب کے ساتھ دو سے زیادہ پرسنل اسٹاف نہ ہو کیونکہ ہمارے پاس نشستیں کم ہیں۔ اس کے بعد جن مراحل سے گزرنا پڑا وہ بھی شہاب صاحب کا کارنامہ ہے کہ اُنہوں نے صبر و تحمل سے کام لیکر یہ وقت بغیر کسی رکاوٹ کے گزار دیا (ان پریشانیوں میں مندوبین کے متعلق پوچھ گچھ شامل تھی) ۳۱ جنوری کی صبح

اجلاس میں شہاب صاحب کو ایوانِ صدر سے فون پر بتایا گیا کہ ایوب خان کو بخار ہے اس لئے وہ کنونشن میں شریک نہیں ہو سکتے اور ٹیلی فون اُنکے ڈاکٹر کو دیدیا۔ ڈاکٹر (بریگیڈئیر ایم سرور) نے بتایا کہ صدر صاحب کو بخار ہے اُنہیں کنونشن میں شریک نہ کریں ییں نے اُنھیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔

شہاب صاحب کو صدر ایوب خان کے بخار کا یقین تو آگیا مگر مایوسی بھی بڑی ہوئی۔ شہاب صاحب صدر کی مزاج پرسی کے بہانے دو بجے پریذیڈنٹ ہاؤس پہنچے تو صدر ایوب خان ڈریسنگ گاؤن پہنے ورانڈے میں بیٹھے کچھ فائلیں پڑھ رہے تھے۔ شہاب صاحب کو دیکھتے ہی ایوب خان مسکرائے اور بولے "میں یوں ہی بہانہ نہیں کر رہا اس وقت بھی ۱۰۰ درجہ کا بخار ہے"

شہاب صاحب نے کہا" نہیں سر میں آپ کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا۔" صدر ایوب خان نے پوچھا "تمھارے ادیب لوگ نہیں سمجھیں گے کہ میں بہانہ کر رہا ہوں"

شہاب صاحب نے کہا" ادیب جو چاہیں سمجھتے رہیں اگر ڈاکٹر نے آرام کا مشورہ دیا ہے تو آپ کو ضرور آرام کرنا چاہیے۔"

صدر ایوب نے کس قدر سنجیدگی اور کس قدر مذاق سے پوچھا" کچھ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ ان پڑھ فوجی آدمی ہے پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے سے بھاگ گیا۔"

شہاب صاحب نے کہا" نہیں سر جب اُنھیں معلوم ہوگا کہ آپ کو ۱۰۰ درجہ بخار ہے تو خواہ مخواہ ایسا کیوں سمجھیں گے اور اگر کچھ لوگ ایسا سمجھتے بھی ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے بُخار آخر بُخار ہے وہ بھی ۱۰۰ درجہ کا" یہ بات سن کر ایوب خان مسکرائے اور بولے "خیر یہ تو اتنی بڑی کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔ نوازش اور سرور خوہ مخواہ فکر مند ہیں۔ میرا خیال ہے میں کنونشن میں آؤں گا۔ کوئی تقریر بھی کرنی پڑے گی۔" شہاب صاحب نے کہا" جی نہیں سر آپ کی طرف سے ہم نے کوئی تقریر نہیں رکھی۔ آپ ہماری چند باتیں ہی سن لیں تو ہمارے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے"

'Good' صدر ایوب نے کہا" میں ضرور وقت پر آجاؤں گا" شہاب صاحب نے سوچا کہ ادیب حضرات آخر میں ایوب خان کے خیالات سننا چاہئیں گے۔ دیکھیں ادب اور ادیبوں کے متعلق صدر ایوب خان کے اپنے ذاتی خیالات کیا ہیں"

کنونشن کے آخری اجلاس میں صدر ایوب خان ٹھیک وقت پر اور فوراً اسٹیج کی طرف بڑھے۔ جمیل الدین عالی نے آگے بڑھ کر اُنکی مخصوص نشست کی طرف جو نیچے صف اوّل رکھی گئی تھی اشارہ کرتے ہوئے کہا سر آج آپ ادیبوں کی باتیں یہاں بیٹھ کر سنیئے ان کا ساتھ قرۃ العین حیدر نے بھی دیا واپس ہو کر صدر ایوب سامعین کی صف میں آگے بیٹھ گئے اسٹیج پر صدارت کی کرسی پر ڈاکٹر مولوی عبدالحق تشریف رکھے ہوئے تھے۔ اسٹیج سیکریٹری جمیل الدین عالی مولوی عبدالحق صاحب کے داہنے ہاتھ والی کرسی پر اور شہاب صاحب بائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھے کیونکہ شہاب صاحب صدر صاحب کے سیکریٹری

تھے۔ وہ اسٹیج پر بیٹھے تھے اور صدر صاحب سامعین کی صف میں تھے۔ ایوب خان کے کان قدرے سُرخ ہوئے مگر چہرے پر شکن نہ آنے دی۔ لیکن انکا پرسنل فوجی اسٹاف بڑی طرح سٹ پٹایا ہوا تھا اور " ہمیں قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا"۔ صدر ایوب خان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا شہاب صاحب سمجھے کہ شاید ایوب خان کا بخار تیز ہو گیا یا غصے میں انکا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ جبکہ ایک ٹوٹے ہوئے روشندان سے سورج کی کرنیں براہِ راست صدر ایوب کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اسکا حل ایوب خان نے یہ نکالا کہ کنونشن کے چھپے ہوئے پروگرام کا کتابچہ کھول کر پھیلایا اسے دھوپ سے بچنے کیلئے آڑ بنالیا اور کنونشن کی کارروائی سننے میں منہمک ہو گئے۔

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے خطبہ صدارت کے بعض حصوں کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور اسکے چند پہلوؤں جن پر عام لوگوں کے ساتھ خوش ہو کر صدر ایوب خان تالیاں بھی بجائیں۔ بعض حصے مندرجہ ذیل ہیں۔

"میں اس نادر اجتماع پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں ایسے ایسے فاضل ادیب دیکھتا ہوں جو جدید عہد کے تقاضوں، ادبی نکات و رموز اور ادیبوں کے حقوق و فرائض پر زیادہ بصیرت، گہرائی اور وسعت نظر سے بحث کرتے ہیں یہ نوجوان ادیب زیادہ مستعد اور باخبر ہیں۔ میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔"

مولوی صاحب نے اسی خطبے میں فرمایا "ہمارے ادب میں جو جمود پایا جاتا ہے وہ بہت غور طلب ہے اب ہمیں ذہنی اور ادبی جمود کو توڑنے کیلئے وہی کرنا ہوگا جو اٹھارویں صدی میں فرانس میں انسائیکلو پیڈسٹ Encyclo Paedists نے کیا تھا اس عالی ہمت، جرات مند مفکروں کی مختصر جماعت نے علم و حکمت کی شمع روشن کی اور اوہام باطلہ اور خیالاتِ فاسدہ کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ کائنات اور انسان، ریاست اور معاشرہ، مذہب اور اخلاق کے قدیم نظریات اور روایات کو بڑی جرات اور آزادی سے عقل و حکمت کی کسوٹی پر کسا اور علوم انسانی کو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس انسائیکلو پیڈیا نے خیالات میں تغیر عظیم پیدا کر دیا اور ملک میں بیداری کی نئی لہر دوڑا دی مگر حکومت اور کلیسا دو بڑی قوتیں درپے آزار ہو گئیں۔"

"لیکن باوجود ان موالغات اور مصائب کے ان علم و ادب کے شیدائیوں نے کام جاری رکھا اور انہی معتوب اور ستم رسیدہ ادیبوں کے افکار و خیالات نے اس عظیم انقلاب کی راہ ہموار کی جو "انقلاب فرانس" کے نام سے مشہور ہے۔ آگے چل کر مولوی صاحب نے مزید فرمایا" سلطنتوں کے تخت الٹ جاتے ہیں۔ قومیں فنا ہو جاتی ہیں، تہذیبیں مٹ جاتی ہیں۔ لیکن اُنکے ادیبوں کے کارنامے زندہ رہتے ہیں۔ ادیب قوموں کی اصل پونجی ہیں اور اس پونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے" مولوی عبدالحق کی تقریر سے پہلے چار مقالے پڑھے گئے تھے پڑھنے والوں میں بنگلہ ادیب شامل تھے وہ اور مولوی صاحب کا خطبہ صدر ایوب نے سامعین میں بیٹھ کر بڑی توجہ سے سنے۔ مقالوں کے بعد گلڈ کے نو منتخب سیکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب کی باری آئی۔ انہوں نے بھی انگریزی میں ادیب اور آزادی تحریر پر ایک مضمون پڑھا۔

صدر ایوب نے اپنے ماتحت کے مقالے پر توجہ نہ دی لیکن جب مضمون کے بعض جملوں پر ہال تالیوں سے گونج اُٹھا تو صدر ایوب بھی متوجہ ہوئے پھر وہ کسی مقام پر مسکرائے اور کسی جملے پر اثبات میں سر ہلاتے "شہاب صاحب" کی تقریر کے چند اہم اقتباسات یہ ہیں۔

"اس سے پہلے کہ ادیب اور اسکی آزادی تحریر پر گفتگو کی جائے تو یہ بہتر ہے کہ اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دی جائے وہ ذمہ داریاں یہ ہیں۔

۱) ادیب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں ہوتا۔

۲) وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہوسکتا۔

۳) کسی ایک نظریے کی تبلیغ کرتے ہوئے Politically شاعری کی آڑ لے کر کسی دوسرے نظریے پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔

"یہ تمام حدیں اچھے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں۔مگر اُن کا اطلاق زیادہ تر شدت سے ادیب پر ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر لحہ عوام کی نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے، اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کی آواز کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہے۔ادیب جتنا زیادہ مقبول ہوگا اُتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوگا۔"

اس مقالے میں قدرت اللہ شہاب نے کہا" سرکاری افسر جو ادیب اور اس کے حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں اگر ان کا مطالعہ صرف دفتری مسلوں اور یادداشتوں تک محدود رہے اور اُن کی زندگی کے کوئی لمحات کتابوں کی قسمت میں نہیں ہیں تو وہ ہمیشہ ادب کو غلط سمجھیں گے اور اسے حقارت سے دیکھیں گے "ادیب کی آزادی کیلئے دوسرا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ فاصلے اور وقت کی حدوں سے ماوراء ہوکر زندہ رہ سکتا ہے۔وہ انجانی اور ان دیکھی حقیقتوں کو چھوتا ہے اور اس کے مستقبل کے خواب ممکن ہے آج کی زندگی کی مصلحتوں اور تقاضوں کے بالکل برعکس ہوں وہ نہ پاگل ہے نہ غدار بات صرف اتنی ہے کہ اُس کی نظر زیادہ گہری اور اس کے جذبات آپ سے زیادہ شدید ہیں۔اگر آپ ان بلندیوں کا احساس اپنے ذہن میں نہیں رکھتے تو آپ ادیب کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکیں گے۔"قدرت اللہ شہاب نے کہا" آج جبکہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بہ نفسِ نفیس میرے سامنے بیٹھے ہیں میں نہایت آزادی سے سب کچھ کہہ سکا ہوں جو بھی کہہ چکا ہوں میرا خیال ہے کہ ادیب کے طور پر اگر میری اتنی آزادی برقرار رہے تو میرے لئے قابل قبول ہے۔" کشتی من درآب اندا ختم کے بہ مصداق میں نے بھی آج موقع پا کر آزادی تحریر پر اپنے دل کا غبار نکال پھینکا اور جب میں واپس اپنی کرسی پر بیٹھا تو" بابائے اُردو" نے مجھے دو تین بار شاباش شاباش کہا پھر مُسکرا کے بولے "اب تمہارا کیا بنے گا"ایک تو تم لوگ صدر کو نیچے بٹھا کر خود اسٹیج پر چڑھ بیٹھے دوسرے ایسی تیز تقریر بھی کر ڈالی پھر کچھ سوچ سمجھ کر خود ہی بولے "خیر کوئی بات نہیں نکال دیئے

گئے تو انجمن میں چلے آتا"۔

آخر میں بابائے اُردو نے صدر ایوب خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا محترم صدر پاکستان حاضرین جلسہ آپ سے بھی کچھ ارشادات سننے کے آرزومند ہیں اگر آپ اس جلسے سے خطاب فرمانا منظور فرمائیں تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔" یہ سن کر صدر ایوب نے پہلے تو مجھے گھور کر دیکھا پھر یہ دعوت قبول کر کے اسٹیج پر آ گئے اور انہوں نے نہایت خود اعتمادی سے انگریزی میں فی البدیہہ تقریر کی"۔ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ مجھے کسی تقریر کیلئے نہیں کہا جائے گا..... میں تقریر پر تیار نہیں ہوں اور ایسے ایسے اہل علم و فضل سامنے ہیں مجھے اعتراف کر لینا چاہئے کہ میں آپ کی کارروائیوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ کے مقررین میں تخلیقی اور مجاہدانہ خصوصیات نمایاں تھیں مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصیت پاکستان کے استحکام اور عظمت کیلئے بہت کام آئیں گی۔"

آگے چل کر صدر نے کہا" پہلے انسانی جسموں کیلئے جنگیں ہوتی تھیں آج ذہن انسانی کی تسخیر کے معرکے برپا ہیں۔ اس سلسلے میں آپ پر بہت فرائض عائد ہیں آپ ذہن جدید کی زبان میں صالح نصیب العین کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ کسی نے یہ مسئلہ اُٹھایا ہے کہ سنسر کے قانون کا وجود تخلیقی قوتوں کو دبا دیتا ہے ہاں یہ ناخوشگوار بات ہے لیکن اگر کوئی حکومت واقعی حکومت کہلانے کی اہل ہے تو اُسے کروڑوں انسانوں کے تحفظ کی ذمہ داری پوری کرنے پڑے گی۔"

"میری کوشش یہ رہی ہے کہ لوگوں کو اپنے کام کرنے کے مواقع فراہم کرنے میں اُن کی مدد کی جائے آپ خود دیکھیں گے کہ آپ کو اپنے لائحہ عمل پر چلنے سے کوئی نہیں روکے گا ہر شخص کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری ذمہ داری ہونی چاہئے اور ہم آپ کیلئے جو کچھ ممکن ہے کریں گے۔"

آخر میں صدر ایوب نے کہا" آپ۔ نے جو انجمن بنائی ہے اُس کیلئے آپ کو بہت سی مشکلات درپیش ہوں گی۔ میں اپنے طور پر کہیں نہ کہیں سے دس ہزار روپے کا انتظام کرلوں گا جو میں اپنی پہلی پیش کش کے طور پر دیتا ہوں مگر از راہ کرم یقین کیجئے کہ میں جواب میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ آپ اسے ملکی مفاد کیلئے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔"

صدر ایوب کی کنونشن میں شرکت اور فی البدیہہ ایسی حوصلہ افزا تقریر کے نتیجے میں ایک طرف گلڈ کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور دوسری طرف ایوان صدر کا عملہ بھی اب کسی قدر ہمدردانہ رویے رکھنے لگا۔ گلڈ کی ساری کارروائی میں اگرچہ قدرت اللہ شہاب نمایاں بھی تھے اور فعال بھی مگر اس کے پس پشت کام کرنے والی قوت محرکہ جمیل الدین عالی تھے جو کسی قدر پیچھے رہ کر ادیبوں کیلئے ایک خوشگوار اور سازگار فضاء قائم کرنے کے متمنی بھی تھے اور اس کیلئے کوشاں بھی رہے۔ گلڈ کا قیام عمل میں آ گیا تھا مگر دشواریاں اور اُلجھنیں ابھی باقی تھیں خود گلڈ میں ادیبوں کا ایک ایسا گروہ تھا" جس کے ذہن میں شبہ تھا کہ گلڈ ایک خفیہ تنظیم ہے جو حکومت نے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے بنوائی ہے تا کہ اس پلیٹ فارم پر ادیبوں کو جمع کر کے سرکاری مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ گلڈ بائیں بازو کے غیر محب وطن ادیبوں کی ایک

انجمن ہے جو ان کو تحفظ دینے کیلئے بنائی گئی ہے تا کہ اُن کو دوسرے ادیبوں کی آڑ میں تحفظ حاصل ہو جائے۔ اس گروہ کے سرخیل مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ تھے۔ ان سب کا خیال تھا کہ گلڈ کا قیام فیض، قاسمی، شہید اللہ قیصر، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین اور اسی قبیل کے دوسرے، افراد کو تحفظ دینا تھا۔"

بیوروکریسی کے اس گروہ کی مخالفت کی وجہ سے ان کو بڑی دشواریوں کا سامنا تھا اور دوسری طرف شہاب صاحب اور (تقریباً ایک سال بعد) عالی کی ایوان صدر میں موجودگی بہت سے فوائد کا سبب بنی۔ ایوب خان کی کنونشن میں شرکت اور بعد میں تقسیم انعامات میں خوش دلانہ شمولیت اس بات کا ثبوت ہے قراردادوں کے نتیجے میں فیض صاحب اور دوسرے ادیب رہا ہوئے۔ کتابوں کو اشاعت سے پہلے پرکھنے کے لئے سرکاری منظوری کی قید نہیں رہی کوئی ادیب گرفتار نہیں ہوا کسی کی ملازمت نہیں چھینی گئی۔ گلڈ کا قیام ادب اور ادیبوں کیلئے کئی اعتبار سے انتہائی مفید ثابت ہوا۔ اجلاس عام میں گلڈ کا دستور منظور کیا گیا (ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱) اس طرح ادیبوں کو ایسا پلیٹ فارم میسر آ گیا۔ جہاں سے وہ متحد ہو کر اپنی بات کہہ سکیں اور منوا سکیں۔ ادیبوں کی آواز بھی گلڈ کی وجہ سے موثر ہو گئی۔ گلڈ نے اپنے قیام کے بعد ہی سے ایسے اقدام شروع کیے جن سے جب تک وہ فعال رہا ادیبوں کو بڑے فوائد حاصل ہوئے مثلاً ادیبوں کا اجتماعی بیمہ بلا لحاظ عمر وصحت کرا دیا گیا۔ ایک اشاعت گھر کا قیام عمل میں آیا جس سے ادیبوں کو اپنی کتب کی اشاعت کے بہتر مواقع میسر آئے اشاعت گھر کے تحت "ہم قلم" (اُردو) اور "پوروبی" (بنگلہ) کے نام سے، دو مجلّے جاری ہوئے جن کے ذریعے بہت سے ادیبوں کی سرگرمیاں منظر عام پر آتی رہتی تھیں۔ گلڈ نے اپنے تمام رکن ادیبوں کی بیمہ پالیسی کا اہتمام کیا جس میں عمر وصحت کا کوئی لحاظ نہ تھا۔ پریمئم گلڈ نے ادا کیا تھا۔ وجہ مرگ کا بھی لحاظ نہ تھا رقم ایک لاکھ روپے تھی۔ (ایسا جنوبی ایشیاء میں پہلی بار ہوا تھا۔) کراچی، حیدرآباد، راولپنڈی، لاہور، ملتان، ڈھاکہ، سلہٹ اور چاٹگام میں گلڈ گھروں کا قیام عمل میں آیا سب جگہ عمارتیں ملکیتی نہیں تھیں۔ صرف ملتان اور لاہور میں ایسا ممکن ہوا مگر یہ عمارتیں میسر آ جانے سے ادیبوں کو مل بیٹھنے کی جگہ اور اجلاس منعقد کرنے کا مقام میسر آیا۔ لاہور میں گلڈ گھر آج بھی پارلیمنٹ ہاؤس کے بالکل قریب چودہ کنال پر مشتمل تقریباً اٹھائیس (۲۸) کروڑ روپے کے اثاثے کی شکل میں موجود ہے یہ گلڈ ہی تھا جس نے "اکیڈمی آف لیٹرز" کا تصور دیا۔ اس کا ابتدائی ہیولہ گلڈ ہی نے قائم کیا تھا۔ موجودہ اکیڈمی اگرچہ بہت بعد میں اولاً جناب بھٹو اور جنرل ضیاء الحق کے عہد میں قائم ہوئی مگر اس اکیڈمی کا تصور پہلی بار ابتدائی کنونشن ہی نے پیش کیا اور بعد میں عالی اس کے مسودے حکومت کو بھیجتے رہے۔ گلڈ کا ایک انتہائی اہم منصوبہ یہ تھا کہ پاکستانی ادیبوں کو عالمی شناخت دلانے کیلئے پاکستانی ادیبوں کی نگارشات کا دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی ترجمہ کیا جائے۔ ابتداً جی الانہ مرحوم سے ایک ترجمہ کرایا گیا اُسے چھاپنے کے بعد دیگر ایشائی اور یورپی زبانوں میں ترجمے کی تیاری ہوئی اسی طرح افسانوی ادب کا ترجمہ بھی شروع ہوا۔ اگرچہ بعد میں یہ کوشش جاری نہ رہ سکیں اور اس میں خود ادیبوں کی کوتاہیوں کو بھی بڑا دخل تھا لیکن اس کے باوجود جو کچھ تھوڑا بہت کام ہو سکا وہ ادیبوں کی عالمی شناخت کیلئے انتہائی مفید رہا۔

ایک انتہائی اہم کام جو گلڈ نے انجام دیا اور جس کے پس پشت جمیل الدین عالی کی شخصیت کارفرما تھی یہ تھا کہ ادیبوں کو ان کی تخلیقات پر انعامات دیئے جانے لگے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل انعامات قابل ذکر ہیں۔

ا۔ آدم جی ادبی انعام:

یہ ایک مستقل انعام تھا جو ہر سال بنگالی اور اُردو کے بہترین تخلیقی ادب پر دیا جاتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں قائم ہوا اور ادبی انعام (۱۹۶۲ء) تحقیقی اور تنقیدی ادب پر نیشنل بنک ادبی انعام (۱۹۶۴ء) قومی زبانوں میں بہترین معیشتی ادب پر (۴) حبیب بینک ادبی انعام (۱۹۶۵ء) پاکستان زبانوں کے تخلیقی بین اللسانی تر جموں پر (۵) یونائیٹیڈ بینک ادبی انعام بچوں کے ادب پر دیا۔

۲۔ گلڈ انعام پندرہ ہزار روپے:

یہ انعام سال رواں کی بہترین شائع شدہ ادبی تخلیقات پر دیا جاتا تھا۔ اُردو، بنگلہ، ہندی، پنجابی اور گجراتی زبانیں اس انعام کے دائرہ میں آتی تھیں۔

۳۔ ادبی شخصیت کا انعام:

یہ ہر سال ممتاز ترین ادبی شخصیت کو دیا جاتا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا اس کا نام سرسید ادبی ایوارڈ تھا ویسے یہ انعام اگرچہ روبہ عمل نہ آسکا لیکن اسی تجویز کا اثر تھا کہ اب اکیڈمی آف لیٹرز یہ انعام کمال فن ایوارڈ کہلاتا ہے کسی ادیب کی عمر بھر کی خدمات پر پانچ لاکھ روپے مالیت کا دیتی ہے اس انعام کا اجراء ایک طرح سے گلڈ ہی کی تجویز کا نتیجہ ہے۔

گلڈ کے قیام اور اس کے دستور کی تیاری کے سلسلے میں اصل کام جمیل الدین عالی نے انجام دیا پورا مسودہ دستور انہوں نے کنونشن کے سامنے پیش کیا تھا جس کو ذیلی کمیٹی نے پرکھا اور اجلاس عام سے منظور کرایا۔ جب گلڈ کی تاسیس ہوگئی اور متعدد تجاویز منظور ہوگیئں تو گلڈ نے جب تک وہ قائم رہا ادیبوں کی فلاح و بہبود کیلئے ایسے کارنامے انجام دیئے جو صرف ترقی یافتہ ملکوں میں تو رائج ہیں ترقی پذیر ممالک ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ گلڈ کے قیام کے بعد ہی یہ ممکن ہوسکا کہ بیمار ادیبوں کو امداد اور مرحومین کے ورثاء کیلئے وظائف کے اجراء کی ریت پڑے۔ نجی شعبے کے تحت ہی سہی پہلے بعد پانچ ادبی انعامات کا قیام ممکن ہوا۔ ادیبوں کو غیر ممالک کے دوروں کے مواقع فراہم کئے گئے۔ بیمے کے ذریعہ ادیبوں کے حفظ حیات کا اہتمام کیا گیا۔ آزادی تحریر کو تسلیم کیا گیا۔ اور ادیبوں کے حقوق کے تحفظ کو لازمی بنایا گیا یہ ایسے کارنامے ہیں جن کا روداروی میں ذکر کرنا کافی نہیں معاشرے اور حکومت سے ایسی مراعات حاصل کرنا مربوط جدوجہد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ (آخری تجربے میں بقول شہاب صاحب) یہ جمیل الدین عالی کی تنہا ذات تھی جس نے ایک ادارے کا کام کیا اور ادیبوں کو وہ سہولتیں اور مراعات مہیا کیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اُنہوں نے اپنے عزیز افتخار احمد خان محمدنی (ایڈیشن کمشنر مالیات ضلع

لاہور کے ذریعے پنجاب اسمبلی کے مقابل ایک بڑی زمین حاصل کی) جو اب بھی گلڈ کی ملکیت ہے اور اس کی موجودہ قیمت دو کڑوڑ روپے فی کنال کے حساب سے اٹھائیس کڑوڑ بنتی ہے۔ یہ گلڈ ٹرسٹ کے زیر انتظام ہے جسے عالی نے بنایا وہ اس کے اعزازی سیکریٹری تھے۔ جیسا کہ ادبی انجمنوں کا حال ہوتا ہے گلڈ بھی باہمی رقابتوں ادیبوں کی انانیت اور باہمی کش مکش کا شکار رہا عالی بہت کچھ برداشت کرتے رہے۔ انکے رخصت ہونے کے چند سال میں اسکی سرگرمیاں محدود ہوتے ہوتے سرد پڑ گئیں۔ اب بڑی حد تک یہ کام اکادمی ادبیات پاکستان انجام دے رہی ہے تو وہ ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اور سرکاری انداز میں کام کرتا ہے مگر وہ جن خطوط پر کام کر رہے ہیں وہ بنیادی طور پر گلڈ کے مرتب و متعین کردہ ہیں۔ سوائے اسکے کہ گلڈ اسکے عہدہ دار بذریعہ انتخاب تجویز کرتا تھا اور وہ ہوتے ہیں حکومت وقت کے متعین کردہ تمام افسران گلڈ کے زیر انتظام پانچ ادبی انعاموں کا اجراء کیا گیا یہ انعام سالوں دیئے جاتے رہے مگر جیسا کہ انعامات کے معاملے میں ہر جگہ ہوتا ہے ان انعامات کے نتائج بھی اختلافی رہے پہلی بار جب انعام کا معاملہ زیر غور آیا تو ناولوں میں "خدا کی بستی" کے ساتھ "آگ کا دریا" بھی زیر غور آیا۔ مصنفین میں مولوی عبدالحق مسٹر جسٹس رحمان اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری شامل تھے یہ پہلا سال تھا کہ مجبوریوں کے سبب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۹ء تک چھپنے والی کتاب یا تو مصنف خود ارسال کرتا یا ناشر۔ اتفاق سے "آگ کا دریا" کے ناشر نے بھی کتاب انعام کیلئے بھجوادی۔ جو کتابیں انعام کی دوڑ میں شامل تھیں وہ جسٹس رحمان کو بذریعہ ڈاک بھجوادی گئیں اختر حسین رائے پوری کو بھی بھیج دی گئیں مگر مولوی صاحب کے خصوصی احترام کے پیش نظر عالی یہ کتابیں لے کر خود مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب دو بڑے بڑے ڈبوں میں اتنی ساری کتابیں دیکھیں تو مولوی صاحب چراغ پا ہوئے فرمانے لگے "ارے میں یہ اتنے سارے نام نہاد تخلیقی کارنامے چار مہینے میں پڑھ کر فیصلہ دوں؟ کوئی میں تمہارا نوکر ہوں؟ اب خدمتِ اردو یہی رہ گئی ہے میرے لئے" جب کچھ ٹھنڈے پڑے اور ادھر اُدھر سے کتابوں پر نظر ڈالی ("آگ کا دریا" اور "خدا کی بستی" جزوی طور پر پڑھ چکے تھے) تو کہنے لگے "منظومات اختر حسین اور جسٹس رحمان دیکھ لیں گے میں تو سجاد حیدر کی بیٹی کو انعام دوں گا" بہت جلد "آگ کا دریا" سرکاری عتاب میں آگیا۔ مارشل لاء والوں نے اپنے ایک خصوصی فوجی بریگیڈیئر ایف۔ آر خان کو وفاقی وزارت کا معتمد مقرر کر رکھا تھا۔ انہوں نے صحافیوں ادیبوں، دانشوروں پر خاص طور پر نظر رکھنے کے لئے وزارتِ اطلاعات کے علاوہ ایک نیا محکمہ بنایا جس کا نام بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن رکھا گیا۔" (۱) اس بیورو نے ایک صاحب سے "آگ کا دریا" اور عینی صاحبہ کے خلاف نہایت نازیبا الفاظ میں مارننگ نیوز کراچی اور جنگ کراچی میں مضامین شائع کرائے۔ عالی سے گلڈ کے دفتر سے بذریعہ بیرسٹر کمال فاروقی دونوں روزناموں کو ہتک عزت کے حوالے سے قانونی نوٹس بھیجے اور دعویٰ دائر کر رہے تھے کہ روزناموں نے تحریری معافی مانگ لی۔

انعام میں اس طرح شرکت کی خبر کسی طرح قرۃ العین کو بھی ہوگئی (شاید مولوی صاحب کے کسی حاضر باش نے یہ بات ان تک

پہنچادی) وہ بڑی چراغ پا ہوئیں عالی کے سر ہوگئیں کہ میری کتاب انعام کیلئے کس نے داخل کی! بتایا گیا کہ ناشر نے فون پر ناشر کو جھاڑ دیا۔ غرض وہ بضد تھیں کہ اُن کی کتاب انعام کیلئے زیرِ غور نہ لائی جائے کیونکہ وہ اپنے بقول جبریہ حالات کے تحت حکومت وقت مارشل لاء کی ملازم تو رہ سکتی تھیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ذریعہ انعام لینا اُنھیں گوارا نہ تھا غرض پہلا انعام ہی گڑبڑ کا سبب بن گیا۔ قرۃ العین حیدر کا اصرار بڑھا تو عالی نے یہ ترکیب کی کہ اُنھیں ججوں میں شامل کردیا یوں ان کی کتاب زیرِ غور آنے کی اہل نہ رہی۔ مولوی صاحب کو بھی بتا دیا گیا کہ عینی خود جج ہیں اس لئے ان کی کتاب پر انعام نہیں دیا جاسکتا یوں پہلا انعام شوکت صدیقی کو "خدا کی بستی" پر اور غلام عباس کو "جاڑے کی چاندنی" پر ملا۔

دوسرے سال کے مقابلوں میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور وقار عظیم صاحب ججوں میں شامل تھے اس سال جمیلہ ہاشمی کا "تلاش بہاراں" اور ممتاز مفتی کی "علی پور کا ایلی" زیرِ غور کتابوں میں اہم تر تھیں۔ ججوں نے "تلاش بہاراں" کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس پر ایک شور مچ گیا۔ یہ سچ ہے بغیر کے انعام کا فیصلہ جج صاحبان کرتے ہیں گلڈ کے منتظمین خصوصاً جمیل الدین عالی کو اس میں ملوث گردانا گیا۔ ناشر اشفاق احمد اور خود ممتاز مفتی بھی عالی سے برسوں ناراض رہے۔ کوئی بیس سال بعد جب عالی نے انجمن ترقی اردو کی نشان سپاس والی تقریب میں کہا کہ یہ ججوں کا فیصلہ تھا جس میں وہ مداخلت نہیں کرسکتے تھے اور یہ کہ وہ ممتاز مفتی کو جمیلہ ہاشمی سے بڑا ادیب سمجھتے ہیں تو یہ بات کلی پھندنوں کے ساتھ جمیلہ ہاشمی تک پہنچائی گئی اب جمیلہ ہاشمی کی باری تھی وہ عالی سے ناراض ہوگئیں اور شاید تا حیات ناراض رہیں حالانکہ عالی نے انکی بیوگی کے بعد اپنے کالم اور تعلقات کے ذریعے انکے وراثتی مخالفوں سے لڑائی مول لے رکھی تھی۔

۱۹۶۳ء میں منصفین نے طے کیا کہ آدم جی ادبی انعام میں سے نثر کا انعام خدیجہ مستور کو "آنگن" پر اور نظم کا انعام جعفر طاہر کو دیا جائے۔ جعفر طاہر فوج کے ایک نان کمیشنڈ آفیسر تھے (صوبیدار میجر) اور ان کی کتاب "ہفت کشور" تھی۔ انعام اس سال بھی صدر ایوب کو تقسیم کرنے تھے۔ لیکن اس وقت سے ذرا پہلے ایوانِ صدر میں جلسہ کی پوری تیاری تھی اور مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے صدر ایوب نے عالی کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ پوچھا کہ جن کتابوں پر انعام دیا جاتا ہے تم ان کو پڑھتے ہو۔ عرض کیا گیا کہ اپنے شوق سے پڑھ لیتا ہوں۔ ورنہ انعام کا فیصلہ جج صاحبان کرتے ہیں اور اس غرض سے وہی پڑھتے ہیں۔ کہنے لگے یہ خاتون تو کمیونسٹ ہیں جن کو انعام دیا جارہا ہے اور تم میرے ہاتھوں ان کو انعام دلا کر میری رسوائی کا سامان کررہے ہو۔ صدر کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا یہ دراصل اعلیٰ جنس کی خصوصی رپورٹ تھی جس میں صدر کو مطلع کیا گیا تھا کہ ایک سکہ بند بائیں بازو کی ادیبہ کو صدر کے ہاتھوں انعام دلا کر بین الاقوامی طور پر پاکستان کو مشکلات میں مبتلا کرتا ہے۔ اب صدر ایوب یہ چاہتے تھے کہ انعام دینا ہی ہے تو پھر ان خاتون کو انعام سے الگ کردیا جائے مگر عالی نے کہا کہ اس صورت میں جب یہ خاتون اپنی نشست سنبھال چکی ہیں یہ ممکن نہیں ہے چاہے اس کے لئے نوکری ہی قربان کرنا پڑے پھر یہ کہ اسی کے ساتھ ایک فوجی جعفر طاہر کو بھی انعام دیا جارہا ہے کیا یہ بات اس ناشر کو ہوا نہ دے گی۔ فوجی

کے ذکر پر صدر ایوب چونکے۔ تفصلات پوچھیں اور بالآخر تقسیم انعام کے لئے ہال میں تشریف لے آئے۔ خدیجہ مستور کو نہ صرف انعام دیا ان کی خصوصی پرستش احوال بھی کی۔ اسی تقریب میں جعفر طاہر صدر مملکت اور اپنے فیلڈ مارشل سے انعام وصول کرتے ہوئے دہشت سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس تقریب میں کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ خصوصی طور پر شریک ہوئے تھے اور صدر ایوب انٹلی جنس رپورٹ کے باوجود بہت اچھے موڈ میں تھے اور انہوں نے بڑی خوش دلی سے تقسیم انعامات کا حق ادا کیا تھا۔ وہاں باتوں باتوں میں انکی توجہ ایک امر کی طرف دلائی گئی کہ جعفر جیسا قابل ادیب ابھی تک نان کمیشنڈ افسر ہے۔ چند روز بعد انہیں کمیشن دے دیا گیا اس سے اگلی بار نثر کا انعام "اداس نسلیں" کو نظم، کا احمد ندیم قاسمی کو اور بنگلہ کا انعام شہید اللہ قیصر کو ملنا تھا۔ یہ سال ۱۹۶۳ء کے انعامات تھے جو ۱۹۶۴ء میں تقسیم ہو رہے تھے اُداس نسلیں حکومتی حلقوں میں پسندیدہ کتاب نہ تھی اور اس میں ایک ادھ جگہ انگریزی کے چار حرفی الفاظ بھی آ گئے احمد ندیم قاسمی کی شہرت بھی سکہ بند ترقی پسند کی تھی۔

اور شہید اللہ تو تھے ہی ایک مانے ہوئے کمیونسٹ، چنانچہ ان کتابوں پر پابندی لگانے کا نوٹی فیکشن تیار ہونے لگا۔ عالی کو اپنے ذرائع سے اداس نسلیں کے ممنوع کیے جانے کی تجویز کی اطلاع مل گئی انہوں نے جلدی جلدی یہ کیا کہ صدر انجمن ترقی اردو جناب اختر حسین صاحب سے صدر کے نام خط لکھوایا کہ وہ کراچی میں اردو سائنس کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے تاریخ دیدیں اور خود گلڈ کے تقسیم انعامات کیلئے عرضی پیش کر دی۔ اس زمانے تک صدر صاحب اپنے سابق وزیر اور گورنر مغربی پاکستان اختر حسین صاحب سے مانوس تھے۔ پنجاب کے گورنر نواب کالا باغ بھی ان کا احترام کرتے تھے عالی ان کا خط لے کر صدر کے ملٹری سیکریٹری سے ملے تاریخ لے لی اور پریس میں اعلان کر دیا۔ گورنر کو جب اسکی اطلاع ملی تو انہوں نے عالی کو بلا کر واضح کر دیا کہ اس بار آپ سبقت لے گئے ورنہ ہم اس کتاب پر پابندی لگا دیتے تو تقسیم انعامات نہ ہو پاتی بہرحال آئندہ کیلئے ہم سوچیں گے۔ اسی سبب سے مشرقی پاکستان میں گورنر منعم خان بھی خاموش ہو گئے۔

اس قصہ کی ساری تفصیل ممتاز احمد خان کی کتاب " آزادی کے بعد اردو ناول " کے حرفے چند میں موجود ہے۔

بہرحال (مئی ۱۹۶۴ء میں) وہ انعامات بھی خیر و خوبی سے تقسیم ہوئے اور اُردو کالج کا سنگِ بنیاد بھی رکھ دیا گیا مگر بعد میں عالی سے جواب طلبی وزارت اطلاعات کی طرف سے ہوئی کہ ایسی فحش کتاب اداس نسلیں پر صدر سے انعام کیوں دلوایا گیا اور سکہ بند مارکسی ادیبوں کی حوصلہ افزائی کیوں کی گئی؟ عالی نے اُردو اور بنگلہ کے منصفین انعامات سے اس کے جواب تیار کرائے بنگلہ منصفین تو بڑے چراغ پا ہوئے اور گلڈ سے استعفیٰ دے بیٹھے۔ البتہ اردو منصفین بشمول ڈاکٹر شوکت سبزواری ڈاکٹر وحید قریشی اور آغا افتخار حسین کے جواب تشفی بخش نہ پا کر حکومت نے آئندہ کیلئے منصفین میں ایک حکومت کے نمائندے کی شمولیت کا مطالبہ کر دیا۔ شہاب صاحب ملک سے باہر ہالینڈ میں تھے عالی نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔ اس کے بعد تین سال تک ادبی انعامات کا اعلان ہوتا رہا مگر صدر انعامات تقسیم کرنے نہ آئے انعامات زیادہ ہو گئے تھے واؤد، آدم جی، نیشنل

بینک، حبیب بینک اور یو بی ایل۔ مگر حکومت کے ڈر سے نہ کوئی خریطہ انعام تیار کراتا تھا نہ رقم دیتا تھا۔ عالی اپنی پالیسی بدلنے یعنی گلڈ کو حکومت کے زیر انتظام دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تین سال بعد قدرت اللہ شہاب وزارت تعلیم کے سیکریٹری ہو گئے واپس آئے تو انہوں نے صدر کو ایک سمری ارسال کی کہ تین سال سے انعامات کی تقسیم زیر التوا ہے صدر مصروف رہتے ہیں اس لئے اجازت دیں کہ کسی دوسری اہم قومی شخصیت سے یہ انعامات تقسیم کرائے جائیں اجازت مل گئی۔ چنانچہ سپریم کورٹ کے جسٹس عزت مآب اے آر کارنی لی اس CORNELUS نے یہ انعامات تقسیم کئے اس کے بعد سے یہ رسم پڑ گئی کہ گلڈ کے انعامات ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا کوئی جج تقسیم کرتا۔ ایک مرتبہ مشرقی پاکستان کی مشہور شخصیت اسٹیٹ بنک کے گورنر مسٹر راشد نے بھی انعامات تقسیم کیے۔

انعامات کی تفصیلات گلڈ کے ریکارڈ کے ساتھ لاہور میں ہیں اور ان تک رسائی تا حال ممکن نہیں۔ بہر حال کوشش جاری ہیں۔

گلڈ کی گیارھویں سالگرہ (۱۹۷۰ء) کے موقع پر انعامات کے مسئلے نے ناگوار صورت اختیار کر لی۔ ہوا یہ کہ محمد خالد اختر کی کتاب " کھویا ہوا افق " مقابلے میں شامل تھی منصفین نے خالد اختر کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ انعامات کی تقسیم کیلئے حسب معمول گلڈ کی سالگرہ کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ تقریب کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ انعام پانے والے مدعو کیے جا چکے تھے۔ پورے پاکستان سے متعلقہ ادیبوں کے گروپ آ چکے تھے۔ چیف جسٹس مسٹر حمید الرحمٰن مہمان خصوصی تھے۔ اور اُنہی کو انعام تقسیم کرنا تھا۔ وہ لاہور سے کراچی پہنچ چکے تھے۔ کہ بیگم حسن زمانی عالمگیر نے انعامات کے خلاف کراچی کی عدالت میں سے حکم امتناعی کا نوٹس لے لیا۔ عدالت کا ہرکارہ یہ حکم لے کر وہ بھی ہفتے کی سہ پہر عالی کے پاس پہنچا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وکلاء سے مشورہ کیا گیا اور طے یہ ہوا کہ چیک کی رقم کیش کرالی جائے اور (نیشنل بینک سے) اسی وقت ادا کر کے رسید لے لی جائے (سہ پہر کو ممنوع مگر خصوصی اثر رسوخ سے) اس کے بعد حکم امتناعی وصول کیا جائے۔ بیرسٹر کمال اظفر نے جو گلڈ کا مقدمہ لڑنے کے لئے گئے ہوئے تھے کہا کہ رقم کے سلسلے میں تو عدالت کا نوٹس رقم رکوا سکتا تھا۔ لیکن صرف اسکرول یعنی ضابطے کے تقسیم کیے جانے سے توہین عدالت نہیں ہوگی۔ یہ بھی طے ہوا کہ تقریب میں ضلع کے بیرسٹر اور ہائیکورٹ کے ججوں کو بھی مدعو کیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ یہاں صرف اسکرول دیئے جا رہے ہیں کیونکہ انعامات کی نقد رقم ادا کی جا چکی ہے۔ اس اجلاس میں جناب فیض احمد فیض بھی جو اس سال متعلقہ مجلس منصفین کے صدر تھے خطبہ خاص کیلئے مدعو تھے مقدمہ ان کے خلاف بھی دائر ہوا تھا۔ ساتھ ہی بیگم حسن زمانی عالمگیر دھمکیوں پر دھمکیاں دے رہی تھیں ان کا کہنا تھا کہ وہ جلسہ عام میں اپنا احتجاج ظاہر کریں گی۔ اور لوگوں کی صورت حال سے آگاہ کریں گی اور جلسہ میں ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس کا انتظام عالی نے یہ کیا کہ اُردو کالج کی ایک پروفیسر رباب رضوی کو جو اس زمانے میں نوجوان اور صحت مند تھیں، ان خاتون سے معاملہ کرنے پر متعین کیا۔ مہمان چیف جسٹس کو بھی Stay order کے جاری کیے جانے کی

صورت حال سے مطلع کر دیا گیا۔ بہر حال مقررہ تاریخ کو جلسہ منعقد ہوا اس میں فیض صاحب کو خطبہ استقبالیہ پڑھنا تھا مگر وہ بھی خوف زدہ تھے کہ کہیں بیگم عالمگیر ان سے بھی کوئی گستاخی نہ کر بیٹھیں مگر رباب رضوی آ کر بیگم عالمگیر کے ساتھ بیٹھ گئیں اُن کے ساتھ چار پانچ طالبات حسن عالمگیر کے آگے، پیچھے دائیں بائیں قبضہ جمائے ہوئے تھیں۔ جلسہ شروع ہوا فیض صاحب نے ڈرتے ڈرتے خطبہ استقبالیہ پڑھا، عالی لرزتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ انعامات کا اعلان کرتے رہے، جلسے میں کوئی بدمزگی نہیں ہوئی اور سب کچھ بخیر وخوبی انجام پا گیا۔ سب لوگ چائے پینے چلے گئے لیکن بیگم عالمگیر اپنی نشست پر ہی بیٹھی رہ گئیں۔ لوگ چائے پی چکے بیگم عالمگیر پھر بھی وہیں بیٹھی رہیں عالی صاحب ان کے پاس پہنچے اُن کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور اُنھیں بھی چائے کی دعوت دی لیکن بیگم عالمگیر انتہائی خفگی کے عالم میں بولیں "you go away" میں یہاں سے خود ہی چلی جاؤں گی۔ اس وقت عالی نے دیکھا کہ رباب رضوی اپنی ٹیم کے ساتھ دروازے پر کھڑی تھیں عالی نے جا کر اُن سے پوچھا کہ تم نے کیا کیا اور اُنھیں کس طرح سمجھایا۔ رباب رضوی نے کہا یہ ہم بعد میں بتائیں گے اس واقعے کے بعد کوئی چار پانچ ماہ بعد رضوی نے عالی کو بتایا کہ اُنہوں نے بیگم عالمگیر سے کہا تھا کہ اگر آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں تو ہم آپ کا ازار بند کاٹ دیں گے چھوٹی قینچی اور بلیڈ اُن لڑکیوں کے ہاتھوں میں دکھائی دے رہے تھے جو رباب رضوی کے آس پاس بیٹھی تھیں۔ عالی صاحب نے اس پر ایک قہقہ لگایا اور کہا کہ وہ آخر اس روز اتنی دیر تک کیوں بیٹھی رہیں تو رباب نے بتایا کہ ہم نے انہیں دھمکی دی تھی کہ آپ وہ اُس وقت تک نہ اُٹھیں جب تک ہم نہ چلے جائیں۔ اس واقعے کے بعد بھی مقدمہ بہر حال جاری رہا۔ اور جیسا کہ ہوتا ہے مقدمے نے اتنا طول کھینچا کہ ڈھائی سال تک پیشیاں پڑتی رہیں۔ اُس زمانے میں عالی کم کم دفتر آئے کیونکہ بنگلہ ادیب محبوب جمال زاہدی ۱۹۷۲ء میں گلڈ کے سیکریٹری جنرل منتخب ہو کر گلڈ کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ شوکت صدیقی روزنامہ انجام سے فارغ ہو کر گلڈ کے اعزازی آفس سیکریٹری کے طور پر کام کر رہے تھے یہی دونوں حضرات پیشیاں بھگتا رہے تھے اور دھوپ میں لائن حاضر رہتے تو پانی پی پی کر عالی کو کوستے کہ نہ گلڈ بناتے نہ یہ دن دیکھنا پڑتے۔ کوئی ڈھائی سال بعد یہ مقدمہ خارج ہو گیا۔ اسکی پیروی بیرسٹر کمال اظفر صاحب نے کی۔

اس تقسیم انعامات کے بعد عالی نے ایک کام اور کیا انہوں نے دو چار وظائف جاری کرانے کے علاوہ کراچی گیس کمپنی سے بھی "سرسید انعام" جاری کرا دیا اس کے بعد گلڈ کے انتخابات ہوئے اور عالی گلڈ سے علیحدہ ہو گئے۔ گلڈ کے معاملات کی وجہ سے عالی کو بہت سے نقصانات اُٹھانے پڑے اُنہوں نے گلڈ سے نہ کوئی ادبی مراعات نہ کوئی دوسرے فوائد اُٹھائے البتہ مخالفتوں کے علاوہ بہت سے مادی نقصانات اُن کی جھولی میں ضرور آئے۔ عالی کا بیان ہے کہ ۱۹۷۰ء میں نیشنل بینک کا انعام نہیں دینے کا فیصلہ ہو رہا تھا اسکی اطلاع اچانک گلڈ والوں نے عالی کو دی۔ عالی اس وقت نیشنل بینک میں ٹیکس ایڈوائزر تھے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ مینجنگ ڈائریکٹر (جناب انور قادر) نے انکے کسی مخالف افسر کے کہنے پر یہ رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا سبب اس کا یہ بتایا گیا کہ ممتاز حسن صاحب نے جب وہ نیشنل بینک سے وابستہ تھے (۱۹۶۴ء) اپنے بورڈ

سے پوچھ کر اس رقم کی منظوری دے دی تھی مگر بورڈ میں کوئی میری روداد نویسی کی توثیق نہیں ہوئی تھی (حالانکہ رپورٹ غلط تھی) انعام اگلے برسوں دیا جاتا تھا لیکن اس بار کسی کے کہنے پر میجنگ ڈائریکٹر کہہ رہا تھا کہ ادائیگی نہیں ہوگی عالی نے اپنی نوکری کا خطرہ مول لیتے ہوئے انہیں ایک دفتری نوٹ لکھ کر بھیجا کہ اس سال انعام کا اعلان ہو چکا ہے ہر سال انعام دیا جاتا رہا ہے اس وقت بھی حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک اور آدمجی وغیرہ کے انعامات دیئے جائیں گے کیا وہاں کھڑے ہو کر اعلان کروں کہ نیشنل بینک نے رقم منظور نہیں کی اور انعام واپس لے لیا۔ اس سے بینک کی شہرت کو نقصان پہنچے گا۔ انعام تقسیم کرنے پاکستان کے چیف جسٹس عزت مآب حمود الرحمٰن آرہے ہیں ایم ڈی نے عالی کو طلب کیا اور کہا" مسٹر عالی اس بار میں اس کو Allow کر رہا ہوں مگر آئندہ ایسا نہ ہوگا" اس پر دونوں میں تیز کلامی ہوئی اور ایم ڈی نے عالی پر واضح کر دیا کہ انعام تو دے دیا جائے گا مگر اس کو بھگتنا آپ کو پڑے گا۔

بعد میں بھٹو صاحب کے زمانے میں ۱۹۷۱ء میں عالی نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ نیشنل بینک کی ملازمت نیم سرکاری ملازمت تھی ایسے ملازموں کو قومی اسمبلی کے ایک خصوصی قانون کے ذریعے انتخاب لڑنے کی اجازت دیدی تھی۔ اس انتخاب میں کئی ایسے ملازمین نے صدارتی انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ مگر عالی کے مقابلے میں جماعت اسلامی کے امیدوار جناب منور حسن کامیاب ہو گئے۔

۱۹۶۷ء میں شہاب نے فیض صاحب کو ایک ثقافتی کمیشن کا سربراہ بنوادیا اس کے لیے سینئر ممبر عالی تھے۔ بانو قدسیہ اور بنگال سے منیر چودھری اور (مشرقی پاکستان کے، اردو ادیب) محمد صلاح الدین رکن تھے۔ یہ لوگ شہر شہر پھرے رپورٹ، تیار کی گئی مگر ۱۹۶۸ء کے اواخر میں ایوب خان کے خلاف ایک بڑی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی اور ۶۹ء میں وہ رخصت ہو گئے۔ یحییٰ خان کا دورِ حکومت آیا اور چلا گیا۔ بھٹو صاحب کے دور میں فیض کمیٹی کی رپورٹ زیرِ غور رہی۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی تھی اس پر جمیل الدین عالی نے فیض صاحب سے ایک اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ ماؤزے تنگ کے خیالات کی بنیاد پر عوامی کلچر کا جو تصور مرتب ہوتا ہے ہمارے معاشرے میں بھی اُسی تصور کی پیروی کی جاتی چاہیے۔ بھٹو صاحب کے دور میں جناب عبدالرحیم وزیر ثقافت تھے اُنھوں نے اس کمیٹی کی میٹنگ بلائی۔ کمیٹی کے علاوہ کئی ثقافتی کارکنوں کو بلایا گیا۔ کمیٹی کی سفارشات پر خاصا اختلاف رہا عالی کے اختلافی نوٹ پر بھی طنز و تعریض کی گئی لیکن بحث و مباحثہ کے بعد کئی سفارشات مان لی گئیں۔ عالی کا اختلافی موقف مسترد کر دیا گیا۔ کونسل آف آرٹ ترتیب دی گئی۔ گلڈ سے عالی کی میقات ختم ہونے کے بعد بنگالی ادیب محبوب جمال زاہدی معتمد عمومی منتخب کیے گئے تھے یہاں احمد فراز فیض صاحب کی سفارش پر ڈائریکٹر مقرر کیے گئے اودھر آہستہ آہستہ گلڈ غیر فعال ہوتا گیا۔ اسکے انعامات کی تقسیم رفتہ رفتہ بند ہوگئی اور ادیبوں کی بہبود کے کئی دیگر کام بھی کنجِ خمول میں جا پڑے۔

جمیل الدین عالی نے گلڈ ادبی انعام (۱۹۶۲ء) آدم جی ادبی انعام (۱۹۶۰ء) نیشنل بنک ادبی انعام

(۱۹۶۳ء) داور ادبی انعام (۱۹۶۲ء) حبیب بنک ادبی انعام (۱۹۶۴ء) یونائیٹڈ بنک ادبی انعام (۱۹۶۵ء) قائم کیا۔
وہ ان سب انعامات کے بانی معتمد اعزازی بھی رہے لیکن انہوں نے خود پر ہر انعام کو تاعمر ممنوع کر لیا تھا تاکہ ابتدائی ہی
سے اُن کا بھرم قائم ہو جائے۔ ایسا ہماری ادبی و انتظامی تاریخ میں نہ پہلے ہوا نہ بعد میں۔

گلڈ ادبی انعامات

۱۹۶۴ء

۱۔	دھرتی دیاں ریکھاں	نثر	آغا اشرف	پنجابی	ایک ہزار روپے
۲۔	بیلے بیلے	نظم	احمد ظفر	=	=
۳۔	دھینے نمگ	نظم	حکیم غلام سرور طاہر کلاچوں	پشتو	=
۴۔	یون	=	امیر خمرہ شنواری	=	۵۰۰
۵۔	لٹے	نثر	محمد اعظم	=	=
۶۔	سندھی بولی	=	سراج الحق	سندھی	ایک ہزار روپے
۷۔	موزعشق	نظم	محمد جمن	=	ڈھائی سو روپے

۱۹۶۰ء خدا کی بستی اور جاڑے کی چاندنی (غلام عباس)

۱۹۶۱ء تلاش بہاراں جمیلہ ہاشمی شاعری کی کتاب کا نام یاد نہیں

۱۹۶۲ء خدیجہ مستور + جعفر طاہر

۱۹۶۳ء اداس نسلیں عبداللہ حسین اور دشت وفا احمد ندیم قاسمی

۱۹۶۴ء قتیل شفائی کی مطربہ + قار قلیط، عبدالعزیز خالد

۱۹۶۵ء آبلہ پا۔ رضیہ فصیح احمد

۱۹۶۶ء ادا جعفری + افکار پریشاں، جمیس کیانی

۱۹۶۷ء

۱۹۶۹ء محمد خالد اختر

۱۹۶۸ء

گلڈ ادبی انعامات

سال گذشتہ اردو تصانیف کی مقررہ رقم سے پانچ ہزار روپے جو معیاری تصنیف نہ ہونے کی وجہ سے روک لئے گئے تھے۔ وہ ڈاکٹر ممتاز حسن، سید حسام الدین راشدی، ڈاکٹر عبدالغفور اور ڈاکٹر شوکت سبزواری پر مشتمل منصفین کی ایک کمیٹی کی سفارش پر مندرجہ ذیل تصانیف پر پیش کئے گئے۔

ہندوستان پس منظر، پیش منظر	سید محمد تقی	تاریخ و تحقیق	اردو	دو ہزار روپے
تزک جہانگیری	اعجاز الحق قدوسی	ترجمہ اور مقدمہ	اردو	دو ہزار روپے
پنجاب رنگ	شفیع عقیل	تحقیق و تدوین	اردو	ایک ہزار روپے

آدم جی انعام

۱۹۶۰ء

کوبیدا	بنگلہ	ڈراما	پیرس رسنا
حاتم النین	=	نظم	روشن یزدانی
جاڑے کی چاندنی	افسانہ	اردو	غلام عباس
خدا کی بستی	ناول	=	شوکت صدیقی

۱۹۶۱ء

اُتم بروش	ناول	بنگلہ	رشید کریم
کنھیا کماری	=	=	عبدالرزاق
تلاش بہاراں	=	اردو	جمیلہ ہاشمی
خوش حال و اقبال	تنقید	=	میر عبدالصمد

۱۹۶۲ء

بنگلہ ساہتیہ سلم شادھنا	تنقید	بنگلہ	قاضی عبدالمنان
کرتا داشیر ہاشی	ناول	=	شوکت عثمان
ہفت کشور	نظم		جعفر طاہر
آنگن	ناول		خدیجہ مستور

۱۹۶۳ء

روڈرا کروٹی تے	بنگلہ	نظم	شمس الرحمان	پانچ ہزار روپے
سارنگ بئو	=	ناول	شہید اللہ قیصر	=
دشتِ وفا	اردو	نظم	احمد ندیم قاسمی	=
اداس نسلیں	=	ناول	عبداللہ حسین	=

۱۹۶۴ء

۱۹۶۵ء

آبلہ پا	رضیہ فصیح احمد	ناول	اردو	پانچ ہزار
فارقلیط	عبدالعزیز خالد	شاعری	=	ڈھائی ہزار
مطربہ	قتیل شفائی	=	=	=

۱۹۶۸ء

اردو

غزال وغزل	سراج الدین ظفر	اردو	شعری مجموعہ	پانچ ہزار
کھویا ہوا افق	محمد خالد اختر	اردو	ناول	پانچ ہزار

بنگلہ

انیتم شاسیر سوتو (ہلاکت خیز تیر کی مانند)	حسن حفیظ الرحمٰن	بنگلہ	دو شعری مجموعے	پانچ ہزار
انتا شادوادی (دل شکستہ الفاظ)				
انجادکروبی گاچھ (زہریلے درخت کی بیٹی)	حسن عزیز الحق	=	افسانے	پانچ ہزار

۱۹۶۹ء

۱۹۷۱ء

خاکم بدہن	مشتاق احمد یوسفی	اردو	طنز و مزاح	دس ہزار روپے

داؤد ادبی انعام

۱۹۶۵ء

پاکستانی کلچر	جمیل جالبی	اردو	علمی	پانچ ہزار روپے
تحقیق کی روشنی میں	عندلیب شادانی	=	=	=
تاج محل	عبداللہ چغتائی	=	=	ڈھائی ہزار روپے
افریقہ۔ ایک چیلنج	عبداللہ احمدوی	=	=	=

۱۹۶۸ء

انگریزی

سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف بنگال	ڈاکٹر ایم۔ اے رحیم	تاریخ	پانچ ہزار

اردو

اقبال۔ شاعر اور فلسفی	پروفیسر وقار عظیم	تنقید	ڈھائی ہزار
خاور نامہ	چاند حسین شیخ	تحقیق و تدوین	ڈھائی ہزار
ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق	ڈاکٹر مہر عبدالحق	تحقیق	ڈھائی ہزار
ترکی اردو ڈکشنری	ڈاکٹر محمد صابر	تحقیق و تدوین	ڈھائی ہزار

بنگلہ:

علاول کی پدماوتی کا مطالعہ	سید علی احسن	تنقید	پانچ ہزار
ساہتہ اینۃ طلبہ بودھ (ادب روایت اور اقدار)	عبدالحق	تنقید	پانچ ہزار

حبیب بینک ادبی انعام

۱۹۷۱ء

انگریزی

لائف آف اے سیلو (کرتا واشر ہاشی۔ شوکت عثمان کا بنگالی ڈرامہ (ترجمہ کبیر چودھری) پانچ ہزار

اردو

کلاسیکی کتب اور عصرِ حاضر کی تصانیف کے اردو تراجم کے مخصوص حبیب بینک ادبی انعام کی مستحق کتابیں نہ مل سکیں۔

منصفین

ڈاکٹر اجیت کمار گوہا، احسن احمد اشک، مرزا ادیب اور صفدر میر

نوٹ:

اردو میں ٦، تمبر ادبی انعام کے لئے کسی تصنیف کو انعام کا مستحق قرار نہیں دیا گیا۔

بنگلہ تصانیف کے بعض ادبی انعامات کا فیصلہ موجودہ سیاسی حالات کے باعث ہنوز نہیں ہو سکا۔

یونائیٹڈ بینک ادبی انعام

۱۹۷۱ء

اردو

ٹوٹ بٹوٹ	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	اردو	(نظم)	۵ ہزار روپے

نیشنل بینک ادبی انعام

۱۹٦۵ء

:۱	اقتصادی منصوبہ بندی کا ایک لائحہ عمل	ڈاکٹر محبوب الحق	انگریزی (معاشیات)	۵ ہزار روپے
:۲	برق و مقناطیس	پروفیسر حمید عسکری	اردو سائنس	ڈھائی ہزار روپے
:۳	حیوانی نمونے	حفیظ الرحمٰن	اردو سائنس	ڈھائی ہزار روپے

:۱	مدیہہ بک پدارتکا	پروفیسر عبدالقاسم	بنگلہ	ڈھائی ہزار روپے
:۲	چین، مینا، دوکل، کوئل	ڈاکٹر اے کے ایم امین الحق	بنگلہ	ڈھائی ہزار روپے
:۱	جنا، شنکیا ئے شمپت	ڈاکٹر محمد مرتضےٰ ڈھاکہ یونیورسٹی	بنگلہ معاشیات	۵ ہزار روپے

۱۹۷۱ء

اردو:-

فنجائی اور مشابہہ پودے	محمد اشرف	اردو (نباتیات)	پانچ ہزار روپے
فولاد پر عملِ حرارت	سید شمیم رجز	طبعیات	پانچ ہزار روپے
اسلامی معاشیات نظریہ اور عمل ۔	ایم اے منان	تحقیق و تدوین	پانچ ہزار روپے

اخبارات کے حوالے سے گلڈ اور ادبی انعامات

گلڈ کے دوسرے سالانہ جلسہ کے موقع پر صدر پاکستان نے ادیبوں کو ایک پیغام دیتے ہوئے آزادی رائے کے حقوق کے تحفظ کا ذکر کیا ہے۔ آزادی رائے کے تحفظ کا یہ وعدہ بڑا خوش آئند وعدہ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس وعدہ کا برابر احترام باقی رکھا جائے گا۔ دراصل آزادی رائے کا اصول مہذب زندگی اور شریف معاشرہ کی ایک ایسی اساس ہے کہ اس حق کی ضمانت بغیر کسی سماج کی ترقی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا خاص طور پر ادب تو کسی ایسے ماحول میں ترقی کر ہی نہیں سکتا جس میں آزادی رائے کے اساسی اصولوں کی ضمانت موجود نہ ہو۔ آزادی رائے اور آزادی اظہار خیال جو عوامی زندگی کی خرابیوں اور معاشرے کے مظلوم طبقوں کی مشکلات کے اظہار سے متعلق ہو، ایک ایسا بنیادی حق ہے جس کو تسلیم کئے بغیر سماج کے ارتقاء کا کوئی تصور قائم نہیں ہوسکتا۔ صدر نے ادیبوں کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستانی زندگی کی حقیقتوں کو بین الاقوامی نظریاتی خیال آفریبوں کے مقابل زیادہ اہمیت دیں اور صدر کے اس خیال سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ یہ بات واقعی بڑی عجیب اور مضحکہ خیز ہوگی کہ ادھر تو پاکستان کے عوامی مسئلے ادیبوں کی توجہ کے متقاضی ہوں اور ادھر ادیبوں کی دنیا گیر خیال آرائیاں ہوں جن کا پاکستان کی سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اگر یہ صورتحال موجود ہو تو پھر ادیب اس فرض کو انجام نہیں دے سکیں گے جس کی سماج ان سے توقع رکھتا ہے بلکہ صحیح معنی میں ادیب خود ادیب کہلانے کا حق بھی کھو بیٹھیں گے۔

ادب سماج سے چلتا ہے اور اگر ادیب سماج کے حقوق اور فرائض ہی کو بھلا بیٹھیں اور اپنی غیر حقیقی خیال آرائیوں میں مگن رہیں تو وہ سنگی قلم کار تو کہلا سکتے ہیں ذمہ دار اور باشعور ادیب کہلانے کا حق لازماً حاصل نہیں کر سکتے۔

اپنے وقت میں آدم جی ادبی انعام ایشیا کا سب سے بڑا ادبی انعام جو گلڈ کی ذاتی کوششوں سے جاری ہوا اور خانوادہ آدم جی کی طرف سے اُردو اور بنگلہ کی اعلیٰ ترین طبعزاد تخلیقی تصنیفات پر ہر سال پیش کیا جاتا ہے پردوز بانوں کیلئے دس دس ہزار روپے کی رقم مخصوص کی جاتی تھی۔

تیسری سالگرہ سے گلڈ نے ایک انگریزی سہ ماہی پرچے کی اشاعت کا آغاز بھی کیا اسکا نام "لٹریری پاکستان" تھا۔

گلڈ نے بیرونی ملکوں کے ادبی، ثقافتی اور اشاعت اداروں سے بھی اپنے روابط استوار کرلئے اقوام متحدہ میں بھی اسکا ایک مستقل نمائندہ موجود تھا مختلف ملکوں کی اہم تقریبات میں حصہ لینے کیلئے گلڈ کے نمائندے وخود بھی جاتے تھے جگہ جگہ گلڈ ہاؤس قائم ہوئے اسکی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر مخیّر حضرات نے بھی دست تعاون دراز کردیا کراچی سے گلڈ کا اردو ماہنامہ "ہم قلم" شائع ہوا۔

۶۲-۲-۱ جنگ کراچی:

صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر جو ڈھاکہ میں ۳۱ جنوری کو ہوئی ایک پیغام میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انتہائی طاقتور آلہ یعنی دماغ بخشا ہے اس آزادانہ اور مکمل طور پر کام لینے میں کوئی

خطرہ نہیں اگر کوئی زبان یا قلم اس کے دل ودماغ کا ساتھ نہ دے تو وہ خرابی کا باعث ہوتا ہے صدر نے کہا کہ میں اس سالگرہ کے موقع پر پُر جوش مبارکباد دیتا ہوں صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر جس کی تقریب ۳۱ جنوری کو ڈھاکہ میں منائی گئی گلڈ کو ایک پیغام ارسال کیا پیغام کا متن حسب ذیل تھا۔ "میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر جس کی تقریب ڈھاکہ میں ۳۱ جنوری ۶۲ء کو منائی جارہی ہے پُر جوش مبارکباد دیتا ہوں گلڈ سے میرا تعلق بھی تین سال پرانا ہے اور مسرت ہے کہ میں نے گلڈ کے قیام کے بعد اس کے پہلے اجتماع میں شرکت کی اور اس وقت میں نے آپکی ترقیوں کا دلچسپی سے مطالعہ کیا آپکی پہلی سالگرہ کے موقع پر میں نے پیغام میں خیال ظاہر کیا اور رائے کی مکمل آزادی کا آپ کو یقین دلایا تھا۔ درحقیقت اس قسم کی یقین دہانی کی ضرورت تو نہ تھی کیونکہ میں خود اس حد تک آزاد تحقیق کا پُر جوش حامی ہوں جو بعض اوقات خطرناک نظر آسکتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ انسان کو اللہ تعالی نے جو انتہائی طاقت ور آلہ بخشا ہے یعنی اس کا دماغ اس سے آزادانہ اور مکمل طور پر کام لینے میں کوئی خطرہ نہیں ہے خرابی صرف اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب زبان یا قلم کسی شخص کے دل ودماغ کا ساتھ نہ دے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مشرقی اور مغربی پاکستان میں اپنے ذاتی چھاپے خانے قائم کرنا چاہتے ہیں یہ ایک اچھا خیال ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد اس قابل ہوجائیں گے کہ آپ کے ادارے اور پروگراموں کے لئے یہ ایک مستقل ذریعہ آمدنی بن جائے گا تاہم میری یہ تجویز ہے کہ آپ کا چھاپہ خانہ کثیر تعداد میں قارئین کیلئے جن میں ناخواندہ خصوصاً بچے شامل ہیں ارزاں قیمت پر کتابیں وغیرہ شائع کرنے کا کام بھی انجام دے جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس منصوبے کیلئے آپ کو ہر ممکن امداد کا یقین دلاتا ہوں اس وقت جب گلڈ اندرون ملک مستحکم بنیاد پر قائم ہوچکی ہے اور غیر ممالک سے اچھی طرح وابستگی ہے ان حالات میں آپ کو نہ صرف اپنی برادری کی بھلائی کیلئے جامع منصوبے تیار کرنے میں بلکہ ہم وطنوں کیلئے جو مستقل اور جامع پروگرام وضع کرنے چاہئیں۔ جس انداز میں آپ نے خود کو منظم کیا ہے اس میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور میری خواہش اور دعا ہے کہ گلڈ مستحکم سے مستحکم تر ہو۔

جنگ۔ لاہور ۳۱، جنوری ۱۹۶۳ء

مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس سجاد احمد جان نے ادیبوں اور مصنفوں سے کہا ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کریں جو لوگوں میں جذبہ حب الوطنی اور قومی تہذیب وثقافت سے محبت پیدا کرسکے۔ مسٹر جسٹس سجاد احمد جان پاکستان رائٹرز گلڈ کی چوتھی سالگرہ کی تقریب کی صدارت کررہے تھے اس تقریب میں وزارت اطلاعات کے سیکریٹری مسٹر قدرت اللہ شہاب نے بھی تقریر کی جو مرکزی رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری ہیں مسٹر سجاد احمد جان نے کہا کہ ملک میں ادبی تصنیفات میں اضافہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ صنعت کار اور مخیر حضرات آگے آئیں اور اہل قلم کی سرپرستی کریں انہوں نے کہا ادیبوں کو اپنے پیچھے ایسا ادبی سرمایہ چھوڑنا چاہئے جس پر آئندہ نسلیں فخر کرسکیں۔

۲-۲-۱۹۶۴ فروری جنگ کراچی

ادیبوں نے جنگ کے دوران قابلِ قدر خدمات انجام دیں اپنی تحریروں سے حصول مقاصد کیلئے عوام میں جدو جہد کا جذبہ جوان رکھا ادیبوں کوصدر ایوب کا مشورہ۔تقریب میں مسٹر جسٹس انعام اللہ خان چیف پارلمانی سیکریٹری الحاج عبداللہ ظہیرالدین، جناب فیض احمد فیض نیشنل بینک کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر ممتاز حسن اور گلڈ کے قائم مقام سیکریٹری جنرل مسٹر جمیل الدین عالی نے تقریریں کیں۔

عالی نے اپنے سپاسنامہ میں صدر ایوب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ کئی سالوں میں انہوں نے علم وادب اور اس کے خدمت گزاروں سے جس گہری ہمدردی اور شفقت کا اظہار کیا ہے اگر اس مثال کی پیروی دوسرے بھی کرنے لگیں تو گلڈ کو اپنے پروگرام کی عملی جامعہ پہنانے میں کوئی وقت نہ لگے۔انہوں نے ادیبوں کیلئے زیادہ توجہ امداد کی ضرورت پر زور دیا اور گلڈ کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالی۔نیشنل بینک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر ممتاز حسن نے کہا ہے کہ گلڈ کو بچوں کی کتابوں کیلئے مخصوص انعام مقرر کرنا چاہئے انہوں نے بچوں کیلئے معیاری کتب کے فراہم نہ ہونے پر افسوس کیا اور کہا کہ علمی اداروں اور حکام کی ایک اعلیٰ کمیٹی کو اس مسئلہ کا جائزہ لینا چاہئے۔بچوں کیلئے کتب کی قیمت کم سے کم ہونی چاہئے تا کہ غریب بھی خرید سکیں۔

۲-۲-۱۹۶۸ فروری جنگ کراچی

صدر ایوب خان نے ادیبوں اور مصنفین کیلئے جو کچھ کیا ہے وہ پہلے کسی نے نہیں کیا (ممتاز حسن)

احمد ندیم قاسمی نے ۶ ستمبر کے ادبی انعام کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ دراصل یہ انعام جارحیت کے خلاف قوم کی مدافعت اور اپنے وجود کا دفاع اور یہاں کے امن کو بچانے کے ایک یادگار اقدام کا انعام ہے انہوں نے کہا کہ اس کو ادبی انعام میں شامل کر کے پاکستان رائٹرز گلڈ نے اس قومی تاریخ کے اہم واقعہ کو ادب کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

جمیل الدین عالی سیکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ نے مہمانِ خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے مسٹر جسٹس ایس اے رحمان کی علمی اور ادبی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔اُنھوں نے کہا کہ دُنیا کے کسی بھی ملک میں ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں اور ہم پاکستانیوں کو اس پر فخر ہونا چاہئے کہ مسٹر جسٹس ایس اے رحمان ہم میں سے ایک ہیں اور وہ ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔انہوں نے کہا کہ ادارہ مصنفین پاکستان مختلف سمتوں میں جو کام کر رہا ہے اس کا اجمالی خاکہ بھی اس کم وقت میں پیش نہیں کیا جا سکتا جو لوگ ہمارے ادارے میں دلچسپی رکھتے ہیں اگر وہ وقتاً فوقتاً ہمارے منصوبوں اور کاموں پر نظر رکھیں تو ہماری پالیسی ان پر آشکار ہوتی رہے گی۔انہوں نے ۶ ستمبر ادبی انعام کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے مرکزی انتخابات کے نتائج اور مرکزی اجماعات ہماری ان زریں کامیابیوں کی جھلک دکھاتے ہیں جو ہم نے قومی یکجہتی کے میدان میں حاصل کی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر انعام الحق جیسے نامور حضرات کی سربراہی میں افروایشیائی امور سے متعلق گلڈ کی رابطہ کمیٹی کا قیام ظاہر کرتا ہے کہ ہم افروایشیائی اتحاد واستحکام کیلئے کتنے کوشاں ہیں۔ انہوں نے انجمن کے سالانہ گرانٹ کا بھی ذکر کیا۔
انہوں نے حبیب بینک لمیٹڈ کے ادبی انعام کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری درخواست پر ۲۵ ہزار روپے سالانہ کا انعام قائم کیا گیا ہے یہ انعام جارحیت کے خلاف قوم کی مدافعت اور اپنے وجود کا دفاع اور یہاں کے امن کو بچانے کے ایک یادگار اقدام کا انعام ہے انہوں نے کہا کہ اس کو ادبی انعام میں شامل کر کے پاکستان رائٹرز گلڈ نے اس قومی تاریخ کے اہم واقعہ کو ادب کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔
۶۹-۲-۳ روزنامہ جنگ کراچی

گلڈ کی سالانہ تقریب ملتوی کردی گئی۔

کراچی یکم فروری پاکستان گلڈ نے اعلان کیا ہے کہ کراچی کے حالات کے پیش نظر رائٹرز گلڈ نے اپنی سالگرہ کی تقریب منسوخ کردی اور ساتھ ادبی انعامات کا اعلان بھی فی الوقت ملتوی کر دیا ہے۔ اس وقت صدر ایوب کے خلاف تحریک زور پکڑ رہی تھی اور پورے شہر میں کرفیو نافذ تھا)
۷۰-۲-۲ روزنامہ مشرق کراچی

پاکستان سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن ۳۱، جنوری ۱۹۷۰ء کو ایک مقامی ہوٹل میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی گیارہویں سالگرہ کے موقع پر تقسیم انعامات کی ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ قومی زندگی میں ادیب پر بڑی اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس بات کا دارومدار صرف ادیب پر ہے کہ وہ کس طرح اپنے قارئین کے خیالات کو نکھار کر انہیں جذباتی طور پر قومی تعمیروترقی کیلئے تیار کرے۔ اس اجلاس سے جناب ممتاز حسن اور مشرقی پاکستان کے جناب احسن احمد اشک نے بھی خطاب کیا گلڈ کے سیکریٹری جنرل جمیل الدین عالی نے مہمان خصوصی کو سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ گلڈ اب تک ادیبوں کو پانچ لاکھ روپئے سے زیادہ کے انعامات دے چکا ہے اس سال تیس ہزار روپے سالانہ انعامات کی ایک مستقل کمیٹی قائم ہوئی ہے جس پر سال رواں سے کاروائی شروع ہوئی۔ اس طرح گلڈ کے ذریعہ سالانہ پیش کشوں کی رقم تقریباً ایک لاکھ ۷۰ ہزار روپے ہو چکی ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ قومی ادارے اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دیں گے۔ جناب جمیل الدین عالی نے مطالبہ کیا کہ ادیبوں کی تحریروں پر پابندی لگانے کیلئے پڑھے لکھے ادیبوں اور ججوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے تاکہ وہ حقیقت پسندی سے تحریروں کا جائزہ لے کر کچھ فیصلہ کرسکیں۔

اے، آر وائی گولڈ انعامات۔ARY

گلڈ انعامات کے خاتمے کے بعد جمیل الدین عالی کے دل میں طویل عرصہ سے ادیبوں کے لیے کسی معقول رقم کے انعامات قائم کرنے کا خیال مچل رہا تھا۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ہمارے یہاں کے بیشتر ادیبوں کی تمام عمر تنگدستی، احساس محرومی اور ناقدری میں گذر جاتی ہے۔ لہذا ایسا تو ہو کہ کسی ادیب کی تمام عمر کی خدمات کے اعتراف میں اسے اتنی رقم کا انعام ضرور دیا جائے کہ جس سے کم از کم اس کے سر چھپانے کا ٹھکانہ ضرور میسر آسکے یا زوال عمر کے مسائل سے عہدہ براہونے کی غرض سے اس انعامی رقم کو استعمال کیا جاسکے۔

وہ ایسے انعام کی فکر میں تھے کہ ان کی نگاہ انتخاب حاجی یعقوب اور حاجی عبدالرزاق پر پڑی کہ جو دبئی میں ARY کے نام سے ایک بڑی کمپنی کے مالکان تھے۔ ARY کا صدر دفتر دبئی میں ہے تاہم اس کی متعدد شاخیں انگلینڈ، امریکہ اور متحدہ عرب امارات میں قائم ہیں۔ ARY کے مالکان سے عالی کی شناسائی اس وقت سے تھی جبکہ وہ حکومت پاکستان کے قائم کردہ فارن ایکسچینج بانڈ کی فروخت کے سلسلے میں نیشنل بینک کی طرف سے برطانیہ، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے دورے کیا کرتے تھے۔

سنہ ۲۰۰۰ء میں عالی نے دبئی کی ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے ARY کے مالکان سے شکوہ کیا کہ آپ لوگ کرکٹ، کھیل اور کھلاڑیوں کی سرپرستی کرنے میں تو خاصی شہرت رکھتے ہیں لیکن علم وادب کی طرف آپ کی توجہ قطعاً نہیں ہے۔ حاجی عبدالرزاق اور حاجی یعقوب نے عالی کے شکوے پر لبیک کہا اور طویل مذاکرات کے بعد ARY مبلغ دس ہزار امریکی ڈالر کا انعام قائم کرنے پر رضامند ہوگئی۔ یہ انعام پاکستان کے ان تخلیقی نثر نگاروں کے لیے قائم کیا گیا جنہوں نے ادب کے علاوہ ادیبوں کی بھی کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کی ہو۔

ARY انعام کا کنوینر سلیم کاشمیری کو مقرر کیا گیا جو ایک ہوائی کمپنی میں ملازم ہیں۔ دس ہزار امریکی ڈالر کا پہلا ARY انعام حمید کاشمیری کو ۲۰۰۰ء میں دیا گیا۔

۲۰۰۱ء میں انعام کا وقت آیا تو ARY کمپنی کے صدر عبدالرزاق یعقوب نے احباب سے کہا کہ عالی کی تمام عمر انعامات قائم کرنے اور تقسیم کرتے گزر گئی لیکن انہوں نے آج تک کوئی انعام قبول نہیں کیا۔ عبدالرزاق یعقوب نے ۲۰۰۱ء کے انعام کے لیے انعامی کمیٹی کا صدر روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر محمود شام کو مقرر کردیا۔ انہوں نے دیگر مصنفین کی مشترکہ رائے کے بعد جمیل الدین عالی کو مبلغ دس ہزار ڈالر کا انعام دینے کا اعلان کردیا۔ عالی نے ARY کے صدر کے

ایماء پر یہ انعام قبول کرلیا۔

اس کے بعد ARY کے فیصلے کی تعمیل میں عالی نے اس انعام کی کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ ۲۰۰۲ء کا انعام منصفین کے مشورے سے احمد ندیم قاسمی کو دیا گیا جو انہوں نے دبئی میں منعقدہ ایک بڑے عشائیے اور شاندار تقریب میں قبول کیا۔

۲۰۰۳ء میں جب ARY انعام کا موقعہ آیا تو عالی نے ایک بات کو بطورِ خاص نوٹ کیا کہ انعام دینے کے لیے ادیب کی عمر کم از کم ستر برس رکھنے کی شرط کی وجہ سے متعدد ایسے ادیب کہ جنہوں نے قابلِ ذکر ادبی خدمات انجام دیں انعام کے حقدار نہیں ہو پارہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلسل علالت کی وجہ سے ایسے ادباء باوجود استحقاق کے، انعام حاصل کرنے سے محروم رہیں اور راہی ملک عدم ہو جائیں۔ مثلاً شوکت صدیقی صاحب گردوں اور قلب کے عوارض کی وجہ سے بار بار اسپتال میں داخل کیے جارہے ہیں۔ لاہور میں بانو قدسیہ کی صحت بھی خطرناک مراحل میں ہے لہٰذا عالی نے دبئی جا کر حاجی یعقوب سے ملاقات کی اور کراچی میں ARY کے دو ڈائریکٹروں حاجی اقبال اور حاجی عبدالروف اور چیئرمین حاجی عبدالرزاق کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ ۲۰۰۳ء کا انعام تین سینئر ادیبوں کو بیک وقت دے دیا جائے۔ مجلس منصفین کے متفقہ فیصلے کے بعد ۲۰۰۳ء کے انعام کے لیے شوکت صدیقی، بانو قدسیہ اور انتظار حسین کے نام کا اعلان کردیا گیا۔ اور بوقت تحریر کراچی یا دبئی میں کسی وقت بھی وہ تقریباتی عشائیہ متوقع ہے جس میں ARY کی طرف سے دس ہزار امریکی ڈالر فی کس ان تینوں انعام یافتگان یا ان کے نمائندوں کو پیش کردیا جائے گا۔

اردو ادب کی تاریخ میں کسی بھی شعبے کے اردو ادباء کو بیک وقت پیش کیا جانے والا تیس ہزار امریکی ڈالر پر مشتمل یہ سب سے بڑا انعام ہے۔ ساتھ ہی عالی۔ نے معطیان کی رضامندی کے بعد انعام حاصل کرنے والے ادباء کی عمر میں تخفیف کر کے ۶۵ برس کردی ہے تاکہ مذکورہ عمر کے ادیب بھی اس انعام کے حقدار ہوسکیں۔

جمیل الدین عالی کی خواہش ہے کہ وہ اس انعام کا دائرہ وسیع کر کے اس میں شعراء محققین اور ناقدین کو بھی شامل کردیں لیکن انعام کی رقم دس ہزار امریکی ڈالر سے کم نہ ہو کیونکہ ARY کا یہ انعام پوری اردو دنیا کا سب سے بڑا نقد انعام ہے انہیں اپنے ارادوں میں ضرور کامیابی ہوگی کیونکہ وہ جس بات کے بابت غور و فکر کرتے ہیں اور کوئی منصوبہ بناتے ہیں اس پر اتنی تندہی اور لگن کے ساتھ کام کرتے ہیں کہ وہ ارادہ قوت سے فعل میں آجاتا ہے اور ایک جیتی جاگتی حقیقت بن جاتا ہے ان کی سابقہ کامیابیاں ان کے ارادوں کی تکمیل کے لیے بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہیں۔

حواشی وحوالے

(۱) حرفے چند سوم جمیل الدین عالی ص ۱۷۸

ضمیمہ

حرفے چند کی وضاحتی فہرست

اسٹوڈنٹ اسٹینڈرڈ اردو انگریزی ڈکشنری ساتویں اشاعت ۱۹۶۳ء بابائے اردو مولوی عبدالحق

چھٹا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں چھپا تھا۔ اس کی قیمت سولہ روپے تھی۔ اس نسخے کی قیمت پندرہ روپے ہے۔ ساتویں اشاعت کی قیمت کم رکھنے کے لئے کچھ اچھے کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور کچھ عام کاغذ پر۔ انجمن کی کوشش ہے کہ ہر دو تین سال کے بعد ایک لغت چھاپی جائے کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری ڈکشنریاں بھی تغیرات سے ہم آہنگ رہ سکیں۔

اس اشاعت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولوی عبدالحق (مرحوم) کا ایک مختصر سا پیش لفظ شامل ہے جو لغت کے مستند ہونے کی دلیل ہے اور اس کے لیے تبرک کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

سودا:

مقالہ تحقیق شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ ۱۹۶۳ء

از شیخ چاند (مرحوم) ایم اے ایل ایل بی (عثمانیہ) پہلا ایڈیشن جس میں مرزا سودا (مرزا محمد رفیع سودا) کی حیات اور تصانیف اور کلام پر مفصل تحقیقی و تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب انجمن نے پہلی بار ۱۹۳۶ء میں چھاپی تھی اس میں سودا کے حالات زندگی کی دور اور خصوصیات کلام پر جامع بحث کی گئی ہے۔

چاند (مرحوم) مولوی عبدالحق کے ذہین طالب علم تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں ذہین طلبہ کو مصروف رکھنے کے لئے "مجلس تحقیقات علمیہ" کی جانب سے وظیفہ دیا جاتا تھا چاند (مرحوم) کو بھی وظیفہ ملا۔

یہ کتاب جب ۱۹۶۳ء میں جوں کی توں چھاپی گئی تو بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ اب انداز بدل گیا ہے۔ لیکن بزرگوں نے جو انداز اختیار کیا تھا اس کا احترام بذات خود ہمارے قومی ورثے میں شامل ہے۔

سب رس: (یعنی قصہ حسن و دل)

ملا وجہی مرتب ڈاکٹر مولوی عبدالحق معہ مقدمہ و فرہنگ

۱۹۳۲ء تک یہ کتاب صرف حوالے کی حد تک تھی۔ اسے مولوی عبدالحق نے دریافت کیا مقدمہ لکھا اور فرہنگ مرتب کی۔ انجمن کے صدر مقام اورنگ آباد (دکن) سے شائع کی۔

۱۹۵۳ء میں دوبارہ شائع کیا۔ ۱۹۶۴ء میں تیسری مرتبہ شائع کی گئی۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۷۷ء اور پانچواں ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ حرفے چند سب میں پہلا والا ہی چھپا ہے۔ اس لئے تیسرے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا گیا۔

خطبات عبدالحق

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے خطبات اور تقاریر کا مجموعہ

مرتبہ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی پہلا ایڈیشن

یہ خطبات ۱۹۴۴ء اور ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئے۔ اب مزید اضافے کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں انجمن ترقی اردو کے اشاعت گھر نے شائع کیا۔

تذکرہ اہلِ دہلی مصنفہ سرسید احمد خان مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (مرحوم) پہلا ایڈیشن

یہ چوتھا باب آثار الصنادید سے مولوی عبدالحق نے نکالدیا تھا۔ لیکن قاضی احمد صاحب نے اسے تلاش کرلیا دوبارہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف حصہ اوّل ڈاکٹر اسلم فرخی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

۱۹۶۳ء میں اس مقالے پر کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ۱۹۶۵ء میں انجمن نے اسے چھاپا۔ جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) جلد اوّل

مرتبین افسر صدیقی امروہوی سیّد سرفراز علی رضوی پہلا ایڈیشن

مولوی عبدالحق کی یہ خواہش تھی کہ انجمن کی کتب خانے کی مکمل فہرست تیار کی جائے لیکن یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہوسکا۔ یہ فہرست ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ تنظیم نو کے بعد یہ کام مکمل ہوا۔ اس کے بعد فارسی اور عربی مخطوطات کی فہرست شائع کرنے کا انجمن ترقی اردو ارادہ رکھتی ہے۔

پشتو شاعری:

مولفین فارغ بخاری رضا ہمدانی پہلا ایڈیشن ۱۹۶۶ء

بلوچی، پنجابی، پشتو، سندھی کو علاقائی زبانیں کہہ کر سرپرستانہ رویہ اختیار کرلینا ان ہی بزرگوں کو زیب دیتا ہے جو ادب کو کسی بین الاقوامی زبان ہی کی میراث سمجھتے ہوں۔ بڑا ادب ایسی زبان میں بھی پیدا ہوتا ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد بھی بڑی نہ ہو اور بڑی زبانیں بعض اوقات صدیوں تک بڑا ادب پیدا نہیں کرتیں۔ خود انگریزی بولنے والوں کی تعداد آج کے مقابلے میں تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کتاب کا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ پشتو نہیں جانتے ان کے لئے پشتو اب اردو میں منتقل ہوگیا۔

یہ حیثیت مجموعی یہ کتاب پشتو شاعری کا سیر حاصل احاطہ ہے

ہفت مقالہ (فارسی زبان و ادب) فارسی زبان و ادب پر مجلّہ اردو میں

شائع شدہ مضامین کا انتخاب مرتبہ سید حسام الدین راشدی پہلا ایڈیشن

۲۶، اکتوبر کو اعلیٰ حضرت شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کا جشنِ تاج پوشی منا رہے تھے۔ پاکستان اور ایران کی دوستی ہے۔ ایران کی خوش نودی کے لئے ان ہی کی زبان میں چند مندرجہ ذیل کتابیں شائع کی گئی ہیں۔

تذکرہ ہمیشہ بہار:

مولف کشن چند اخلاص۔ انہوں نے بارھویں صدی ہجری کی ابتداء میں معاصرین کے تین سو سے زیادہ شعراء کے حالات زندگی لکھے ہیں۔

تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار:

اسے نصر اللہ خان خویشگی نے ۱۸۵۳ء میں لکھا اور اس سال شائع ہوگیا۔ اب ڈاکٹر اسلم فرخی نے دوبارہ چھپوایا ہے۔ اس میں ضمنی طور پر فارسی شعراء کا تذکرہ بھی آ گیا۔

فارسی زبان وادب:

انجمن کے رسالے "اردو" میں چھپے ہوئے فارسی زبان وادب سے متعلق مقالات کو یک جا کیا ہے۔

فہرستِ مخطوطات فارسی، عربی مرتبہ سید حسام الدین راشدی انجمن کی طرف سے (۱۹۶۷ء) میں شائع کی گئی۔

انجمن کے کتب خانے میں فارسی اور عربی کا بڑا ذخرہ موجود ہے۔ جناب ممتاز حسن اور جناب پیر حسام الدین راشدی فارسی زبان کے ماہر تھے۔ ان ہی کی تحریک پر اختر حسین صاحب نے یہ کام کرایا۔

ادبیات سلطان باہو:

(منظوم ترجمہ) عبدالمجید بھٹی پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء۔ پنجابی سے اردو میں منظوم ترجمہ انجمن نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو اردو جلد دوم مرتبہ افسر صدیقی امروہوی ۱۹۶۸ء

پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء

یہ انجمن کے مخطوطات کی دوسری جلد ہے پہلی جلد ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی دوسرے جلد میں ۱۸۳ اپر وضاحتی مواد مرتب کیا گیا ہے۔

دی اسٹینڈرڈ ڈکشنری انگلش اردو مرتب بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء ۱۳۸۸ء

ننھے منّوں کے لئے ننھی منّی نظمیں خاطر غزنوی پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء نظموں کے ساتھ تصاویر بھی ہیں۔

"غالب ایک مطالعہ" ممتاز حسین پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انجمن نے کتابیں اور سہ ماہی "اردو" کا "غالب نمبر" اور ماہنامہ قومی زبان کا غالب نمبر بھی شائع کیا۔

ان ہی میں ایک کتاب "غالب ایک مطالعہ" ممتاز حسین کی بھی ہے۔

غالب نام آور:

سہ ماہی "اردو" کے مضامین کا انتخاب پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء "فلسفہ کلامِ غالب" ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۹۶۶ء

"مہر نیم روز" تصنیف مرزا اسد اللہ خان غالب

ترجمہ پروفیسر سید عبدالرشید فاضل صدر شعبہ فارسی اردو کالج کراچی

پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء

یہ کتاب بھی غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر شائع کی گئی۔

اس کتاب میں مغلیہ دور کے آخری بادشاہ نے خاندان تیمور کی ایک تاریخ لکھوائی تھی پہلا حصہ مہر نیم روز تھا۔ دوسرا حصہ "ماہ نیم روز" کے عنوان سے غالب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ چراغ پہلے ہی گل ہوگا۔ اس کی فارسی زبان بہت دقیق ہے۔

ہنگامہ دل آشوب (معرکۂ غالب کا احوال) مرتبہ سید قدرت نقوی پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ غالب کے شاگرد سید باقر علی باقر کے صاحب زادے نے سہ ماہی "اردو" میں چھپوایا۔ یہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

مقاماتِ ناصری:

میر ناصر علی کے مقالات کا انتخاب (جلد اول) مرتبہ سید انصار ناصری پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء

میر ناصر علی چھپن برس تک لکھتے رہے۔ بائیس برس "صلائے عام" جاری رہا۔ پڑھنے لکھنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے زندگی میں کوئی کتاب مرتب نہ کی۔ انصار ناصری ان کے پوتے تھے۔

The Popular English - Urdu Dictionary by Late

BABA-E-URDU Dr. Moulvi Abdul Haq

تیسری اشاعت ۱۹۷۰ء:

یہ ڈکشنری نئی نہیں ہے۔ بلکہ مولوی عبدالحق کی اسٹینڈرڈ انگریزی اور اردو ڈکشنری کا مختصر ایڈیشن ہے۔ جو پہلی بار ہندوستان میں اور دوسری بار ۱۹۵۷ء میں پاکستان میں چھپی۔

نوٹ:

اس ڈکشنری کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۷۶ء اور پانچواں ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکا تھا۔

پنجابی کے پانچ قدیم شاعر شفیع عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء

(۱) سید ہاشم شاہ (۲) شاہ حسین (۳) حامد شاہ عباسی (۴) خواجہ غلام فرید (۵) میاں محمد بخش کے بارے میں تفصیلی مضامین لکھے ہیں۔ ہر شاعر کے حالاتِ زندگی اور ادبی تحاریک کے بارے میں لکھا ہے۔

مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی پہلا ایڈیشن

یہ نسخہ دنیا میں صرف ایک ہی ہے

لغتِ کبیر (اردو) جلد اوّل مولف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء

شعرائے عصر کے کلام کا انتخاب جدید (حصہ اوّل) ۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۲ء مرتبین پروفیسر عزیز احمد، پروفیسر آل احمد سرور

پانچواں اشاعت:

اسٹوڈنٹ اسٹینڈرڈ انگریزی، اردو ڈکشنری دسویں اشاعت ۱۹۷۷ء

دیوان قاسم تصنیف شاہ قاسم اورنگ آباد معاصر شاہ سراج اورنگ آبادی

مرتب محمد سخاوت مرزا بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء قاسم اورنگ آبادی تقریباً دوسو سال پہلے کے اردو شاعر ہیں۔

قاموس الکتب اردو (جلد دوم) تاریخیات مرتبہ انجمن ترقی اردو پاکستان پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

تختوں پر معلومات جمع کی جاتی تھیں۔ مصنف کا نام موضوع تعداد صفحات سال اشاعت مطبع، ناشر، کتب خانے کا احوال جہاں وہ کتاب ہے۔ سلمان شاہجہاں پوری نے اس کا مسودہ تختوں پر سے لکھ کر دیا تھا۔ بعد میں محمد ایوب قادری صاحب نے قاموس الکتب کے مسودے نظر ثانی کی اور کتابت کی تصحیح ابوسلمان شاہجہاں پوری نے کی ہے۔

تلخیص معلّی ڈپٹی کلب خان نادر معہ ترتیب و حواشی ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر انصار اللہ نے کلب حسین خان نادر اور ان کے خاندان کے حالات خود تلاش کر کے لکھے ہیں۔

تنقیدی اصول اور نظریئے:

حامد اللہ افسر میرٹھی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء تنقید خود ہدف تنقید رہی ہے معنی بھی بدلتے رہے ہیں اور تکنیک بھی کہیں اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ، کہیں ان کے بغیر بھی۔

نیا دور پچھلے دور ہی سے جنم لیتا ہے۔

"بیاض مراثی"

گیارھویں بارھویں صدی ہجری کے مراثی کا مجموعہ مرتبہ صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء یہ بیاض انجمن کی ملکیت ہے۔ سن تحریر مستند نہیں بس ایک صفحے پر ۱۱۱۷ ہجری درج ہے۔ قدامت کے لحاظ سے یہ ساتویں نمبر پر ہے۔ اس کتاب میں دسویں، گیارھویں صدی ہجری کے مرثیہ نگاروں کے مرثیے بھی شامل ہیں۔

چینی لوک کہانیاں تہذیب و ترجمہ شفیع عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

انجمن دوسری زبانوں کے ادب پاروں کو ترجمہ کرا کر اردو میں اضافہ کر رہی ہے یہ بھی اس ہی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

تذکرہ عروس الاذکار ۱۲۸۹ھ ۱۹۷۵ء مصنف نصیرالدین نقش حیدرآبادی مرتب افسر صدیقی امروہوی۔ پہلا اڈیشن

یہ کتاب حیدرآباد دکن کے ان شعراء کے حالات پر مشتمل ہے جو مصنف کے زمانے میں موجود تھے۔ اس میں زیادہ تر حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی کے سلسلے کے شاعروں کا ذکر ہے۔ لیکن ایسے شعراء کا بھی ذکر ہے۔ جو دکن کے مستقل باشندے نہ تھے۔

" کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" تصنیف میر انشاء اللہ خان انشاء دہلوی۔ مرتبین ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا امتیاز علی خان عرشی سید قدرت نقوی پہلا اڈیشن ۱۹۷۵ء

کہانی رانی کیتکی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ خالص اردو زبان میں ہے۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۳ء میں چھپا تھا۔ پھر مولانا امتیاز علی خان عرشی رام پوری نے لائبریری رام پور کے دو مخطوطوں سے مقابلہ کر کے درست کیا۔ وہ تصیح شدہ نسخہ ۱۹۵۵ء میں چھپا۔

اردو تھیٹر جلد چہارم ڈاکٹر عبدالعلیم نامی پہلا اڈیشن ۱۹۷۵ء

پہلی تین جلدیں بھی انجمن سے چھاپی ہیں۔ اب چوتھی جلد میں ۱۸۸۶ء سے ۱۹۶۵ء تک اردو میں اسٹیج کرنے والی تھیٹریکل کمپنیوں کا تفصیلی تذکرہ بھی آ گیا ہے۔

نوٹ:

جلد دوم ۱۹۰۱ء سے ۱۹۶۵ء تک مختصر ہے
کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

فرہنگ اصلاحات پیشہ وراں جلد اوّل

پاک و ہند کے مختلف فنون اور صنعتوں کے اصلاحی الفاظ و محاورت کا جامع مجموعہ تالیف مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی پہلا اڈیشن ۱۹۷۵ء انجمن ترقی اردو نے آٹھ جلدیں ۱۹۳۹ء میں شائع کی تھیں جن میں مختلف پیشہ وروں اور پیشوں میں مستعمل اصلاحات جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب اس ہی کو ایک کاپی ہے۔ مرزا اسداللہ خان غالب گلِ رعنا معہ آشتی نامہ غالب مرتبہ سید قدرت نقوی صاحب پہلا اڈیشن ۱۹۷۵ء

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انجمن نے پانچ کتابیں سہ ماہی اردو اور قومی زبان کے خاص نمبر شائع کیے تھے۔ ان پانچ کتابوں میں ایک "ہنگامہ دل آشوب" تھی۔ جسے قدرت نقوی نے مرتب کیا تھا۔

سرسید احمد خان حالات و افکار از ڈاکٹر مولوی عبدالحق دوسری اشاعت ۱۹۷۵ء

مولوی عبدالحق سرسید کے مشن (اردو زبان کی ترویج و ترقی) کو پورا کرنے کی عمر بھی کوشش کرتے ہے یہ کتاب سولہ سال بعد دوبارہ چھپی ہے۔

"مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو" جلد سوم مرتبہ افسر صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء
انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہء خاص میں عربی فارسی اور اردو مخطوطات کا مفید ذخیرہ مفید ہے۔ جو حفاظت کے مدِ نظر پاکستان نیشنل میوزیم کو دے دیا گیا ہے۔

مقالات گارساں دتاسی جلد دوم

پروفیسر موصوف کے "ہندوستانی زبان" پر سالانہ لکچر ۱۸۷۴ء سے ۱۸۷۷ء تک بنظر ثانی

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس) پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

گارساں دتاسی کے خطبات رسالہ "اردو میں" ۱۹۲۳ء سے چھپ رہے ہیں۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ مقالات کی اشاعت دو جلدوں میں ۱۹۴۳ء میں عمل میں آئی نظر ثانی شدہ جلد اول ۱۹۶۴ء میں دوبارہ چھپی اب یہ دوسری جلد ۱۹۷۵ء میں چھپی ہے۔ یہ الگ کتاب ہے "اشاریہ اردو" سہ ماہی اردو کا مصنف و اشاریہ مرتبہ سید سرفراز علی رضوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء سہ ماہی جریدہ اردو کا پہلا شمارہ ۱۹۲۱ء میں اورنگ آباد دکن سے چھپا تھا۔ "اردو" ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۶ء تک اورنگ آباد دکن ہی میں رہا۔ ۱۹۳۶ء میں دلی آ گیا۔ اور ۱۹۴۷ء تک نکلا ۱۹۴۸ء مولوی صاحب کراچی آ گئے تھے۔ افراتفری کے عالم میں (انجمن کا المیہ میں تفصیل ہے) نامساعد حالات میں ۱۹۴۹ء میں دوبارہ جاری کیا۔ ۱۹۶۱ء تک جاری رہا۔ دوبارہ ۱۹۶۶ء میں جاری ہوا۔

"افکارِ حالی" مصنف بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء مولوی عبدالحق نے افکارِ حالی پر کئی مضامین تحریر کئے ان کو جمع کیا گیا ہے۔

اختر شیرانی اور جدید اردو ادب ڈاکٹر یونس حسنی (ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی) ۱۹۷۶ء پہلا ایڈیشن اس کتاب میں سات باب ہیں آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں اختر مرحوم کا وہ کلام جو ان کے دیوان میں شامل نہیں ہے۔ عام قاری انہیں رومانی شاعری کا شاعر ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے سلمیٰ تخلیق کی تھی۔ اور محبوب کے فرضی نام سے شاعری کی تھی۔

"تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" ڈاکٹر معین الدین عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء
یہ ایک مثبت اور سائینٹفکیٹ کوشش ہے جس کا مقام ہمارے تحقیقی اور قومی ادب میں نہایت بلند قرار دیا جائے گا۔

"مخطوطِ انجمن" جلد چہارم مرتبہ افسر صدیقی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء یہ تقریباً ساڑھے سات سو مخطوطات ہیں۔

"دانائے راز" اقبال

علامہ سر محمد اقبال کی زندگی ان کی شاعری اور فلسفے پر سیر حاصل محققانہ مضامین کا مجموعہ معہ ضمیمہ
(طبع جدید "اقبال نمبر" رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء مرتبہ مولوی عبدالحق زیرِ نظر اشاعت انجمن کے سہ ماہی جریدے "اردو" کا اقبال نمبر ہے پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

"لغت کبیر اردو" جلد دوم   حصہ اوّل الف مقصودہ

مولف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء

"شامِ غریباں "تذکرۂ شعرائے فارسی) کہ از ایران بہ ہند آمدہ بودند ۱۹۷۷ء مصنفہ لچھی نرائن شفیق مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی (استاد شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) پہلا ایڈیشن (انجمن) شعراء کی ترتیب اعداد جمیل پر رکھی مثلاً امیرؔ۔ اسیرؔ۔ بسملؔ۔ بیدلؔ تخلص کے لحاظ سے یہ کتاب دا سال کی عمر میں ۱۱۷۵ء میں ترتیب دی گئی تھی۔

افکارِ عالیہ   چون عظیم مغربی مفکرین سے استفادہ ۱۹۷۷ء

ترجمہ اور خلاصہ ڈاکٹر خان رشید مقدمہ جمیل الدین عالیؔ پہلا ایڈیشن انجمن کے منصوبوں میں اُمہات الکتب کے ترجمے شامل ہیں۔ آہستہ آہستہ اپنے وسائل کی محدودات میں کام کرر ہے ہیں مگر کام بہت ہے۔ سب کو کرنا چاہئے۔

انجمن کی اردو انگریزی لغت مرتبہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء انجمن کی اس اردو، انگریزی ڈکشنری کی بنیاد وہ قلمی مسودہ ہے۔ جو تقسیم ہند سے قبل دہلی میں بابائے اردو کی خاص نگرانی میں کارٹون کی شکل میں تیار ہونا شروع ہوا تھا اور ایک آہنی بکس کے اندر انجمن کے پاس محفوظ ہے۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد پنجم) مرتبہ افسر صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں اردو ادبی نظم ونثر کے مخطوطات ۸۰۰ ہیں جلد پنجم میں ۲۴۲ مخطوطات ہیں۔

مصطلحات علوم وفنون عربیہ از محی الدین غازی اجمیری پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء اردو زبان میں ان الفاظ اور مصلحات کی ایک ایسی خاص شرح آگئی جو پہلے صرف چند فارسی اور عربی داں طبقوں تک محدود تھی۔

"ماخذات، احوال شعراء ومشاہیر "جلد اوّل موئلفہ سرفراز علی رضوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء ماخذات کی یہ فہرست مکمل نہیں۔ کیونکہ اردو کا سرمایہ قدیم بہت بڑا ہے۔ اس لئے ایک جلد میں آنا مشکل ہے۔

عقدِ ثریا (تذکرہ فارسی گویا) تالیف غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء مصحفی کا تذکرہ شعرائے فارسی موسومہ عقدِ ثریا ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) سے شائع ہوا تھا۔ اس میں شعراء کے کلام کا نمونہ نہیں ہے۔

"نل دمن"   مصنفہ   احمد سراوئی۔   مرتبہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ   پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء

یہ مثنوی اس سے پہلے اورینٹل کالج لاہور کے میگزین میں شائع ہو چکی ہے۔

اقبال:

از مولوی احمد دین۔ مرتبہ مشفق خواجہ پہلا ایڈیشن ۱۹۹۷ء یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی کچھ تبدیلی کے بعد ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی ممتاز حسن اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان شائع کر رہی ہے۔

مولانا ظفر علی خان (بحیثیت شاعر) ۱۹۸۰ء

از نظیر حسنین زیدی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی پہلا ایڈیشن

ان کی شاعری تخلیق نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس کے ذریعہ زندگی کے حقائق پیش کرتے تھے۔

جاپانی لوک کہانیاں تہذیب و ترجمہ شفیع عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء انجمن ترقی اردو کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عالمی ادب کو اردو زبان میں منتقل کیا جائے۔

نساخ حیات و تصانیف "ڈاکٹر محمد صدرالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء مولوی عبدالغفور نساخ بنگالی تھے مگر اردو کے اہم ستون تھے۔

اردو تنقید کا ارتقاء۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

تیسری اشاعت ۱۹۸۰ء

جب کسی زبان کا ادب منزل ارتقاء کی جانب گامزن ہوتا ہے۔ تب ہی سے اس پر تنقیدی نظر بر پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔

"انتخابِ جدید" حصہ دوم مرتبین وزیر آغا، انور سدید، سجاد نقوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء

اس میں ابن انشاء کا منتخب کلام شامل تھا۔ جوان کی مرضی سے ہٹا دیا گیا اور عالی نے بھی اپنا کلام حذف کر دیا۔

"مضامین پریم چند" مرتبہ عتیق احمد پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء

پریم چند کو جدید افسانہ نویس اور ناول نگار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بہترین مضمون نگار تھے۔

"سہلٹ میں اردو" مصنفہ محمد عبدالجلیل بسمل پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء جنوبی ایشیا میں اردو وہ واحد زبان ہے جو برصغیر کے گوشے گوشے میں موجود ہے۔

مکاتب عبدالحق بنام محوی مرتبہ عبدالقوی دسنوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء سورج کی روشنی پر دوسرا سورج ہی گفتگو کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔

"مثنوی عاقبت بخیر" مصنفہ سید ساجد علی زنائی مرتبہ افسر صدیقی برطانوی حکومت کے آغاز نے اردو کو عوام کی زبان بنا دیا۔

تہافت الفلاسفہ مصنفہ امام ابو محمد غزالی مترجمہ پروفیسر ابوالقاسم محمد انصاری مقدمہ ڈاکٹر منظور احمد پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء

حضرت امام غزالی کی تصنیف تہافت الفلاسفہ امہا الکتب میں شامل ہے تجربی علوم کے سبب ایک لحاظ سے غیر ضروری لگتے ہیں۔ لیکن ان کی تاریخی اہمیت اب بھی مسلم ہے۔ بلکہ یہ مسلمہ اور بھی اجاگر ہوتا ہے۔ اگر اپنے زمانے میں وہ اجزا نہ لکھے جاتے۔ وہ مباحث سامنے نہ آتے تو رفتارِ فکر اس تیزی سے اپنے ارتقائی منازل طے نہ کرتی۔

The Standard, English, Urdu Dictionary Edited by the late Baba-e-Urdu Dr. Abdul Haq Thirc Edition 1988

اسٹینڈرڈ ڈکشنری A.D گیارھویں اشاعت ۱۹۸۲ء

"مخطوطات انجمن ترقی اردو" جلد ششم مرتبہ افسر صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء مختلف اداروں کے مخطوطات قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ اگر ادارہ چاہے تو بہتر قیمت دے کر خرید سکتا ہے۔ اور اگر حکومت وہ مخطوطہ خریدنا چاہے تو بہتر قیمت دے کر خرید سکتا ہے اور اگر حکومت وہ خطوط خریدنا چاہے اور مالک نہ بیچنا چاہے تو حکومت قانوناً بھی لے سکتی ہے پہلی اشاعت ہے۔

"مشاہیر یونان وروما"

(حکیم پلوتارک کی یونانی کی کتاب "السیر" کا اردو ترجمہ) جلد اوّل

مترجم مولوی سید ہاشمی فرید آبادی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء

مولوی عبدالحق نے فرمایا کہ اس کتاب نے مشاہیر عالم پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

"دیوان تراب" مرتبہ (معہ مقدمہ مروفرہنگ) ڈاکٹر سلطانہ بخش پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء (ایم اے پی ایچ ڈی) اصل مخطوطہ ڈھائی سو برس پرانی زبان اور قدیم خط میں ہے اسے پڑھنا۔ تدوین کرنا بڑا کارنامہ ہے۔ اس وقت اسکے پانچسو اسی صفحات ہیں۔

بارھویں صدی ہجری کے نامور صوفی شاعر شاہ تراب علی تراب بیجاپوری کے واحد نادر مخطوطات یہ پہلی اشاعت "دیوان" تراب ہے۔

"مثنوی نوسر بہار" مصنفہ شاہ اشرف الدین بیابانی ۹۰۹ء

مرتبہ افسر صدیقی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء

گذشتہ زمانے میں اردو کی تصانیف کو محفوظ کرنا۔ انجمن کا مقصد ہے۔

"حدیقۃ المرام" (علمائے مدارس) مصنفہ محمد مہدی واصف مدراسی سن تصنیف ۱۲۷۰ھ مترجم سخاوت مرزا (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی عثمانیہ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء حدیقۃ الحرام ان اہل علم وفضل وکرم کا تذکرہ ہے جو مدارس اور اس کے قرب وجوار میں گزرے ہیں۔

اردو فکشن بنیادی وتشکیلی عناصر (ایک تاریخی جائزہ) مصنفہ اختر انصاری دراصل یہ ایک مقالہ ہے جو کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ تیسرا بابائے اردو یادگاری لیکچر ۲ فروری ۱۹۸۳ء "جمالیات اور اردو ادب" از ڈاکٹر ریاض الحسن پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء یہ مقالہ بابائے اردو توسیعی خطبات کے سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔

"رسالہ شگن" موسوم بہ لولوئے از غیب ۱۱۰۳ھ مصنفہ شیر لال مرتبہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء یہ مخطوطہ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم نے انجمن کو دیا تھا۔

مفکرین اسلام مصنفہ مولانا عبداللہ قدسی پیش لفظ جمیلہ خاتون پہلا ایڈیشن الگ کتب میں سنگھاسن بتیسی مصنفہ فقیر دکنی مرتبہ افسر صدیقی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء پہلے سہ ماہی رسالے اردو میں قسط وار چھپی تھی۔ اب کتابی صورت میں سامنے ہے الگ کتب میں

"قہرِ عشق" ولیم شیکسپیر کے شہرۂ آفاق ڈرامے انطنی کلوپیطرہ کا منظوم ترجمہ بصورت تمثیل بصورت ادبیات شان الحق حقی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء اس کے چیدہ چیدہ حصے دوسرے رسائل میں چھپتے رہے ہیں لیکن پورا منظوم ترجمہ انجمن نے شائع کیا ہے۔

English, Urdu, Pocket Dictionary Reduced from the revised and enlarged edition of the popular English, Urdu Dictionary by Late Baba-e-Urdu Dr. Moulvi Abdul Haq۔ چوتھی اشاعت

اسکا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۱ء (پانچ ہزار) دوسرا ایڈیشن (دس ہزار) تیسری اشاعت ۱۹۷۸ء یہ ڈکشنری دراصل اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری کا اختصار ہے۔

The Standard English-Urdu Dictionary Eedited by the Late Baba-e-Urdu Dr. Abdul Haq Fourth Edition 1985 A.D. 14006 Hijra

تعداد دس ہزار ہے۔ جن میں سے سات ہزار جلدیں حکومت پنجاب نیشنل بک فاؤنڈیشن آف پاکستان کے زیر اہتمام خرید رہی ہے۔ پاکستان بھر میں یہ ہی انگریزی۔ اردو لغت مستند ہے۔

Anjuman's Urdu - English Dictionary

انجمن کی اردو- انگریزی لغت (تیسرا ایڈیشن مرتبہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۹۸۵ء پہلا ایڈیشن بابائے اردو کے انتقال کے سولہ سال بعد ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۰ء

The Student's Standard English - Urdu Dictionary by Baba-e-Urdu Dr. Moulvi Abdul Haq

(اسلوبیات میر)

(بابائے اردو مولوی عبدالحق یادگاری خطبہ ۱۹۸۴ء)

پروفیسر گوپی چند نارنگ

۱۹۸۱ء میں بابائے اردو یادگاری خطبے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اب ہر سال یہ خطبہ لازمی ہے اور ان کو خصوصی شمارے کے طور پر چھاپ دیا جاتا ہے۔

اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک)

ڈاکٹر انور سدید پہلا ایڈیشن

یہ کتاب ڈاکٹر انور سدید کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے اس پر پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی۔

"غزل نما" ادا جعفری پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء

بزرگوں کے کلام کا انتخاب اور حالات درج ہیں

"پاکستان میں اردو تحقیق موضوعات اور معیار" ڈاکٹر معین الدین عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء

اردو تحقیق سے متعلق پہلا جائزہ ہے۔

قواعد صرف ونحو زبان اردو ۱۹۴۰ء/۱۲۵۶ء مصنفہ سرسید احمد خاں مرتبہ عبدالغفار شکیل (علیگ) پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء

پہلے سہ ماہی جریدے "اردو" جلد ۵۹ شمارہ ۸۲-۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔

پاکستان کی کہانی (بچوں کے لئے) مصنفہ بیگم سلمیٰ زمن پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء انجمن نے بچوں کے لئے بہت کم کتابیں چھاپی ہیں۔

"سودا"

یہ کتاب انجمن نے پہلی بار ۱۹۳۶ء میں چھاپی تھی۔ اس کتاب میں سودا حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر جامع بحث کی گئی ہے۔ چاند شیخ مرحوم مولوی عبدالحق کے ذہن طالب علم تھے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں جوں کی توں چھاپ دی گئی۔

سب رس (یعنی قصہ حسن ودل ملا وجہی مرتب ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مع مقدمہ وفرہنگ) اس کتاب کو دریافت کیا۔ مقدمہ لکھا فرہنگ تیار کی اور انجمن (اورنگ آباد، حیدرآباد) سے شائع کیا۔ ۱۹۵۳ء میں دوبارہ شائع کی گئی۔

خطبات عبدالحق۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کے خطبات اور تقاریر کا مجموعہ

مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ایم اے پی ایچ ڈی پہلا ایڈیشن

یہ خطبات ۱۹۴۴ء دوبارہ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئے۔ اب مزید اضافے کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں انجمن ترقی اردو کے اشاعت گھر نے شائع کیا۔

تذکرہ اہل دہلی مصنفہ سرسید احمد خان مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھ مرحوم

یہ چوتھا باب آثارالصنادید سے ناشرین نے نکال دیا تھا لیکن قاضی احمد صاحب نے اسے پہلا ایڈیشن تلاش کر لیا۔ دوبارہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف (حصہ اول) حیات ڈاکٹر اسلم فرخی پی ایچ ڈی ۱۹۶۱ء میں اس مقالے پر کراچی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ۱۹۶۵ء میں انجمن نے اسے چھاپا جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) جلد اول

مرتبین افسر صدیقی امروہوی سید سرفراز علی رضوی پہلا ایڈیشن

مولوی عبدالحق کی یہ خواہش تھی کہ انجمن کے کتب خانے کی مکمل فہرست تیار کی جائے۔ لیکن یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہو سکا۔ یہ ۱۹۶۵ء میں تنظیم نو کے بعد یہ کام مکمل ہوا۔ اسکے بعد فارسی اور عربی مخطوطات کی فہرست بھی شائع کر دی جائے۔

ان ہی میں ایک کتاب "غالب ایک مطالعہ" ممتاز حسین کی بھی ہے۔ غالب نام آور سہ ماہی اُردو کے مضامین کا انتخاب پہلا ایڈیشن ۱۹۶۹ء

فلسفہ کلام غالب:

ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۹۶۶ء یہ کتاب پہلے ۱۹۴۶ء میں پہلی مرتبہ چھپی تھی

موج موج مہران: مترجم الیاس عشقی مرتب مراد علی مرزا پہلا ایڈیشن

اس کتاب میں پچیس سندھی شعراء کے کلام کا منظوم ترجمہ اردو میں ہے اردو زبان کی پہلی تصنیف مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مصنفہ فخر الدین نظامی ۱۹۶۱ء

جو (۱۴۲۱ء/۸۲۵ ہجری اور ۱۴۳۵ء/۸۳۹ھ کے درمیان لکھی گئی) مرتبہ ڈاکٹر جمیل الدین جالبی (پہلا ایڈیشن)

یہ نسخہ دنیا میں صرف ایک ہی ہے۔

لغت کبیر (اردو) جلد اوّل موئف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء

شعرائے عصر کے کلام کا انتخاب جدید (حصہ اوّل) ۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۷ء مرتبین پروفیسر عزیز احمد، پروفیسر آل احمد سرور

پانچواں اشاعت ۱۹۷۳ء

اسٹوڈنٹ اسٹینڈرڈ انگریزی۔اردو ڈکشنری دسویں اشاعت ۱۹۷۴ء

طنزیات و مقالات: سید محفوظ علی بدایونی موئف محمد محی الدین بدایونی بی۔اے محی الدین صاحب عالی صاحب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء ساتھ کام کیا تھا۔ مولوی محفوظ علی مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" میں مولوی صاحب کا کالم "تجاہل عامیانہ" ہوتا تھا۔

قاموس الکتب اردو (جلد دوم) تاریخیات مرتبہ انجمن ترقی اردو پاکستان پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

تختوں پر معلومات جمع کی جاتی تھیں وہ مصنف، کتاب کا نام موضوع تعداد صفحات سال اشاعت مطبع ناشر کتب خانے کا حوالہ جہاں وہ کتاب ہے۔

سلمان شاہجہاں پوری نے اس کا مسودہ تختوں پر سے لکھ کر دیا تھا۔ بعد میں محمد ایوب قادری صاحب نے قاموس الکتب کے مسودے پر نظر ثانی کی اور کتابت کی تصحیح ابو سلمان شاہجہاں پوری نے کی۔

بیاض مراثی:

یہ بیاض انجمن کی ملکیت ہے۔ سن تحریر مستند نہیں بس ایک صفحے پر ۱۱۱۱ ہجری درج ہے قدامت کے لحاظ سے یہ ساتویں نمبر پر ہے۔

اس کتاب میں دسویں گیارھویں صدی ہجری کے مرثیہ نگاروں کے مرثیے بھی شامل ہیں۔

چینی لوک کہانیاں تہذیب و ترجمہ شفیع عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء انجمن دوسری زبانوں کے ادب پاروں کو ترجمہ کرا کر اردو

ادب میں اضافہ کر رہی ہے۔ یہ بھی اس ہی سلسلے کی کڑی ہے۔

تذکرہ عروس الاذکار ۱۲۸۹ھ ۱۹۷۵ء مصنف نصیر الدین نقش حیدر آبادی مرتب افسر صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن

یہ کتاب حیدر آباد دکن کے ان شعراء کے حالات مشتمل ہے جو مصنف کے زمانے میں موجود تھے۔ اس میں زیادہ تر حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی کے سلسلے کے شاعروں کا ذکر ہے لیکن ایسے شعراء کا بھی ذکر ہے۔ جو دکن کے مستقل باشندے نہ تھے۔ کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی تصنیف میر انشا اللہ خان انشا دہلوی مرتبین ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا امتیاز علی خان عرشی سید قدرت نقوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

کہانی رانی کیتکی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ خالص اردو زبان میں ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں چھپا تھا۔ پھر مولانا امتیاز علی خان عرشی رام پوری نے لائبریری رام پور کے دو مخطوطوں سے مقابلہ کر کے درست کیا۔ وہ تصحیح شدہ نسخہ ۱۹۵۵ء میں چھپا۔

اردو تھیٹر (جلد چہارم) ڈاکٹر عبدالعلیم نامی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء پہلی تین جلدیں بھی انجمن نے چھاپی ہیں اب چوتھی جلد میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۵ء تک اردو میں اسٹیج کرنے والی تھیٹریکل کمپنیوں کا تفصیلی تذکرہ بھی آ گیا ہے۔

فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں جلد اوّل

تالیف مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

پاک و ہند کے مختلف فنون اور صنعتوں کے اصطلاحی الفاظ و محاورات کا جامع مجموعہ۔

انجمن ترقی اردو نے آٹھ جلدیں ۱۹۳۹ء میں شائع کی تھیں جن میں مختلف پیشہ وروں اور پشتوں میں مستعمل اصطلاحات جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب اس ہی کی ایک جلد ہے

مرزا اسداللہ خان غالب گلِ رعنا معہ آتش نامہ غالب مرتبہ سید قدرت نقوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انجمن نے پانچ کتابیں، سہ ماہی اور قومی زبان کے خاص نمبر شائع کئے تھے۔ ان پانچ کتابوں میں ایک ہنگامہ دل آشوب جسے سید قدرت نقوی نے مرتب کیا تھا۔

سر سید احمد خان حالات و افکار از ڈاکٹر مولوی عبدالحق دوسری اشاعت

مولوی عبدالحق سر سید کے مشن (اردو زبان کی ترویج و ترقی) کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ کتاب سولہ سال بعد دوبارہ چھپی ہے۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد سوم مرتبہ افسر صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی کے کتب خانہ خاص میں عربی، فارسی اردو مخطوطات کا مفید ذخیرہ موجود ہے جو حفاظت کے مدِ نظر پاکستان نیشنل میوزیم کو دے دیا گیا ہے۔

مقالات گارساں دتاسی جلد دوم

پروفیسر موصوف کے "ہندوستانی زبان" پر سالانہ لیکچر ۱۸۷۴ء سے ۱۸۷۷ء تک، بنظر ثانی

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس) پہلا ایڈیشن ۱۹۷۵ء گارساں دتاسی کے خطبات رسالہ "اردو" میں ۱۹۲۳ء سے چھپ رہے ہیں۔ پہلی بار کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ مقالات کی اشاعت دو جلدوں میں ۱۹۴۳ء میں عمل میں آئی۔ نظر ثانی شدہ جلد اوّل ۱۹۶۴ء میں دوبارہ چھپی اب یہ دوسری جلد ۱۹۷۵ء میں چھپی ہے۔

اشاریہ اردو سہ ماہی رسالہ اردو کا مصنف وار اشاریہ مرتبہ سید سرفراز علی رضوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء

سہ ماہی جریدہ "اردو" کا پہلا شمارہ ۱۹۲۱ء میں اورنگ آباد دکن سے چھپا تھا۔ اردو ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۶ء تک اورنگ آباد دکن ہی میں رہا ۱۹۳۶ء میں دلّی آ گیا اور ۱۹۸۷ء تک نکلتا رہا۔ افراتفری میں مولوی صاحب کراچی آ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں اردو جاری ہوا۔ ۱۹۶۱ء تک جاری رہا۔ ۱۹۶۲ء سے اردو پھر جاری ہوا۔

افکارِ حالی مصنف بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء مولوی عبدالحق نے افکارِ حالی پر کئی مضامین تحریر کئے ان کو جمع کیا گیا ہے۔ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب ڈاکٹر یونس حسنی (ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی) پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء

اس کتاب میں سات باب ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں اختر مرحوم کا وہ کلام جوان کے دیوان میں شامل نہیں ہے۔ عام قاری انہیں رومانی شاعری کا شاعر ہی مانتے ہیں کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے سلمٰی تخلیق کی تھی اور محبوب کے فرضی نام سے شاعری کی تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ ڈاکٹر معین الدین عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء

یہ ایک مثبت اور سائنٹفک کوشش ہے جس کا مقام ہمارے تحقیقی اور قومی ادب میں نہایت بلند قرار دیا جائے گا۔

مخطوطاتِ انجمن (جلد چہارم) مرتبہ افسر صدیقی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء یہ تقریباً ساڑھے سات سو مخطوطات ہیں۔

(دانائے راز) اقبال

علامہ سر محمد اقبال کی زندگی، ان کی شاعری اور فلسفے پر سیر حاصل محققانہ مضامین کا مجموعہ مع ضمیمہ۔

(طبع جدید "اقبال نمبر" رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء مرتبہ بابائے اردو مولوی صاحب پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء زیر نظر اشاعت انجمن کے سہ ماہی جریدے "اردو" کا اقبال نمبر ہے جو ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

لغت کبیر اردو جلد دوم (حصہ اول الف مقصودہ) اشاعت ۱۹۷۷ء

موئف بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء پہلی جلد ۱۹۷۳ء میں چھپی تھی۔

اس کی علمی اہمیت پر ڈاکٹر سبزواری کا ایک مختصر سا تبصرہ اس اشاعت میں شامل کر دیا گیا ہے۔

شامِ غریباں تذکرۂ شعرائے فارسی کہ از ایران بہ ہند آمدہ بودند ۱۹۷۷ء مصنفہ لچھمی نرائن شفیق مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی استاد شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن پہلا ایڈیشن (انجمن) شعراء کی ترتیب اعداد جمل پر رکھی مثلاً امیر۔ اسیر۔ بسمل۔ بیدل کے لحاظ سے یہ کتاب دس سال کی عمر میں ۱۱۷۵ء میں ترتیب دی گئی تھی۔

افکارِ عالیہ چون عظیم مغربی مفکرین سے استفادہ ۱۹۷۷ء ترجمہ اور خلاصہ ڈاکٹر خان رشید مقدمہ جمیل الدین عالی پہلا ایڈیشن انجمن کے منصوبوں میں امہات الکتب کے ترجمے شامل ہیں آہستہ آہستہ اپنے وسائل کی محدودات میں کام کر رہے ہیں مگر کام بہت ہے

سب کو کرنا چاہیے۔

انجمن کی اردو انگریزی لغت مرتبہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء

انجمن کی اس اردو انگریزی ڈکشنری کی بنیاد وہ قلمی مسودہ ہے جو تقسیم ہند سے قبل دہلی میں بابائے اردو کی خاص نگرانی میں کارڈوں کی شکل میں تیار ہونا شروع ہوا تھا اور ایک آہنی بکس کے اندر انجمن کے پاس محفوظ ہے۔

مخطوطات انجمن ترقی اردو (جلد پنجم) مرتبہ افسر صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں اردو ادبی نظم ونثر کے مخطوطات ۸۰۰ ہیں۔

جلد پنجم میں ۲۴۲ مخطوطات ہیں

مصطلحات علوم وفنون عربیہ از محی الدین غازی اجمیری پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء اردو زبان میں ان الفاظ اور مصطلحات کی ایک ایسی خاص شرح آ گئی جو پہلے صرف چند فارسی اور عربی داں طبقوں تک محدود تھی۔

جلد اوّل موئف سرفراز علی رضوی پہلا ایڈیشن ماخرات کی یہ فہرست مکمل نہیں۔ اردو کا سرمایہ قدیم بہت بڑا بھی ہے۔ اسلئے ایک جلد میں آنا مشکل ہے۔

بمقد ثریا (تذکرہ فارسی گویاں) تالیف غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء مصحفی کا تذکرہ شعرائے فارسی موسومہ "عقد ثریا" ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے شائع ہوا تھا۔ اس میں شعراء کے کلام کا نمونہ نہیں ہے۔

نسل دمن مصنفہ احمد سرادی مرتبہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء

یہ مثنوی اس سے پہلے اورنٹیل کالج لاہور کے میگزین میں ہو چکی ہے۔

اقبال علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر اردو میں شائع ہونے والی پہلی کتاب از مولوی احمد دین مرتبہ مشفق خواجہ پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ کچھ تبدیلی کے بعد ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی ممتاز حسن اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان شائع کر رہی ہے۔

قاموس الکتب (جلد سوم) عمرانیات مرتبہ انجمن ترقی اردو پاکستان پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء

اس سلسلے کی پہلی کتاب "مذہبیات" پر مولوی عبدالحق کا مقدمہ ۲۲، جون ۱۹۶۱ء کو بستر مرگ سے بھیجا گیا تھا۔ یہ ان کی آخری تحریر تھی۔ اگست ۱۹۶۱ء میں انتقال ہو گیا۔

مولانا ظفر علی خان (بحیثیت شاعر)

از ظہیر حسنین زیدی ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء ان کی شاعری تخیلی نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس کے ذریعہ زندگی کے حقائق پیش کرتے تھے۔

جاپانی لوک کہانیاں تہذیب وترجمہ شفیع عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء انجمن ترقی اردو کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عالمی ادب کو

اردو زبان میں منتقل کیا جائے۔

نساخ حیات وتصانیف ڈاکٹر محمد صدر الحق پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء مولوی عبد الغفور نساخ بنگالی تھے۔ مگر اردو کے اہم ستون تھے۔

اردو تنقید کا ارتقاء ڈاکٹر عبادت بریلوی

تیسری اشاعت ۱۹۸۰ء

جب کسی زبان کا ادب منزل ارتقاء کی جانب گامزن ہوتا ہے تب ہی سے اس پر تنقیدی نظریں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔

انتخاب جدید حصہ دوم مرتبین وزیر آغا۔ انور سدید، سجاد نقوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء اس میں ابن انشاء کا منتخب کلام شامل تھا۔ جو ان کی مرضی سے دیا گیا اور عالی صاحب نے بھی اپنا منتخب کلام حذف کر دیا۔

مضامین پریم چند، مرتبہ عتیق احمد پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء

پریم چند کو بدید افسانہ نویس اور ناول نگار کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن یہ خوبی بھی تھی کہ وہ بہترین مضمون نگار تھے۔

سلہٹ میں اردو مصنفہ محمد عبد الجلیل بسمل پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء جنوبی ایشیا میں اردو وہ واحد زبان ہے۔ جو برصغیر کے گوشے گوشے میں موجود ہے۔

مکاتب عبد الحق بنام محوی۔ عبد القوی دسنوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء سورج کی روشنی پر گفتگو کے لئے کوئی دوسرا سورج ہی درکار ہے۔

مثنوی عاقبت بخیر مصنفہ سید ماجد علی فنائی مرتبہ افسر صدیقی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء برطانوی حکومت کے آغاز نے اردو کو عوام کی زبان بنا دیا۔

تہافت الفلاسفہ مصنفہ امام ابو محمد غزالی مترجمہ پروفیسر ابو القاسم محمد انصاری مقدمہ ڈاکٹر منظور احمد پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء حضرت امام غزالی کی تصنیف تہافت الفلاسفہ امہات الکتب میں شامل ہے تجربی علوم کے سبب ایک لحاظ سے غیر ضروری لگتے ہیں۔ لیکن ان کی تاریخی اہمیت اب بھی مسلّم ہے۔ بلکہ یہ مسلمہ اور بھی اجاگر ہوتا ہے کہ اگر اپنے زمانے میں وہ اجزا نہ لکھے جاتے، وہ مباحث سامنے نہ آتے تو رفتارِ فکر اس تیزی سے اپنے ارتقائی منازل طے نہ کرتی۔

The Standard English - Urdu Dictionary Edited by the Late Baba-e-Urdu Dr. Abdul Haq Third Edition 1981 A.D 1401 Hijri

تیسری اشاعت:

A.D ۱۹۸۲ء گیارھویں اشاعت

مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد ششم مرتبہ افسر صدیقی امروہوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء

مختلف اداروں کے مخطوطات قومی ملکیت ہوتے ہیں اگر ادارہ چاہے تو بہتر قیمت دے کر خرید سکتا ہے اور اگر حکومت وہ خطوط

خریدنا چاہے اور مالک نہ بیچے تو حکومت قانوناً بھی لے

مشاہیر یونان اور روما

(حکیم پلوتارک یونانی کی کتاب السیر کا اردو ترجمہ) مترجم مولوی سید ہاشمی، فرید آبادی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء

بارھویں صدی ہجری کے نامور صوفی شاعر شاہ تراب علی تراب بیجاپوری کے واحد و نادر مخطوط کی پہلی اشاعت۔

دیوان تراب

مرتبہ مقدمہ وفرہنگ۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی پہلا ایڈیشن

مثنوی نوسرہار مصنفہ شاہ اشرف الدین اشرف بیابانی ۹۰۹ء مرتب افسر صدیقی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء

گزشتہ زمانے میں اردو کی تصانیف کو محفوظ کرنا انجمن کا مقصد ہے حدیقتہ المرام (علمائے مدارس) مصنفہ محمد مہدی واصف

مدراسی سن تصنیف ۱۲۷۰ھ مترجم سخاوت مرزا (بی۔اے ایل۔ایل۔بی عثمانیہ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء)

حدیقتہ المرام ان اہل علم وفضل وکرم کا تذکرہ ہے جو مدارس اور اس کے قرب و جوار میں گزرے ہیں

اردو فکشن بنیادی و تشکیلی عناصر (ایک تاریخی جائزہ) مصنفہ اختر انصاری پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء

دراصل یہ ایک مقالہ ہے جو کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔

تیسرا بابائے اردو یادگار کلچر ۲ فروری ۱۹۸۳ء

جمالیات اردو ادب از ڈاکٹر ریاض الحسن پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء یہ مقالہ بابائے اردو توسیعی خطبات کے سلسلہ کی تیسری کڑی ہے۔

رسالہ شگن موسوم بہ لولوئے از غیب ۱۱۰۲ھ مصنفہ شیر لال مرتبہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء

یہ مخطوطہ ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم نے انجمن کو دیا تھا۔ مفکرین اسلام مصنفہ مولانا عبداللہ قدسی پیش لفظ جمیلہ خاتون

سنگھاسن بتی مصنفہ فقیر دکنی مرتبہ افسر صدیقی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء اب کتاب کی صورت میں رسالے مسائے اردو میں قسط وار

چھپی تھی۔

English - Urdu Pocket Dictionary Redeed from the revised and enlarged edition of the Popular English Urdu Dictionary by Late Baba-e-Urdu Dr. Moulvi Abdul Haq The Standard English - Urdu Dictionary The Late Baba-e-Urdu Dr. Abdul Haq Fourth Edition 1985 A.D 1406 Hijri

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

بارھویں اشاعت

بابائے اردو مولوی عبدالحق یادگاری خطبہ ۱۹۸۴ء اسلوبیات میر ۱۹۸۵ء پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی پہلا ایڈیشن

اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک ڈاکٹر انور سدید پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء اسیر پنجاب یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی۔غزل نمبر دار جعفری پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء بزرگوں کے کلام کا انتخاب اور حالات درج ہیں

پاکستان میں اردو تحقیق موضوعات اور معیار ڈاکٹر معین الدین عقیل پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء اردو تحقیق سے متعلق پہلا جائزہ ہے

قواعد صرف ونحو زبان اردو ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ء مصنفہ سرسید احمد خان مرتبہ عبدالغفار شکیل (علیگ) پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء پہلے سہ ماہی جریدے "اردو" جلد ۵۹ شمارہ ۲-۳ ۱۹۸۳ء) میں شائع ہوا تھا۔

پاکستان کی کہانی (بچوں کے لئے) مصنفہ بیگم سلمٰی زمن پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء انجمن کے بچوں کے لئے بہت کم کتابیں چھاپی ہیں۔

چراغ شناسائی

ترجمہ رباعیات فواد حنیف فوق پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء ترکی شاعر فواد کی رعبایات کا اردو ترجمہ ہے جو قابل قدر ہے اس لحاظ سے کہ ترکی کے ایک شاعر کی ادبی تخلیقات کا اردو میں ترجمہ ہو گیا۔

ماخذات

احوال شعراء ومشاہیر جلد سوم موئفہ سرفراز علی رضوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء سرفراز علی عربی اور فارسی کے ماہر تھے۔کتاب نما میں کتابوں کی فہرست شائع کرتے تھے۔(۲۶۰۰۰) کتابوں کو موضوع کے لحاظ سے ترتیب دیا۔جو بڑا کارنامہ ہے اب محقق کو اس سے بڑی مدد ملی ہے۔

پاکستانی معاشرہ

جنوبی ایشیا میں اسلام نسل پرستی اور قیادت اکبر ایس احمد پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء

ابن انشاء احوال وآثار ڈاکٹر ریاض احمد ریاض پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء ڈاکٹر ریاض احمد ریاضی اس کارنامہ سے تاریخ ادب کا حصہ بن گئے ہیں۔

پنجابی زبان وادب

عبداللہ شاہ ہاشمی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء پنجابی ادب پر اردو میں کافی عرصہ بعد پہلی کتاب شائع ہوئی ہے۔مقالات گارسان دتاسی (جلد اوّل) ۱۹۶۴ء نمبر ۱۶ اسٹوڈنٹ اسٹینڈرڈ۔انگریزی۔اردو ڈکشنری آٹھویں اشاعت ۱۹۶۵ء

کتابیات

عالی کی تصانیف

۱۔ اے مرے دشتِ سخن۔ پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور، ۱۹۹۵ء

۲۔ غزلیں، دوہے، گیت۔ مکتبہ اسلوب، کراچی۔ طبع اول ۱۹۵۸ء

۳۔ لاحاصل۔ پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور طبع سوم ۱۹۹۵ء

۴۔ آئس لینڈ (سفرنامہ اور صریرِ خامہ) پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور طبع اول ۲۰۰۱ء

۵۔ تماشا مرے آگے۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۹۱ء

۶۔ دنیا مرے آگے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۴ء

۷۔ صدا کر چلے۔ مکتبہ شاہکار کراچی ۱۹۸۵ء

۸۔ دعا کر چلے۔ مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۷ء

۹۔ وفا کر چلے۔ جنگ پبلشرز لاہور ۲۰۰۰ء

۱۰۔ حرفے چند (جلد اوّل) انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۸۸ء

۱۱۔ حرفے چند (جلد دوم) انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۹۳ء

۱۲۔ حرفے چند (جلد سوم) انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۹۷ء

۱۳۔ اصطلاحات بینکاری (باشتراک محمد احمد سبزواری) انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۹۱ء

۱۴۔ عالی کلام (انتخاب) مرتبہ: جمال پانی پتی۔ اکادمی بازیافت، کراچی ۲۰۰۳ء

۱۵۔ Calm Under the Whirlpool (منتخب دوہوں کا انگریزی میں ترجمہ) مترجم: بیدار بخت وڈاکٹر میرے اینے ارکی رائل بک کمپنی، کراچی طبع اول ۲۰۰۳ء

۱۶۔ Destination beyond Destination (منتخب غزلوں اور دوہوں کا ترجمہ) مترجمین: بیدار بخت و میری اینے ارکی۔ پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی۔ کراچی ۱۹۹۷ء

کتابیات

۱۔ مسلم لیگ کا دورِ حکومت ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء — ڈاکٹر صفدر محمود

۲۔ پاکستان ناگزیر تھا — سید حسن ریاض کراچی یونیورسٹی

۳۔ مسلم لیگ کا دورِ حکومت ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء — ڈاکٹر صفدر محمود

۴۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ — محمد احمد خان کاروانِ ادب کراچی ۱۹۵۲ء

۵۔ پاکستان ناگزیر تھا — سید حسن ریاض کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۰ء

۶۔ اختر شیرانی اور جدید اردو ادب — ڈاکٹر یونس حسنی انجمن ترقی اردو پاکستان

۷۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ — محمد احمد خان کاروانِ ادب، کراچی ۱۹۵۲ء

۸۔ تاریخ مسلم لیگ — از مظہر انصاری

۹۔ اپنی کہانی — از راجندر پرشاد

۱۰۔ ایضاً — ایضا — ص ۱۰۸

۱۱۔ یادگارِ غالب — صالحہ عابد حسن انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ — ص ۱۰۲

۱۲۔ جدید شعراء اردو — از ڈاکٹر وحید قریشی — ص ۲

۱۳۔ اردو ادب کی تحریکیں — ڈاکٹر انور سدید انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۸ء — ص ۳۸۳

۱۴۔ تاریخ انجمن پنجاب — عفیہ بانو تمنائی

۱۵۔ دورانِ روس دید و شنید — حکیم محمد سعید — ص ۳۳

۱۶۔ خاندان لوہارو — طاہرہ بانو حجاب — فیروز سنز اسلام آباد ۲۰۰۳ء

۱۷۔ جمیل الدین عالیؔ ایک شاعر۔ رب نواز مونس (مقالہ) ذکریا یونیورسٹی ملتان

۱۸۔ جمیل الدین عالیؔ فن و شخصیت۔ (مرتبہ) ایم حبیب خان، علمی مجلس دہلی ۱۹۸۸ء

۱۹۔ جمیل الدین عالیؔ کی نثر نگاری — عبدالعزیز ساحر ۱۹۹۳ء

۲۰۔ جمیل الدین عالیؔ کی تحریروں میں پاکستانیت — مہر النساء عزیز پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی ۲۰۰۰ء

۲۱۔ ارمغان عالیؔ — مرتبہ افتخار احمد مدنی و فرمان فتح پوری — کراچی ۲۰۰۱ء

۲۲۔ جمیل الدین عالیؔ نمبر (دنیائے ادب) مرتبہ اوج کمال۔ کراچی ۲۰۰۲ء

۱۔	آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	پرنٹنگ ورکس لاہور	۱۹۰۷ء
۲۔	ادب کا مقصد	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	ادارہ فروغ اردو لکھنو	۱۹۶۵ء
۳۔	ادب کیا ہے؟			۱۹۶۶ء
۴۔	ادب اور تعصب	اکبر امامی	میری لائبریری لاہور	۱۹۶۳ء
۵۔	ادب اور روایت	جمال پانی پتی	المدثر اکیڈمی سی ۱۲ بلاک ۷ ایف بی ایریا کراچی	۱۹۹۴ء
۶۔	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو لکھنو	۱۹۶۳ء
۷۔	ادبی تاثرات	ڈاکٹر شجاعت علی بریلوی	= = =	۱۹۶۲ء
۸۔	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	= = =	۱۹۶۵ء
۹۔	ادبی جائزے	سعادت علی صدیقی	= = =	۱۹۶۰ء
۱۰۔	ادبیات و شخصیات	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	یونیورسل بک ڈپو لاہور	۱۹۹۳ء
۱۱۔	ارباب نثر اردو	مولوی سید محمد صاحب	مکتبہ معین الادب اردو بازار لاہور	۱۹۵۰ء
۱۲۔	اردو ادب آزادی کے بعد	پروفیسر اعجاز حسین	کاروان پبلیشرز الہ آباد	۱۹۶۸ء
۱۳۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	پروفیسر احتشام حسین	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۱۹۸۳ء
۱۴۔	اردو ادب کی مختصر تاریخ	پروفیسر اعجاز حسین	جاوید پبلیشرس نشیمن ۱۱ منٹو روڈ الہ آباد	۱۹۳۵ء
۱۵۔	اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	یونیورسل بک ڈپو لاہور	۱۹۹۰ء
۱۶۔	اردو شاعری پر ایک نظر	پروفیسر کلیم الدین احمد	ادارہ تصنیف و تحقیق لاہور	۱۹۶۶ء
۱۷۔	اردو شاعری کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	کاروان پبلیشرز الہ آباد	۱۹۶۸ء
۱۸۔	اردو شاعری کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی (دہلی ۱۹۹۰ء)	۱۹۹۳ء
۱۹۔	اردو کا ماضی، حال اور مستقبل	احمد ابراہیم علوی	ادارہ فروغ اردو لکھنو	۱۹۶۲ء
۲۰۔	اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۵۲ء
۲۱۔	اردو نثر کا فنی ارتقاء	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی (دہلی ۹۰)	۱۹۹۳ء
۲۲۔	اسلوبیات میر	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی	۱۹۸۶ء
۲۳۔	اعتبار نظر	سید احتشام حسین	کتاب پبلشرز چوک لکھنوء	۱۹۶۵ء
۲۴۔	بوطیقا۔ فن شاعری	عزیز احمد	انجمن ترقی اردو کراچی	۱۹۶۱ء
۲۵۔	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	مطبع نول کشور لکھنو	۱۹۲۸ء
۲۶۔	تاویل و تعبیر	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	نذر سنز اردو بازار لاہور	۱۹۸۴،۸۰ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۲۷۔	تحقیق وتنقید	= = = =	قمر کتاب گھر اردو بازار کراچی	۶۳، ۷۷، ۱۹۷۸ء
۲۸۔	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	انجمن ترقی اردو علی گڑھ	۱۹۵۱ء
۲۹۔	تنقیدی اشارے	پروفیسر آلِ احمد سرور	ادارہ فروغِ ادب لکھنو	۱۹۷۷ء
۳۰۔	تنقیدی تجزیے	کاظم علی خان	ادراہ فروغِ اردو لکھنو	۱۹۶۶ء
۳۱۔	تنقیدی مضامین	سید عابد علی عابد	میری لائبریری لاہور	۱۹۶۳ء
۳۲۔	تنقید وتحلیل	ڈاکٹر شبیہ الحسن دہلوی	ادارہ فروغ اردو لکھنو	۱۹۷۳ء
۳۳۔	جدید ادب	مخمور سعیدی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس نمبر ۹ دریا گنج نئی دہلی	۱۹۸۷ء
۳۴۔	جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری	آزاد بکڈپو امرتسر	۱۹۵۶ء
۳۵۔	جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ادارہ تصنیف وتحقیق لاہور	۱۹۶۴ء
۳۶۔	داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۶۶ء
۳۷۔	دلّی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	ادارہ فروغ اردو لکھنو	۱۹۷۳ء
۳۸۔	ذوق ادب وشعور	سید احتشام حسین	= = = = = =	۱۹۵۵ء
۳۹۔	سخن ہائے گفتنی	کلیم الدین احمد	= = = = = =	۱۹۵۵ء
۴۰۔	شعرِ نو (تنقیدی مجموعہ)	ڈاکٹر محمد حسن	= = = = = =	۱۹۷۹ء
۴۱۔	شعروزبان	ڈاکٹر مسعود حسین خان	علی گڑھ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	۱۹۶۳ء
۴۲۔	عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین)	سید احتشام حسین	ادارہ فروغ اردو لکھنو	۱۹۷۸ء
۴۳۔	غزل اردو کی شعری روایت	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اختر کتاب گھر اردو بازار کراچی	۱۹۹۵ء
۴۴۔	غزل اور درس غزل	ڈاکٹر اختر انصاری دہلوی	علی گڑھ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	۱۹۶۸ء
۴۵۔	غزل اور مطالعہ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ادارہ تصنیف وتحقیق لاہور	۱۹۶۴ء
۴۶۔	مغربی بنگال میں اردو زبان اور اس کے مسائل	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۴۷۔	نیا اور پرانا ادب	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	قمر کتاب گھر اردو بازار کراچی	۱۹۷۳ء
۴۸۔	نئے اور پرانے چراغ	پروفیسر آل احمد سرور	ادارہ فروغ ادب لکھنو	۱۹۷۷ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۴۹۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لکھنو	۱۹۰۷ء
۵۰۔	اردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۸۶ء
۵۱۔	ابنِ انشاء احوال و آثار	ڈاکٹر ریاض احمد ریاض	انجمن ترقی اردو پاکستان انجمن پریس کراچی	۱۹۸۸ء
۵۲۔	اردو ادب آزادی کے بعد	اعجاز حسین		
۵۳۔	اردو ادب میں رومانوی تحریک	محمد حسین		
۵۴۔	آج کا اردو ادب	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	رہبر پبلشر کراچی	۱۹۹۰ء
۵۵۔	پاکستان کی سیاست ماضی۔حال۔مستقبل	انجم کھوکھر	ایس۔ٹی۔پرنٹر گوالمنڈی پنڈی پاکستان	مارچ ۱۹۹۰ء
۵۶۔	پاکستان ناگزیر تھا	سید حسن ریاض	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی	۱۹۸۷ء
۵۷۔	ترقی پسند ادب	عزیز احمد	عصری مطبوعات کراچی	جولائی ۱۹۸۶ء
۵۸۔	تاریخ انجمن ترقی اردو	سید ہاشمی فرید آبادی	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	۱۹۹۷ء
۵۹۔	تخلیقی ادب (۱)	مشفق خواجہ	عصری مطبوعات نارتھ ناظم آباد کراچی	۱۹۸۰ء
۶۰۔	تلخا شیریں	حفیظ جالندھری		
۶۱۔	ترقی پسند ادب (جلد اوّل)	سردار جعفری	انجمن ترقی اردو	۱۹۵۱ء
۶۲۔	تاریخ پاک و ہند	انوار ہاشمی	کراچی بک سینٹر	جون ۱۹۸۱ء
۶۳۔	ترقی پسند تحریک کی نصف صدی	علی سردار جعفری	دہلی	۲۰۰۰ء
۶۴۔	تاریخ مسلمانان پاک و بھارت	سید فرید ہاشمی	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	۱۹۸۸ء
۶۵۔	جدید اردو شاعری بابائے اردو یادگاری لکچر مارچ ۱۹۸۸ء	عزیز حامد مدنی	انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی	۱۹۹۰ء
۶۶۔	جمیل الدین عالی کی نثر نگاری	عبدالعزیز ساحر	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی ۷۰ شاہراہِ قائداعظم لاہور	۱۹۹۳ء
۶۷۔	جیوے جیوے پاکستان	جمیل الدین عالی	پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی کراچی	۱۹۷۴ء

۶۸۔	حیات غالب کا ایک تحقیق کی روشنی میں	ڈاکٹر ملک حسن اختر	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۸۷ء
۶۹۔	داستان خانوادہ میاں محمود علی قصوری برصغیر کی ڈیڑھ سوسالہ تاریخ	از عبداللہ ملک	جنگ لاہور	مئی ۱۹۹۵ء
۷۰۔	درون روس دید وشنید	از حکیم محمد سعید	ہمدرد فاؤنڈیشن	۱۹۹۱ء
۷۱۔	شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	۱۹۹۸ء
۷۲۔	غالب اور شاہان تیموریہ	خلیق انجم	مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی	دسمبر ۱۹۷۸ء
۷۳۔	غالب نام آور (سہ ماہی اردو کے مضامین کا انتخاب)		انجمن ترقی اردو پاکستان انجمن پریس	۱۹۶۹ء
۷۴۔	قوم کی آواز	مہاتما گاندھی	میسرز راجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور	
۷۵۔	مرحوم دہلی کالج	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو۔ اردو روڈ کراچی	۹ جولائی ۱۹۵۸ء
۷۶۔	مسلم لیگ کا دورِ حکومت	ڈاکٹر صفدر محمود	سنگِ میل پبلشرز لاہور	۱۹۸۶ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۵۴ء

رسائل

"جمیل الدین عالؔی ایک مطالعہ"

ماہنامہ "اسلوب" کراچی ایڈیٹر مشفق خواجہ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ء

= "چہارسو" = سید ضمیر جعفری ۶۹ گوالمنڈی راولپنڈی ۱۹۹۵ء

= "دنیائے ادب" = اوج کمال ۵۵۵ سنی پلازہ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی جون ۱۹۹۵ء

= "شعور" دوسرا شمارہ = حمایت علی شاعؔر اسٹیشن روڈ حیدر آباد سندھ ۱۹۵۷ء

= "فلمی ستارے" = انیس دہلوی فلمی ستارے دہلی مئی ۱۹۸۵ء